# ترغیبات جنسی

جس میں تاریخی، علمی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کے میلانِ جنسی پر
ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے

نیاز فتحپوری

قیمت علاوہ محصول  مجلد ۳؎  غیر مجلد ۲؎

Digitized by commisionedwriting.com for the IdeaMines collective.

# فہرست


پیدائش ۳

فحاشی کی تعریف ۶

فحاشی کی ابتدا اور اسکے اسباب ۷

مادی ۹

نظام دیہاتی ۹

نظام بطریقی ۱۰

گرفتاری عروس ۱۱

خریداری عروس ۱۴

اقسام ازدواج از رفے دھرم شاستر ۱۶

شادی کی اور صورتیں ۱۸

داشتہ عورتیں ۲۰

شادی کی انگوٹھی ۲۱

آزمائشی شادیاں ۲۲

وحشی اقوام میں نکاح کی صورتیں ۲۷

طلاق و خلع ۲۸

طلاق قدیم روم میں ۲۸

قدیم ویلز میں ۲۹

قدیم چین میں ۲۹

قدیم جاپان میں ۲۹

اسکیمو قوم میں ۳۰

فرانس میں ۳۰

جرمنی میں ۳۱

روس میں ۳۱

انگلستان میں ۳۱

امریکہ میں ۳۲

دیگر ممالک میں ۳۲

مذہبی فحاشیاں ۳۳

ہیروڈوٹس کے چند بیانات ۳۴

مذہب میں رواج فحاشی کے اسباب ۳۶

ب

افریقہ میں مذہبی فحاشی کے آثار ۳۸
یورپ میں مذہبی فحاشی کے آثار ۴۰
مذہبی فحاشیوں کی عجیب و غریب توجیہیں ۴۷
مذہبی فحاشیوں کی مرموز علامتیں ۵۹
صلیب ۶۲
مثلث ۶۴
مچھلی ۶۶
بیضاوی شکل ۶۷
سانپ ۶۸
بعض پھل اور پودے ۷۰
بیل ۷۳
بکرا ۷۵
گائے ۷۵
کچھوا ۷۵
بلی ۷۶
شیر ۷۷
ابوالہول ۷۷
فحاشی پر عمومی تبصرہ ۷۸
کامل نشاط ۸۰
عید الحقار ۷۹
قدیم یونانیوں اور رومیوں کا خیال ۸۰
وحشی اقوام کی رنگ رلیاں ۸۱
عصمت فروشی وحشی اقوام میں ۸۳
مقدس مباشرت ۸۶
شادی کا خرچ اور جہیز ۹۲
فحش کی ابتدا ۹۴
فحاشی ممالک مشرق میں ۹۵
برھما ۹۶
ہندوستان ۹۶
فلسطین ۹۹
قدیم ایران ۱۰۰
تاتار و ترکستان ۱۰۱
چین ۱۰۲
کوریا ۱۰۵
تجگی قدیم روم میں ۱۰۶
مسیحیت کا اثر فحاشی پر ۱۰۶
تجگی کے خلاف جہاد ۱۰۹
قرون وسطیٰ کے ادارات فحاشی ۱۱۱

ج


اعلیٰ معیار کی پیشہ ور عورتیں ۱۱۴

یوروپ کی بعض تاریخی پیشہ ور عورتیں ۱۱۵

انسدادِ فحبگی کیلئے کوشش ۱۱۸

انسدادِ فحبگی کے قواعد ۱۱۹

ناکامی ۱۲۴

فحبگی کے اسباب علل ۱۲۵

فحبگی کے اقتصادی اسباب ۱۲۳

افلاس اور فحبگی ۱۳۴

یورپین کسبیوں کی کثرت ۱۳۶

فحبگی علم الحیوٰۃ کے نقطۂ نظر سے ۱۴۱

فحبگی اور عنصر حیاتی ۱۴۱

کسبیوں کی خواہش نفسانی ۱۴۳

نفسیاتی خصوصیات ۱۴۶

جسمانی خصوصیات ۱۴۹

فحبگی کا اخلاقی پہلو ۱۵۱

فحاشی کا اثر تمدن پر ۱۵۴

تفریح کا شوق ۱۵۵

خادمائیں کیوں اکثر پیشہ ور بنجاتی ہیں ۱۵۶

عورت کی تخریب اور مرد ۱۵۸

تمدن عمرانی کی کشش ۱۵۹

مردوں کی عجیب سائکالوجی ۱۶۴

**استلذاذ بالمثل** ۱۶۶

استلذاذ کی مختلف صورتیں ۱۶۶

ضمنیات اور استلذاذ بالمثل ۱۶۷

استلذاذ بالمثل اقوام قدیمہ میں ۱۷۴

استلذاذ بالمثل کے مختلف نظریے ۱۹۲

استلذاذ بالمثل اور بعض مشہور افراد ۱۹۸

عورتیں اور استلذاذ بالمثل ۲۰۹

**استلذاذ بالوحوش** ۲۳۳

**استلذاذ بالنفس** ۲۳۷

استلذاذ بالنفس جانوروں میں ۲۴۲

استلذاذ بالنفس انسانوں میں ۲۴۳

استلذاذ بالنفس کی قدیم تاریخ ۲۴۵

استلذاذ بالا دویہ ۲۵۲

استلذاذ بالخیال ۲۵۴

استلذاذ بالنفس کے اسباب ۲۵۵

یہ مشغلہ عورتوں میں کیوں زائد ہے ۲۵۵

استلذاذ بالنفس کے نقصانات ۲۵۷

فحاشی عہد قدیم میں ۲۶۰
قدیم یونان ۲۶۰
قدیم روم میں ۲۷۶
قدیم ہندوستان میں ۲۸۶
فحاشی قرون وسطی میں ۲۸۷
مجلسی و معاشری حالات ۳۰۳
انگلستان ۳۱۳
جرمنی ۳۱۷
فرانس ۳۲۰
عہد جدید اور فحاشی ۳۲۷
آتشک ۳۲۸
اصلاحات فرقہ پروٹسٹنٹ ۳۳۲
دور احیاء علوم و فنون ۳۳۵
معاشری و صنعتی تغیرات ۳۳۸
فرانس ۱۵۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک ۳۴۵
انگلستان ۱۵۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک ۳۴۹
جرمنی ۱۵۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک ۳۵۰
اخلاق جنسی ۳۵۵
ماضی ۳۵۵
توریت اور اخلاق جنسی ۳۵۹
انجیل اور اخلاق جنسی ۳۶۰
موجودہ اخلاق جنسی ۳۶۲
مستقبل کا اخلاق جنسی ۳۶۴

# ترغیباتِ جنسی

جس میں تاریخی، علمی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کے میلان
شہوانی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے

نیاز فتحپوری

Digitized by commisionedwriting.com for the IdeaMines collective.

۳

# تمہید

اس امر میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ انسان کا مطالعہ خود اپنی ذات سے شروع ہو کر دوسری چیزوں پر ختم ہونا چاہیئے، یا دیگر اشیاء سے شروع کر اپنی ذات تک پہونچنا چاہیئے۔ لیکن اس پر یقیناً سب متفق ہوں گے کہ انسان کے فرائض علمی میں ایک بڑا اہم فرض "مطالعۂ ذات" بھی ہے۔ یہاں "ذات" سے فلسفۂ تصوف کی "ذات خداوندی" مراد نہیں، بلکہ "ذات انسانی" مقصود ہے جس میں اسکے صفات و خواہشات یا "وظائف و کوائف" سب شامل ہیں۔

جہانتک صرف زندگی یا سانس لینے کا تعلق ہے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں، لیکن جس وقت ہم انسان کے تمام کاروبار حیات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسکے اندر کوئی کیفیت اور بھی ایسی پائی جاتی ہے جو تمام حیوانات سے اسکو ممیز کرنے والی ہے اور یہی کیفیت وہ ہے جسکا نام اہل علم نے "تعقل" رکھا ہے اور جسکو دوسرے الفاظ میں "غور و فکر" بھی کہہ سکتے ہیں۔

## ۴

اگر کارگاہ حیاتِ انسانی پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عالم کی تمام رونق، دنیا کا سارا ہنگامہ منحصر ہے صرف انسانی خواہشات پر جن کی تکمیل کیلئے وہ اپنی تمام جسمانی و دماغی قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ وہ بھوکا ہوتا ہے تو حصولِ غذا کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتا، وہ سردی گرمی محسوس کرتا ہے تو اس کے دفع کے لئے شب و روز محنت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور جب اسے پیاس معلوم ہوتی ہے تو پانی کے لئے وہ دیوانہ وار دوڑتا پھرتا ہے۔ منجملہ انہیں فطری خواہشات کے ایک خواہش وہ بھی ہے جو تعلق جنسی یا جذبۂ شہوانی سے وابستہ ہے اور اسکے لئے بھی تگ و دو کرنا اس کی عادت ہے۔ لیکن جس طرح فراہمی غذا کے سلسلہ میں انسان سدِ رمق یا نانِ جویں سے بڑھکر مرغ و بریانی پر بھی بس نہیں کرتا، حفاظتِ جسم کیلئے کھدر سے گزر کر حریر و پرنیاں تک پہونچ جاتا ہے، تشنگی رفع کرنے کے سلسلہ میں سادہ پانی سے شراب انگور تک بڑھ جاتا ہے، اسی طرح وہ خواہش جنسی پورا کرنے میں ایک جائز حد سے گزر کر اُن بدعتوں تک پہونچ جاتا ہے جو بڑی حد تک غیر فطری، غیر انسانی اور اصولِ تمدن کے خلاف ہیں۔

انہیں بدعنوانیوں و بے اعتدالیوں کو روکنا "تعقل" کا کام ہے اور اسی کا استعمال انسان کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔

---

پھر جس طرح انسان نے اپنی اور تمام خواہشات میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے تعقل کے ذریعہ سے متعدد علوم و فنون کی بنیاد ڈالی، اسی طرح اس نے اپنی خواہش جنسی کو جائز حدود میں رکھنے کے لئے جنسیات (Sexology)

۵

کو پیدا کیا اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو ماننا پڑیگا کہ اس علم کی اہمیت اور تمام علوم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے کیونکہ سوسائٹی اور تمدن کا بڑا ہنگامہ ایک اسی خواہش پر منحصر ہے اور اس کا تعلق ایسی جنس سے ہے جو انسان کا بہترین نصف حصہ کہلاتی ہے اور دنیا کی تقریباً آدھی آبادی ہے۔

مغربی زبانوں میں اس فن پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، خصوصیت کے ساتھ گزشتہ ربع صدی کہ اس دور میں تو نہایت زیادہ انہماک کے ساتھ اس پر توجہ کی گئی اور غیر معمولی طور پر بہت زیادہ لٹریچر اس موضوع پر شائع ہوا۔ لیکن مشرقی زبانوں اور خاصکر اُردو میں کوئی ایک قابل ذکر کتاب اس مسئلہ پر نہیں لکھی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ بعض کتابیں کوک شاستر کے اصول پر تو ضرور مرتب کی گئیں لیکن ان کا مقصود بجائے اصلاح کے اور زیادہ ہیجان پیدا کرنا ہے اور ان سے صرف وہی ادنیٰ ذہنیت و معمولی فوق کے آدمی لطف اُٹھا سکتے ہیں جو اس فن کے علمی پہلو کے بجائے محض عملی پہلو کو دیکھنے والے ہیں۔ چنانچہ عرصہ سے میرا خیال تھا کہ اک بسیط تالیف ہے اس موضوع پر پیش کروں، اور لوگوں کو بتاؤں کہ اس مسئلہ کے کون کون سے پہلو غور کرنے کے قابل ہیں اور تاریخ و علم کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرنے سے کیا فوائد ہم کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

نیاز

**فحاشی کی تعریف** قبل اس کے کہ کوئی گفتگو اس موضوع پر شروع کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فحاشی کا وہ مفہوم متعین کر دیا جائے جس کو سامنے رکھکر آیندہ بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے موضوع کے لحاظ سے "فحاشی" نام ہے ہر اُس طریق عمل کا جو قانونِ قدرت یا سوسائٹی کے مقرر کردہ اصول کے خلاف خواہش نفسانی پورا کرنے کے لئے اختیار کیا جائے، اور اس میں وہ صورت بھی شامل ہے جس کا تعلق صرف کسب زر سے ہے اور جس کو عصمت فروشی کہہ سکتے ہیں۔

اہل مغرب نے فحاشی و عصمت فروشی کا مفہوم متعین کرنے میں بہت کاوش کی ہے اور مختلف لوگوں نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں۔

رومی ایڈیون (Roman Aedion) اس کو صرف اُس فرد نازک کے لئے مخصوص کرتا ہے، جس کا مدعا محض کسب زر ہو، گیوت (Guyot) اس میں دونوں جنسوں کو شامل کرتا ہے لیکن کسب زر کی خواہش کو ضروری شرط قرار دیتا ہے۔

بونگر (Bonger) کسب زر کی خواہش کو ضروری قرار نہیں دیتا بلکہ صرف اغراض نفسانی کو مقدم سمجھتا ہے

رچارڈ بھی وہی کہتا ہے جو گیوت کا نظریہ ہے اور لفظ عصمت فروش میں دونوں جنسوں کو شامل کرتا ہے۔

ڈاکٹر بلاخ (Bloch) کہتے ہیں کہ ہر وہ مرد یا عورت فحاشی کہلائیگی جو متعدد ہستیوں کو اپنے آپ سے لذت نفس حاصل کرنے کی اجازت دے، خواہ

باہمد گر دلبستگی پائی جائے یا نہ پائی جائے۔ اس تعریف میں وہ اُجرت لینے کی شرط کو بھی ضروری نہیں سمجھتا۔

الغرض اہل مغرب نے فحاشی وعصمت فروشی کے حدود متعین کرنے میں عجیب وغریب نظریوں سے کام لیا ہے اور اس وقت تک وہ کوئی جامع و مانع تعریف اس کی نہیں معلوم کر سکے۔ لیکن ہم نے ابتدائی سطور میں ان تمام نظریوں سے ہٹ کر ایک علیحدہ نظریہ قائم کیا ہے اور اس تعریف کی بنا پر ہر قسم کی فحاشی اس میں داخل ہو جاتی ہے۔

**فحاشی کی ابتدا اور اسکے اسباب** جن لوگوں نے مسایل جنسی کی علمی تحقیق کی ہے، ان میں اس مسئلہ پر اختلاف آرا پایا گیا ہے کہ آیا فحاشی یعنی بغیر نکاح کے خواہش جنسی کو پورا کرنا عہد وحشت کی یادگار ہے یا نہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ انسان قدیم میں فحاشی کوئی عیب نہ سمجھی جاتی تھی اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں عہد وحشت کا انسان فحاشی کی طرف مایل نہ تھا اور جنسی تعلقات صرف رشتۂ ازدواج کے ذریعہ سے پیدا کئے جاتے تھے۔

اس تحقیق کے سلسلہ میں جب دودھ پلانے والے جانوروں کی حالت پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر چند نر و مادہ ایک دوسرے کے پابند ہوتے ہیں لیکن یہ پابندی بہت تھوڑے زمانہ تک قایم رہتی ہے بعض جانور ایسے ہیں جن کے نروں کو اپنے بچوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر مادہ ان کو لڑ کر نہ نکال دے، تو وہ بچوں کو کھا جائیں۔ اس لئے اگر جانوروں کے حال پر قیاس کر کے عہد قدیم کے انسان پر حکم لگایا جائے تو ماننا پڑے گا کہ

ممکن ہے اُس وقت مرد عورت میں کوئی خاص صورت تعلق جنسی کی پیدا ہوتی ہو، لیکن اس کو استحکام تو کسی طرح نہ ہوتا ہوگا اور ایک ہی فرد پر قانع رہنا مرد کا شعار نہ رہا ہوگا۔

ویسٹر مارک کا خیال یہ ہے کہ قدیم انسان میں نکاح کا رواج عام طور پایا جاتا تھا، لیکن اس کی تین صورتیں ہوا کرتی تھیں ایک یہ کہ ایک مرد کئی کئی بیویاں رکھتا تھا دوسری یہ کہ ایک عورت کئی کئی شوہر رکھتی تھی اور تیسری یہ کہ ایک عورت ایک ہی مرد کے لئے مخصوص ہوتی تھی مگر محدود زمانہ کے لئے

بہرحال اگر مرد عورت کے تعلق جنسی میں کوئی شائبہ اہلی زندگی یا خواہش اولاد کا پایا جا سکتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ نکاح یا باہمد گر پابندی کا خیال بھی اسی وقت انسان میں پیدا ہوا ہوگا جب اسے اہلی زندگی کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ مگر اب اس کی تعیین دشوار ہے کہ یہ احساس انسان میں کب اور کن صورتوں میں پیدا ہوا۔ ہسٹروائری ( [illegible] ) کا خیال ہے کہ جب تک انسان کو حصول غذا میں دشواریوں کا سامنا رہا اس کی خواہشات جنسی بھی دبی رہیں، لیکن جب سامان خورد و نوش کافی فراہم ہونے لگا تو اس کی بدمستیاں بھی بڑھ گئیں چنانچہ آپ جنگلی جانوروں کو دیکھئے جب تک وہ جنگل میں رہتے ہیں اور غذا کی فکر سے آزاد نہیں ہوتے، صرف مخصوص زمانہ میں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں، لیکن جب انہیں پال لیا جاتا ہے اور وہ فکر غذا سے آزاد ہو جاتے ہیں تو وہ بے فصل بھی ایک دوسرے سے ملتفت ہوتے نظر آتے ہیں۔ بہرحال تعلق جنسی کی طرف شدت میلان خواہ قانون طبیعی کی وجہ سے ہوا ہو یا کسی اور سبب سے دیکھنا یہ ہے کہ

## ۹

عہد قدیم میں رشتۂ ازدواج کی بنیاد کیونکر قائم ہوئی اور مختلف اقوام میں اس نے کیا مختلف صورتیں اختیار کیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم کو شادی یا ازدواج کی تاریخ پر غور کرنا ہے۔

**شادی** | تمدن بشری کے ارتقار پر اگر غایر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد قدیم میں انسان بالکل جنگلی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اور غذا کی تلاش میں ہر وقت اسے سرگرداں رہنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ حلال و حرام کی کوئی تمیز قایم نہ ہوئی تھی سوسائٹی کا کوئی ایسا اصول مرتب نہیں ہو سکتا تھا جسے نکاح سے موسوم کیا جاسے اور یقیناً جانوروں ہی کی طرح وہ ہیجان نفس کو بھی پورا کرتا ہوگا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب اشتراک فی النسواں کی بنیاد دنیا میں قائم ہوئی اور عورت پر اُس مرد کی ملکیت قرار پائی جس کو اس پر دسترس حاصل ہو جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے انسان کو اُس وقت غور کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہوگی جب اس نے یہ دیکھا ہوگا کہ تعلق جنسی کا ایک نتیجہ اولاد کا پیدا ہونا بھی ہے ظاہر ہے کہ اول اول بچہ کی پرورش کا کام صرف عورت ہی کے سپرد ہوا ہوگا اور مرد کو مطلق اس طرف توجہ نہ ہوئی ہوگی، اور غالباً یہی وہ چیز تھی جس نے آگے چل کر نظام امہاتی کی بنیاد ڈالی۔

**نظام امہاتی** | نظام امہاتی سے مراد معاشرت کا وہ نظام ہے جس میں قوم کی ماؤں کو زیادہ اہمیت حاصل ہو اور بعض محققین کا خیال ہے کہ اول اول یہی نظام قائم تھا چنانچہ اس کے ثبوت میں ڈاکٹر باچوفن (Bachofen) ایشیا کو چک

۱۰

کی قوم لائسی (Lycians) کو پیش کرتے ہیں جس میں نظام امہاتی کا رواج پایا جاتا تھا اور اس کی تصدیق ہیروڈوٹس کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس نے لکھا ہے کہ اس قوم میں بچہ کا نام ماں کے نام پر رکھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں جو قدر و منزلت ماں کی ہوتی تھی وہی بچہ کی ہوا کرتی تھی۔

جزیرہ سماترا میں اب بھی یہی نظام رائج ہے، یعنی شادی کے بعد شوہر اپنی بیوی کے گھر جا کر رہنے لگتا ہے اور اس کے تمام مصارف لڑکی والے پورا کرتے ہیں۔ اس قسم کی شادی کو یہاں امبیل اناک (Ambil Anak) کہتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی گھر داماد کا رواج پایا جاتا ہے۔

مطالعۂ بائبل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یعقوبؑ نے اپنی بیویوں کے خاطر اپنے خسر لابن کے پاس رہ کر ۱۴ سال تک مویشی چرانے کی خدمت انجام دی اور اسی طرح موسیٰؑ اپنی بیوی صفورا کی وجہ سے اپنی سسرال میں رہے اگر یہ خدمت بجائے مہر کے عورت کی قیمت نہ تصور کی جائے تو اس کو بھی نظام امہاتی کی وجہ سے ماننا پڑے گا۔ لیکن اگر نظام امہاتی کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کا قیام بہت کم رہا اور سوائے چند مخصوص قوموں کے کہیں اور رائج نہ ہو سکا۔ البتہ نظام بطریقی (Patriarchate) نے بہت زیادہ وسعت حاصل کی اور آج تک اسی کے اثرات تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

**نظام بطریقی** | چونکہ انسان کا قدیم طرز معاشرت چوپانی تھا۔ اس لئے جس قدر [illegible] مویشیوں کی کثرت ہوتی تھی اسی قدر اس کو متمول خیال کیا جاتا تھا چونکہ

## ۱۱

کثیر التعداد مویشیوں کے لئے وسیع سبزہ زاروں اور چراگاہوں کی ضرورت ہوتی تھی، اس لئے رفتہ رفتہ قبائل میں باہمدگر اس پر جھگڑا ہوتا تھا اور یہ نزاع مستقل جنگ کی صورت اختیار کر لیا کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ فریق غالب مغلوب قبیلہ کی بستیوں پر تاخت کرتا، مال و مویشی اور عورتیں بچے سب پر قبضہ کر کے اپنے ساتھ لیجاتا یہی ابتدا نظام تطریقی کی تھی۔

جو عورتیں بحیثیت اسیران جنگ فاتحین کے حصہ میں آتی تھیں وہ مردوں کا "مال" متصور ہوتی تھیں اور ذلیل سمجھی جاتی تھیں۔ پھر اس کے بعد جوں جوں زمانہ گذرتا گیا گھر کی بیویاں اور بیٹیاں بھی "مال" سمجھی جانے لگیں اور اس طرح عورت کی حکومت یا مالکانہ حیثیت غائب ہو کر مردوں کی حکومت و ملکیت قائم ہو گئی۔ علاوہ ازیں چونکہ میدان جنگ اور مال و متاع کی حفاظت کے لئے مردوں کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے اولاد نرینہ کو فوقیت دیگئی اور لڑکیاں ذلیل سمجھی جانے لگیں، ترکوں سے محروم کی گئیں اور بعض بعض قوموں میں ان کو قتل کر دینے کا رواج قائم ہو گیا

**گرفتاری عروس** | دختر کشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل میں عورتوں کی کمی ہونے لگی لیکن چونکہ سرداران قبایل کا فرض تھا کہ وہ اپنی نسل کو نہ صرف باقی رکھیں بلکہ ترقی دیں، لہذا وہ کسی ہمسایہ قبیلہ کو جو نسبتاً کمزور ہوتا تاک لیتے، بعد ازاں ایک مہم مرتب کر کے بے خبری میں اس کمزور قبیلہ پر جا پڑتے، ان کی جوان بہو بیٹیاں چھین لاتے اور اپنے قبیلہ کے نوجوانوں سے اُن کی شادیاں کر دیتے۔ یہ شادی گویا بذریعہ گرفتاری ہوتی تھی۔ اس قسم کا رواج ترکستان کے ازبکوں، ترکمانوں، قرغیزوں اور قفاقوں میں اب تک موجود ہے۔ اگرچہ اب جنگ تو نہیں ہوتی لیکن برات کی صورت

## ۱۳

بالکل جنگی مہم جیسی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بھی گوجر قوم کی برات جب "چڑھتی" ہے تو تمام براتی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ آگے آگے ایک شخص گھوڑے پر سوار نقارہ پر چوب مارتا چلتا ہے۔ تمام برات اسی وضع سے دلہن کے گھر پہونچتی ہے اور اسے بیاہ لاتی ہے۔ اس رواج میں بھی "عسکریت" موجود ہے۔ بعض قوموں میں دولھا اپنی گود میں دلہن کو اُٹھا کر محافہ میں سوار کراتا ہے۔ گویا وہ اپنی دلہن کو "بقوت بازو" چھین لایا ہے۔ بعض اقوام میں جب برات دلہن کے گھر پہونچتی ہے تو دلہن کے طرفدار برات کو روکتے ہیں یہ گویا "مزاحمت" ہے۔ اور اسی زمانہ کی یادگار چلی آتی ہے جب دلہن کو بذریعۂ تاخت گرفتار کرکے لایا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل میں بھی یہ رواج موجود تھا ملاحظہ ہو "صحیفہ قاضیون باب ۲۱ آیتہ ۱۰ الغایتہ ۲۲ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تب اُنھوں نے بارہ ہزار مرد بہادر روانہ کئے اور انہیں حکم دیا کہ یبیس جلعاد کے باشندوں کو جاکر قتل کریں تمام ان عورتوں کو جو مردوں سے ہمبستر ہو چکی ہوں ہلاک کریں۔ پس انھوں نے یبیس جلعاد میں چار سو کنواری عورتیں پائیں جو مرد سے ناواقف تھیں اور وہ انہیں سرزمین کنعان میں سیلا کے بیچ لشکر میں لے آئے۔ پھر انہوں نے بنی بنیامین کو طلب کیا اور ان عورتوں کی ان سے شادیاں کردیں لیکن وہ ان کو کافی نہ ہوئیں۔ تب جماعت کے لوگ بولے کہ جو مرد بچ رہے ہیں انکے لئے بھی بیویوں کی فکر کی جائے تاکہ بنی اسرائیل کا ایک فرقہ نابود نہ ہو جائے۔ مگر لوگوں نے کہا کہ ہم نے قسم کھائی ہے کہ بنی بنیامین کو اپنی بیٹیاں ہرگز نہ دیں گے تب انھوں نے یہ مشورہ کیا کہ سیلا میں اس جگہ جو جانب شمال بیت ایل کی سڑک پر واقع ہے اور لبونہ کے جنوب میں ہر سال خداوند کی عید مناتے ہیں۔ [illegible]

۱۳

بنی بنیامین جائیں اور تاکستانوں میں چھپ کر گھات میں رہیں۔ جب سیلا کی بیٹیاں رقص و چنگ لیکر ناچتی ہوئی نکلیں تو کمیں گاہوں سے نکل کر ہر شخص اپنے لئے ایک لڑکی گرفتار کرے اور اپنے ملک کو چلا جائے۔ الغرض بنی بنیامین نے ایسا ہی کیا اور اپنے لئے ایک ایک بیوی پکڑ لے گئے۔

یہی کارروائی زمانۂ قدیم میں رومیوں نے کی تھی جب انہیں بیویوں کی ضرورت پڑی تھی۔ رومیولس نے صابین (Sabine) لوگوں اور قرب و جوار کے شہروں اور قصبوں کے باشندوں کو عام تماشہ دیکھنے کے لئے مدعو کیا۔ اور جب اطراف و جوانب کے مرد و زن جمع ہوئے تو رومیوں نے چھاپہ مارا اور جس قدر عورتیں شادی کے قابل ان کے ہاتھ لگیں پکڑ لے گئے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ روم مصنفہ لڈل صاحب صفحہ ۲۰ Liddell's History of Rome P. 20)

---

بعض وحشی قوموں میں بیوی کا لانا اور بھی زیادہ سخت کام ہے۔ دولھا چھپ کے خسر کے گھر میں گھس جاتا ہے۔ اور دلہن کے سر میں ایک ایسی سخت ضرب لگاتا ہے کہ بیچاری بیہوش ہو کر گر جاتی ہے۔ بعد ازاں وہ لڑکی کو اسی طرح بعالم بیہوشی اٹھا کر کندھے پر لاد کر بھاگ جاتا ہے۔ سسرال والے اس کا تعاقب کرتے اور اینٹ پتھر مارتے ہیں۔ اور اگر پکڑا جاتا ہے تو ڈنڈوں سے بھی خبر لیتے ہیں۔ الغرض دولھا کے لئے لازم ہے کہ وہ جس قدر طاقتور ہو اور جس قدر چست و چالاک ہو اسی قدر تیزی کے ساتھ دلہن کو لیکر فرار ہو جائے۔ یہ گویا رسم شادی ہے۔ اور اس زمانہ کی یادگار ہے جب سچ مچ جنگ کر کے بیویاں حاصل کی جاتی تھیں۔

۱۴

**خریداری عروس** | جب ارتقائے تہذیب و تمدن کے ساتھ انسان کی چوپانی اور خانہ بدوشی زراعت و عمرانیت میں تبدیل ہوئی۔ تو اسی کے ساتھ ساتھ عسکریت بھی ضعیف ہونے لگی اور بعد کو مستقل بستیاں بس گئیں، حکومتیں قائم ہوگئیں، سماج کے تحفظ کے لئے آئین و قوانین وضع ہونے لگے اور دوسروں کی لڑکیاں چھین لانے کا دستور بند ہوگیا۔ اب شادی کی دو صورتیں رہ گئی تھیں۔ یا تو دلہن کو برضامندی اس کے والدین سے حاصل کیا جائے یا اسے دولت کے عوض خریدا جائے۔ دولتمندوں میں تو بغیر معاوضہ کے باہمی رشتۂ ازدواج آسان تھا۔ لیکن عوام میں طریق ازدواج نے یہ صورت اختیار کرلی کہ لڑکی اس کے والدین سے مال دے کر خرید لی جاتی۔ یا لڑکی والا داماد سے مدت معینہ تک کوئی خدمت لیتا رہتا۔ ہندوستان میں اب بھی روپیہ لیکر ماں باپ کا اپنی نوعمر لڑکیوں کو ضعیف آدمیوں سے بیاہ دینا اکثر دیکھا جاتا ہے۔ افریقہ میں بیویاں مویشیوں کے عوض خریدی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے جاٹوں میں بعض مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ جو عورت کھیت میں جاکر اپنے ہاتھوں سے دو من چارہ کاٹ کر سر پر لاد لائے اور پھر چارہ کاٹ کر بھینسوں کو کھلا دے اس کی قیمت وہ ایک ہزار روپیہ مقرر کرتے ہیں۔ خواہ وہ خوبصورت ہو یا بدصورت یہاں گویا اقتصادی پہلو مدنظر ہوتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ افغانستان میں بھی لڑکی کے عوض روپیہ لیا جاتا ہے جسے وہ اپنی اصطلاح میں "حق شیر مادر" کہتے ہیں۔ لیکن بنگالیوں میں یہ دستور اُلٹا ہے یہاں لڑکا اپنے خسر سے اپنی قابلیت، اور حیثیت کے لحاظ سے روپیہ وصول کرتا ہے۔ اسی مذموم رواج کا نتیجہ ہے کہ بہت سی بنگالی لڑکیاں جن کے والدین

## ۱۵

مفلس ہوتے ہیں مایوس ہو کر خودکشی کر لیتی ہیں کوہستان شملہ میں اب بھی اس قسم کی زن فروشی کا میلہ ہر سال منعقد ہوتا ہے

بعض وحشی اقوام میں عورتیں اس لئے خریدی جاتی ہیں کہ وہ اپنے آقا کی خدمت کریں۔ ان کے ذمہ جو فرائض زوجیت ہیں وہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن لوگوں میں کثرت ازدواج کا دستور ہے ان کی نسبت یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی کنیزیں ان کی بیویاں ہیں۔ نہ کہ ان کی بیویاں ان کی کنیزیں ہیں۔ کیونکہ وہ لونڈیوں کی طرح خریدی جاتی ہیں اور لونڈیوں کی طرح کام کرتی ہیں۔

کناڈا میں نئی دلہن کے حجرہ میں ایک دیگچی۔ ایک قسمہ اور گٹھا لکڑیوں کا رکھدیا جاتا ہے۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ آئندہ سے دلہن کا فرض یہ ہوگا کہ کھانا پکائے۔ بوجھ اُٹھائے اور شوہر کے لئے جنگل سے لکڑیاں لائے۔

ممالک چرکس میں عورتیں ہی زمین میں کھاد ڈالتی ہیں اور ملک چین کے بعض حصص میں عورتیں ہل بھی چلاتی ہیں۔ ہندوستان میں عورتیں کھیتی باڑی کا کام کرتی ہیں۔ مراکش اور شمالی افریقہ کے اکثر حصص میں بیوی ہی زمین کھودتی بیج بوتی اور فصل کاٹتی ہے۔ عرب کی عورتیں اپنے شوہروں کے گھوڑوں کی خدمت کرتی ہیں، سواری کے وقت اس پر ساز لگاتی ہیں اور گھر کا تمام کام کرتی ہیں۔

کلیسا نے بھی عورت کو مرد کا غلام رکھا، چنانچہ انگریزی قانون میں بیوی اپنے شوہر کا مال متصور ہوتی تھی اور نکاح کے بعد اس کو اپنے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ ہوتا تھا، حتیٰ کہ اس کی ذاتی جایداد بھی شوہر ہی کی ملکیت ہو جاتی تھی۔

**اقسام ازدواج از روے دھرم شاستر** | ہندؤں میں دھرم شاستر کی رو سے بیاہ کی آٹھ قسمیں ہیں:- (۱) برہم بواہ (۲) دیو بواہ (۳) ارشا بواہ (۴) پرجاپتی بواہ (۵) اسر بواہ۔ (۶) گندھرب بواہ (۷) راکشس بواہ (۸) پشاچ بواہ۔

منوسمرتی میں لکھا ہے کہ نکاح کے یہ آٹھوں طریقے جائز ہیں۔ لیکن اول چار قسمیں برہمنوں کے لئے ہیں اور اول چھ قسمیں چھتریوں کے لئے مناسب ہیں۔ راجہ اگر چاہے تو راکشس بواہ بھی کر سکتا ہے۔ اسر بواہ صرف ویش اور شودر اقوام کے لئے ٹھیک ہے۔

ان آٹھ قسموں میں تقریباً ہر قسم کی شادی آجاتی ہے۔ ذیل میں ان کی اجمالی کیفیت درج کی جاتی ہے:-

(۱) برہم بواہ۔ وہ طریقۂ ازدواج ہے، جو ہندوں میں عام طور پر رائج ہے یعنی لڑکی والے اپنی بیٹی کے لئے مناسب بر تلاش کر لیتے ہیں اور تمام باتیں طے ہو چکنے بعد دھوم دھام سے شادی کر دیتے ہیں۔

(۲) دیو بواہ۔ اس میں لڑکی کی شادی کسی دیوتا سے کر دی جاتی ہے۔ اور وہ لڑکی اسی دیوتا کے مندر میں زندگی کے دن گذارتی ہے۔ ایسی لڑکیوں کو دیو داسیاں یا مُرلیاں کہتے ہیں۔ یوروپ میں بھی کلیسہ کی کنواریاں (NUNS) ہوتی ہیں جو ذہنی طور پر یسوع کی بیویاں متصور ہوتی ہیں۔ اور تمام عمر پاکدامنی کے ساتھ بسر کر دیتی ہیں۔

(۳) ارشا بواہ۔ یہ درحقیقت رشیوں کا طریقۂ ازدواج ہے۔ ان مرتاض اور

تارک الدنیا لوگوں کے پاس لینے دینے کو تو کچھ ہوتا نہیں۔ لوگ ان کو مقدس و بزرگ سمجھکر لڑکی حوالہ کر دیتے ہیں۔ اسے اصطلاح میں "کنیادان" کہتے ہیں۔

(۴) پرجاپتی بواہ۔ اس میں لڑکا اور لڑکی خاص اہتمام کے ساتھ شادی کرتے ہیں ذات برادری کا کافی خیال رکھا جاتا ہے۔ لڑکی والے برادری کو کھلا پلا کر اور لڑکی کو حتی الامکان معقول جہیز دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔

(۵) اسُر بواہ۔ ادنیٰ درجہ کا بیاہ ہے۔ کیونکہ اس میں کسی قدر خرید و فروخت کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے ذلیل سمجھا گیا ہے

(۶) گندھرب بواہ۔ مرد و عورت اگر بالغ اور آزاد ہوں۔ اور بطیب خاطر دونوں ایک دوسرے کو قبول کر لیں خواہ کوئی گواہ موجود ہو یا نہ ہو تو اسے گندھرب بواہ کہتے ہیں۔ کالی داس کی مشہور و معروف ناٹک میں شکنتلا اور راجہ دشینت کی شادی جنگل میں اسی طرح ہوئی تھی۔

(۷) راکشش بواہ۔ اگر کسی شخص کی لڑکی کو جبراً بھگا لیا جائے اور پھر اس سے شادی کی جائے تو اسے راکشس بواہ کہتے ہیں۔ اس قسم کی شادیوں کا نتیجہ عموماً خراب نکلتا ہے اور فریقین میں کشت و خون تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ اس قسم کی شادیوں نے اکثر سلطنتوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ مثلاً راجہ پرتھوی راج والی دہلی و اجمیر نے راجہ جے چند والی قنوج کی لڑکی کو عین "سوامبر" سے بھگایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں سلطنتیں غارت ہو کر ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہو گئی۔

حسب روایت زمانہ راون نے بھی سیتا جی کو بیجا کر اپنی سلطنت کو برباد کر دیا

اسی طرح بائبل کی وہ روایت ہے جس میں امیر حوی حمور کے لڑکے سلم نے یعقوب کی بیٹی دینہ کو بھگایا اور اس کے باعث اس کی تمام قوم قتل ہوئی۔

(۸) پشاچ بواہ۔ یعنی کسی لڑکی کو شراب پلاکر۔ یا دارو سے بیہوشی دیکر۔ یا بحالت خواب دبوچ کر اختلاط کیا جائے۔ اس تعلق کو دھرم شاستر میں نہایت ذلیل خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں عورت مردہ کی طرح بے حس ہوتی ہے۔ اس قسم کا تعلق زنا شوی ہر ملک و قوم کی سوسائٹی میں مذموم خیال کیا جاتا ہے اور قانوناً جرم ہے بائبل میں بھی اس قسم کے قصے موجود ہیں۔ مثلاً لوط کا وہ قصہ دیکھئے جب ان کی دو بیٹیوں نے اپنے باپ کو شراب پلاکر نامعقول حرکت کی تھی

**شادی کی اور صورتیں** | ارتقار تمدن کے ساتھ جب انسان نے عورت کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا تو لڑکیوں کو ایک حد تک انتخاب شوہر کی آزادی بھی دیجانے لگی ہندوستان کے راجاؤں میں یہ دستور تھا کہ جب ان کی بیٹی جوان ہوجاتی تھی تو وہ کسی خاص شوہر کی تلاش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ برہمنوں اور پنڈتوں سے مہورت لیکر شادی کے لئے ایک خاص دن مقرر کردیتے تھے۔ کچھ زمانہ قبل اس تاریخ کی اطلاع ملک کے تمام راجاؤں راجکماروں کو دیدی جاتی تھی۔ تاریخ مقررہ پر جب تمام مہمان جمع ہوجاتے تھے تو ایک جلسہ کیا جاتا تھا۔ جہاں کوئی شرط پیش کی جاتی تھی اور جو شریف النسب شخص اس شرط کو پورا کردیتا تھا۔ اسی کے گلے میں وہ لڑکی اپنی پسندیدگی کا ہار ڈال دیتی تھی اس انتخاب کو "سوامبر" یعنی (جلسۂ انتخاب شوہر) کہتے تھے۔

ہندوستان میں سوامبر کے بعض واقعات خاص تاریخی حیثیت رکھتے ہیں

۱۹

(۱) مہابھارت کا سوامبر جو راجہ دروپدی نے اپنی بیٹی دروپدی کے لئے منعقد کیا تھا۔ اور جس میں تیر اندازی کی نہایت مشکل شرط رکھی گئی تھی۔ اس شرط کو حاضرین جلسہ میں سے کوئی پورا نہ کر سکا لیکن ارجن نے جو اس وقت فقیروں کے بھیس میں تھا اس شرط کو پورا کر کے دلہن کو جیت لیا تھا۔

(۲) رامائن کا سوامبر جس میں راجہ جنک نے اپنی بیٹی جانکی عرف سیتا جی کی شادی کے لئے ہمعصر راجاؤں اور شہزادوں کو مدعو کیا تھا۔ اس میں شرط یہ رکھی گئی تھی کہ جو شخص شیو جی کی دھنش (کمان) کو بزور بازو زہ کر دے وہی لڑکی کا شوہر منتخب ہوگا۔ دیگر امرا ادائے شرط سے قاصر رہے لیکن رامچندر جی نے اپنی قوت بازو سے اس کمان کو نہ صرف زہ کیا بلکہ توڑ دیا۔ اور جانکی جی کو جیت لائے۔

(۳) تیسرا تاریخی سوامبر راجہ جے چند والی قنوج کی بیٹی کا ہے۔ جس میں لڑکی کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ شریک جلسہ امراء میں سے جس کو چاہے منتخب کر کے اسکے گلے میں ہار ڈال دے۔ اس جلسہ میں والی قنوج نے اپنے حریف راجہ پرتھوی راج والی دہلی و اجمیر کو مدعو نہیں کیا تھا جو منتخب جانباز راجپوتوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ پوشیدہ طور پر جلسہ میں پہونچا اور لڑکی کو اڑا لایا۔ اسی واقعہ نے ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت قائم کی۔

اسی قسم کا رواج ایران قدیم میں بھی تھا۔ بڑے بڑے گھرانوں میں جب لڑکیاں جوان ہو جاتی تھیں۔ تو اپنے کنبہ اور مرتبہ کے نوجوانوں کو مدعو کر کے لڑکی کو انتخاب شوہر کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ اس طریق کار کو اصطلاح میں "جشن شوہر گزیدان"

کہتے تھے۔ ان واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج صرف ان اقوام میں پایا جاتا تھا جنھیں یوروپ کی اصطلاح میں "انڈو ایرانین" (Indo-Iranian) یعنی "ہندی ایرانی آریا" کہتے ہیں۔

بعض اقوام میں عارضی شادی کا بھی رواج ہے یعنی زن و مرد ایک مدت کے لئے عہد و پیمان کر لیتے ہیں اگر اس دوران میں عورت موافق مزاج کے ثابت ہوئی تو مستقل نکاح کر لیا جاتا ہے ورنہ فریقین میں مفارقت ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی شادی کو "متعہ" کہتے ہیں

**داشتہ عورتیں** جزائر غرب الہند کے جزیرہ ہائٹی (Haiti) میں دو قسم کی بیویاں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کا نکاح باضابطہ قوانین کلیسہ کے ماتحت ہوتا ہے اور دوسری وہ جو بغیر رشتۂ ازدواج محض تراضی طرفین کے اصول پر گھروں میں ڈال لی جاتی ہیں۔ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر کا نکاح مقررہ طریقہ پر ہوتا ہے لیکن موخر الذکر کے لئے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں ہے نکاح تو صرف عدالت ہی میں منسوخ ہو سکتا ہے، لیکن دوسری قسم کا تعلق صرف ۲۴ گھنٹے کی نوٹس پر ختم ہو سکتا ہے۔

وہاں یہ دونوں تعلقات احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں بلکہ دوسرے طریقہ کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کے وہی حقوق ہیں جو منکوحہ کی اولاد کے ہوتے ہیں۔

یوروپ میں بھی یہ رواج بکثرت پایا جاتا تھا۔ قدیم ویلز اور قدیم روم میں، اسی عورت کو ذلیل نہیں سمجھا جاتا تھا اور منکوحہ بیوی بھی اس کو

گوارا کر لیتی تھی۔

ڈیوفورڈ (Dewford) نے لکھا ہے کہ شہنشاہ شارلیمن کے زمانہ میں لفظ Concubine (داشتہ یا حرم) معزز لفظ خیال کیا جاتا تھا اور ایسی عورتوں کا درجہ بیویوں کے برابر سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ اگر وہ کبھی فحش کی مرتکب ہوئیں تو انھیں وہی سزا دیجاتی جو منکوحہ عورتوں کے لئے مقرر تھی۔

ممالک مشرق میں حرموں اور کنیزوں کی طرف جس قدر توجہ کی گئی اس سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں

**شادی کی انگوٹھی** اگرچہ قدیم اہل روما میں عورتوں کی کافی عزت و وقعت کی جاتی تھی، لیکن قدیم جرمنوں نے جو فطرتاً نہایت جنگجو واقع ہوئے تھے بیوی کو کبھی گھر کی لونڈی سے زیادہ نہ سمجھا اور "خریداری عروس" ہی کے طریقہ کو وسعت دی اور اس طرح سارے یورپ میں "عروس فروشی" کا رواج عام طور پر پھیل گیا۔ پہلے تو بطور بیعانہ کچھ نقد رقم وصول کر لی جاتی تھی لیکن بعد میں جب سوسائٹی اس بات کو معیوب خیال کرنے لگی تو بجائے رقم بیعانہ کے دلہن کو ایک بیش قیمت انگشتری پیش کی جانے لگی۔ اس کو جرمن اصطلاح میں "اڑھا" (Arrha) کہتے تھے جس کے معنی ہیں "شادی کا بیعانہ"۔

قرون وسطیٰ میں اس رسم کے ساتھ اور رسمیں شامل کر کے دلہن کو بالکل کنیز کی حیثیت دیجانے لگی

۲۲

مثلاً انگلستان میں دستور تھا کہ جب دولھا دلہن کے سامنے انگوٹھی پیش کرے تو وہ پہن کر شوہر کے قدموں میں گر جائے۔ روس میں بھی دلہن اپنے شوہر کے پاؤں چوما کرتی تھی۔ پھر بعد کو اس رسم میں کچھ تبدیلی کر دی گئی، یعنی منگنی کے وقت تو دُلہن، قصداً انگوٹھی کے ہاتھ سے نکال کر شوہر کے قدموں پر گرا دیتی اور اس کو اٹھانے کے بہانے سے شوہر کے پاؤں چھو لیتی

مشرقی اقوام کی عورتیں جس قدر زیور پہنتی ہیں وہ سب ان کے غلام ہونے کی نشانیاں ہیں۔ مثلاً ہاتھوں کے زیور (کڑے چوڑیاں وغیرہ) بجائے ہتکڑیوں کے ہیں اور پاؤں کے زیور بیڑیاں۔ گلے کے زیور میں ایک طوق بھی ہوتا ہے جو اپنا مفہوم خود ظاہر کر رہا ہے۔ ناک کی نتھ (اونٹ کی نکیل کی طرح) قابو میں رکھنے کی علامت ہے اور کان کے زیور حلقہ بگوشی کو ظاہر کرتے ہیں۔

**آزمائشی شادیاں** | یورپ میں بغیر نکاح کے جو تعلقات جنسی قائم ہو جاتے ہیں انہیں "آزمائشی شادیاں" (Trial marriages) کہتے ہیں۔ ان تعلقات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نکاح سے قبل ہی آئندہ ازدواجی زندگی کے خوشگوار ہونے کا یقین کر لیا جائے

اس قسم کی آزمائشی شادیاں "کورٹ شپ" (Courtship) کا عمومی نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ اول اول باہم تعارف ہوتا ہے۔ پھر شناسائی ہوتی ہے اور یہی شناسائی رفتہ رفتہ کجائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے یہ طریقہ قلطی (Celtic) اور طوطانی (Teutonic) ممالک میں عام طور پر رائج ہے۔ اور مختلف علاقوں میں اس کے لئے مختلف اصطلاحیں رائج ہیں۔ مثلاً

"Jenterlin" - "Probenächte" - "Bundling"
"Sittingup" - "Handfasting" - "Kill-gang"
وغیرہ وغیرہ "Courting on the bed"

ویلز میں کسی وقت یہ رواج عام تھا، انگلستان کے اکثر اضلاع میں جیسے چیشائر (Cheshire) وغیرہ میں اب بھی موجود ہے۔ اٹھارھویں صدی میں آئرلینڈ کے اندر بھی یہ رواج موجود تھا۔ نیو انگلینڈ میں اسے Tarrying (ٹھہرنا) کہتے ہیں۔ ولندیز (Holland) میں اس کے لئے اصطلاح Questing (تلاش کرنا) موجود ہے۔ اور ملک تاروے میں اسے Night tuning کہتے ہیں۔

اگر فریقین کے درمیان یہ آزمائشی شادی کامیاب ثابت ہوتی ہے تو باقاعدہ نکاح کر لیا جاتا ہے۔ ورنہ اس آزمائش کے لئے دوسرا میدان تلاش کر لیا جاتا ہے

اگر اس قسم کے تعلقات کے دوران میں کوئی بچہ بھی پیدا ہو جاتا ہے تو سوسائٹی میں اس عورت کو ذلیل نہیں سمجھا جاتا۔ انگلستان کے علاقہ اسٹیفورڈ شائر (Staffordshire) میں تو یہ رواج بہت عام ہے اور وہاں مشہور ہے کہ ایسی عورتیں نہایت اچھی رفیق، حد درجہ وفاکش بیویاں اور مائیں ثابت ہوتی ہیں"

پورٹلینڈ (Portland) میں جہاں کا سیمنٹ مشہور ہے اب تک یہ رواج چلا آتا ہے کہ عورت بغیر نکاح کے مرد کے ساتھ رہنا شروع کر دیتی ہے

اور جب استقرار حمل ہو جاتا ہے تو دونوں نکاح کر لیتے ہیں ورنہ فریقین کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

آزمائشی شادیوں کا رواج صرف دیہاتی علاقوں تک محدود نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے شہروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً ڈسپرے (Desperes) نے اپنی کتاب پیرس کی فحاشی "La prostitution à paris" میں صفحہ ۲۲۷ لکھا ہے کہ پیرس میں نوے فی صدی شادیاں ایسی ہوتی ہیں۔ جن میں فریقین کے مابین قبل از نکاح تعلقات پیدا ہو چکتے ہیں۔ ممکن ہے ان اعداد میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ پیرس میں پچاس فی صدی شادیاں ضرور اسی طرح ہوتی ہیں۔

طوطانی (Teutonic) ممالک میں قبل از نکاح، تعلق کا پیدا ہو جانا بہت قدیم چیز ہے۔ مثلاً سویڈن کے متعلق ایلن کی (Ellen Key) نے اپنی کتاب "Liebe und Ehe" میں صفحہ ۱۲۳ پر لکھا ہے کہ اس ملک کی غالب آبادی اسی آزمائشی طریقہ و نکاح کو پسند کرتی ہے اسی طرح روبین دولیسٹر گارڈ (Ruben & Westergaard) نے ڈنمارک کی نسبت لکھا ہے کہ زن و مرد کے تعلقات قانونی صورت اختیار کرنے بھی نہیں پاتے کہ استقرار حمل ہو جاتا ہے[1]

---

[1] قدیم مصریوں میں بھی رشتۂ ازدواج بہت لچکدار ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ اس بات کی آزمائش کے لئے کہ عورت بانجھ یا مرد بیکار تو نہیں چند روزہ ازدواجی تعلق پیدا کر لیا کرتے تھے لیکن اس وقت جو اقرار نامہ لکھا جاتا تھا اس میں پیدا ہونے والی اولاد کیلئے پورے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا۔

برلن میں اگرچہ ایسے بچوں کی تعداد ۷ فی صدی ہے لیکن دیگر شہروں اور اضلاع میں ان کی تعداد اس سے بھی بہت زیادہ ہے۔

چند سال گذرے جرمنی کے دیہاتی علاقوں میں اخلاق عامہ کی تحقیقات کرنے کے لئے پادریوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی تھی جس نے اپنی رپورٹ دو ضخیم جلدوں میں شائع کی اور جرمنی کے "اخلاق جنسیہ" کے متعلق نہایت مفصل معلومات بہم پہونچائیں۔ اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ ہنوور میں عام رواج یہ ہے کہ عورت مرد میں قبل از نکاح تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے لوگوں کا قول یہ ہے کہ جس طرح بغیر دیکھ بھال کے مال نہیں خریدا جا سکتا اسی طرح بغیر جانچ کئے ہوئے عورت سے نکاح بھی نہ کرنا چاہئے۔

یہی حال علاقہ سیکسنی (Saxony) کا ہے

اسٹیٹن (Stettin) کے بارہ اضلاع میں شادی سے قبل تعلق پیدا کر لینا عام رواج ہے باقی اضلاع میں بھی سوسائٹی اسکو برا نہیں سمجھتی اور ڈینزگ (Danzig) کے علاقوں میں نصف سے زیادہ نکاح ایسے ہی ہوتے ہیں

روس میں جس قدر جنسی آزادی حاصل ہے وہ سب کو بخوبی معلوم ہے مگر اطالیہ میں لڑکیوں کو ایسی آزادی حاصل نہیں ہے۔ نہ جوان لڑکیاں تنہا باہر جا سکتی ہیں۔ نہ کوئی مرد ان سے تنہائی میں مل سکتا ہے۔

آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کی نسبت آج سے تیس سال قبل یہ مشہور تھا کہ وہاں جو شخص نیا نیا جا کر آباد ہوتا ہے تو قدیم باشندوں کی بیحیائی اور بد اخلاقی دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ لیکن اب اس جنسی آزادی میں اور بھی ترقی ہو گئی ہے

چنانچہ پادری ایچ نارتھکوٹ (H. North Cole) نے جو بہت سال تک جنوبی دنیا میں رہ چکے ہیں۔ اپنی کتاب "مسیحیت اور مسائل جنسیہ" (Christianity & Sex Problems) میں تحریر فرماتے ہیں کہ آسٹریلیا کے مختلف حصص میں "بے نکاحی بیویوں" کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے" علاوہ ازیں ڈاکٹر کوغلان (Coghlan) جو آسٹریلیا کے متعلق سب سے بڑے مستند و معتبر محقق ہیں اپنی کتاب "نیو ساؤتھ ویلز میں پیدائش اطفال" میں تحریر فرماتے ہیں کہ:- آسٹریلیا کے علاقہ نیو ساؤتھ ویلز میں چھ سال کے اندر انچاس ہزار چھ سو اکتالیس شادیاں درج رجسٹر ہوئیں جن میں تیرہ ہزار تین سو چھیاسٹھ دلہنیں ایسی تھیں جو حقیقتاً پہلے ہی شادی کے حکم میں داخل ہو چکی تھیں

جزیرہ جامیکا (Jamaica) میں اور بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ باقاعدہ رشتۂ ازدواج سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ وہاں کی عورتوں کا تجربہ یہ ہے کہ بے نکاح کا شوہر بمقابلہ جائز اور قانونی شوہر کے زیادہ وفادار اور محبت شعار ثابت ہوتا ہے۔

بی۔ لونگسٹن (Lunning Lone) نے اپنی دلچسپ کتاب "سیاہ جامیکا" (Black Jamaica) میں لکھا ہے کہ "یہاں کے باشندے یہ کہتے ہیں کہ محبت و وفاداری اور اتفاق کے ساتھ رہنا ہی شادی ہے، گو اس پر کلیسہ کی مہر ثبت کی نہ ہوئی ہو"

یہی حال وینی زولا (Venezuela) کا ہے لیکن آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی نسبت قرر (Grey) نے لکھا ہے کہ:- یورپین اقوام کے

آنے سے پیشتر آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں سولہ برس عمر کی ایک بھی لڑکی ایسی نہ ہوتی تھی جس کا باقاعدہ شوہر موجود نہ ہو۔ لیکن اب شادیاں زیادہ عمر میں کی جاتی ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ تقاضائے فطرت پورا کرنے کے لئے ناجائز طریقے استعمال کئے جاتے ہیں

**وحشی اقوام میں نکاح کی صورتیں** اس میں شک نہیں کہ وحشی اقوام میں وحدت ازدواج کا رواج کبھی نہیں پایا گیا۔ ان کے یہاں اشتراکیت کی دونوں صورتیں پائی جاتی تھیں یعنی جس طرح ایک عورت مختلف مردوں کی بیوی بن سکتی تھی اس طرح ایک مرد مختلف عورتوں کا شوہر ہو سکتا تھا۔

چنانچہ شمالی ہند کے بعض کوہستانی علاقوں میں اب بھی یہ رواج پایا جاتا ہے کہ اگر کسی گھر میں کئی بھائی ہوتے ہیں تو شادی صرف بڑے بھائی کی ہوتی ہے، لیکن عملاً تمام بھائی اس عورت سے متمتع ہوتے ہیں پہلی اولاد بڑے بھائی کی، دوسری دوسرے بھائی کی اور تیسری تیسرے بھائی کی شمار ہوتی ہے۔ ان میں نہ باہم کوئی جھگڑا ہوتا ہے نہ جذبۂ رقابت۔

بھوٹان اور تبت کے اکثر علاقوں میں بھی یہی دستور ہے کہ ایک عورت کئی کئی شوہر رکھتی ہے اور سب کی اطاعت کرتی ہے۔ مرد جو کچھ کما کر لاتے ہیں، عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور اولاد پر بھی عورت ہی کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

دارجلنگ سے اوپر کوہستانی علاقوں میں بھی یہی رواج ابتک پایا جاتا ہے اور قدیم یورپ کی تاریخ میں اسی طریق عمل کی متعدد مثالیں ملتی ہیں بلکہ جرمنی میں تو ایک دستور بہت زیادہ عجیب و غریب یہ بھی تھا کہ اگر شوہر

کسی سبب سے افزایش نسل کا اہل نہیں رہتا تھا تو بیوی اس کمی کو دوسرے طریقہ سے بھی پورا کر سکتی تھی۔

**طلاق و خلع** | شادی اسی وقت تک صحیح معنی میں شادی رہتی ہے جبتک میاں بیوی دونوں میں اتفاق قایم رہے اور جب نا اتفاقی پیدا ہو تو دونوں کو علحدہ ہو جانا چاہئے اور اس علحدگی کو طلاق کہتے ہیں۔ اگر شوہر بیوی سے ناخوش ہو اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو مرد بیوی کو علحدہ کر دیتا ہے۔ یہ طلاق ہے۔ اگر مرد آوارہ ہو اور اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہو اور بیوی مجبور ہو کر مفارقت اختیار کرے تو اسے اصطلاح میں خلع کہتے ہیں۔

ہندو دھرم شاستر میں اس قسم کا کوئی قاعدہ نہیں رکھا گیا۔ میاں بیوی کے تعلقات تا زیست قائم رہتے ہیں۔ پہلے مسیحی اقوام میں بھی طلاق و خلع کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ میاں اور بیوی کے تعلقات تا زیست ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ طلاق کا قاعدہ نکالا گیا۔ مگر یہ قاعدہ صرف اس قدر اثر رکھتا تھا کہ میاں اور بیوی دونوں میں مفارقت کرا دے۔ لیکن دونوں میں سے کوئی تاحین حیات دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر چونکہ اس کے نتائج اور بھی زیادہ خراب نکلے اس لئے رفتہ رفتہ اب تقریباً عام اقوام و ممالک میں طلاق و خلع دونوں کا قانون بن گیا ہے۔

**طلاق قدیم روم میں** | قدیم روم میں دو قسم کی شادیاں ہوا کرتی تھیں عارضی اور مستقل عارضی شادی کی مدت صرف ایک سال ہوتی تھی جسے اصطلاح میں "marriage by usus" کہتے تھے۔ اس میں مرد و عورت

بغیر کسی تقریب یا رسم کے تعلقات پیدا کر لیتے تھے۔ اور یہ تعلقات سال بھر تک رہتے تھے۔ اگر اس دوران میں مرد و عورت کی زندگی لطف و محبت کے ساتھ بسر ہوئی تو وہ بعد انقضاے میعاد مستقل شادی کر لیتے تھے۔ ورنہ بغیر کسی عدالت یا پنچایت کی مداخلت کے فریقین میں خود بخود علیحدگی ہو جاتی تھی۔

**قدیم ویلز میں** | قدیم ویلز کی عورتوں کو شادی سے قبل و بعد بہت زیادہ آزادی حاصل ہوتی تھی۔ رہائس ویرائمور جونس ( Rhys + Brymor Jones ) نے لکھا ہے کہ "یہاں یہ دستور عام ہے کہ جب کبھی مرد یا عورت فسخ تعلقات کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود بخود فریقین کی رضا مندی سے علیحدہ ہو جاتے ہیں"۔ یہی حال آئرلینڈ میں تھا اور تعلقات نکاح کا منقطع کر دینا بہت آسان تھا۔ جب عورت اپنی درخواست پر خلع حاصل کر لیتی تھی تو وہ اپنا تمام مال خواہ میکہ سے لائی ہو یا شوہر نے دیا ہو سب اپنے ساتھ لیجاتی تھی

**قدیم چین میں** | چین میں طریقۂ طلاق قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ اگر میاں بیوی کے مزاج میں موافقت نہیں ہوتی اور دونوں علیحدہ ہونا چاہتے ہیں تو باہمی رضا مندی سے تعلقات منقطع کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہاں طلاق و خلع کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ اگر بیوی غیر وفادار ثابت ہو یا فریقین میں سے کوئی کسی کو ضرر شدید پہونچائے تو طلاق لازمی ہو جاتی ہے۔

**جاپان میں** | جاپان میں جدید قانون دیوانی ( ) کے مطابق شادی اس طرح ہوتی ہے کہ دو گواہوں کے ساتھ شادی کی اطلاع رجسٹرار کو دیدی جاتی ہے۔ لیکن شادی ہمیشہ فریقین کی رضا مندی دالدین

بزرگوں کی اجازت سے ہوتی ہے۔ شادی کے سلسلہ میں احباب و اعزہ کے لئے جلسۂ ضیافت بھی ہوتا ہے لیکن قانون اس کے لئے مجبور نہیں کرتا۔ ایسا کرنا نہ کرنا فریقین کی خوشی پر منحصر ہے۔

طلاق کا قاعدہ بھی وہی ہے جو شادی کا ہے یعنی رجسٹرار کو نوٹس دیدیا جاتا ہے کہ نکاح فسخ کر دیا جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں کی عمر پچیس سال سے زیادہ ہو۔ اگر فریقین کی عمر اس سے کم ہے یا کہ فسخ نکاح کے لئے باہمی رضامندی حاصل نہیں ہو سکتی ہے تو اس کے لئے قانونی علحدگی (judicial divorce) کا قاعدہ موجود ہے۔ قانونی طلاق مختلف اسباب کی بنا پر حاصل کی جا سکتی ہے۔

**ایسکیمو قوم میں** | علاقہ قطب شمالی کی ایسکیمو (Eskimo) قوم میں معاشرتی و تمدنی لحاظ سے مرد و زن دونوں برابر ہیں۔ شادی بیاہ میں قطعی آزادی ہے۔ اور اسی طرح فریقین میں کبھی بدمزگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔

**فرانس میں** | فرانس میں جب قانونی طلاق ہوتی ہے تو عورت کو درجۂ مساوات دیا جاتا ہے سخت تکلیف کی صورت میں طلاق بآسانی حاصل ہو جاتی ہے (لیکن ناموافقت کا عذر بہت کم سنا جاتا ہے) علاوہ ازیں جج کو اختیار ہے کہ فریقین کو علحدگی میں بلا کر سمجھائے اور اگر فریقین رضامند نہ ہوں تو عدالت میں کھلم کھلا سماعت مقدمہ کئے بغیر طلاق کی ڈگری دیدے۔ لیکن اب فرانس میں زیادہ تر رجحان یہ ہو رہا ہے کہ باہمی رضامندی سے طلاق ہو جایا کرے اور فریقین کی عدالت میں جا کر رسوائی نہ ہو۔

۳۱

**جرمنی میں** | ریاست پروشیا میں ۱۹۰۰ء سے پیشتر طلاق کے متعلق یہ قاعدہ جاری تھا کہ فریقین دنیا میں رسوا ہوئے بغیر قطع تعلقات کر لیا کرتے تھے لیکن ۱۹۰۰ء میں جدید قانون جاری ہوا۔ جس میں اگر شوہر یا بیوی ایک دوسرے کو چھوڑ کر بھاگ جائے یا فریقین میں سے کوئی پاگل ہو جائے تو طلاق بآسانی مل جاتی ہے لیکن دیگر صورتوں میں بہت مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں۔

**روس میں** | ۱۹۱۷ء سے پیشتر روس میں طلاق کا حاصل کرنا سخت دشوار تھا۔ لیکن بعد ازاں فریقین کے لئے یہ سہولت کر دی گئی کہ اگر نباہ نہ ہو سکے تو دونوں باہمی رضامندی سے علیحدہ ہو جائیں۔ اگر سال بھر علیحدہ رہ کر وہ پھر رضامند ہو جائیں تو دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن جب سے روس میں بالشویت کا دور ہوا ہے تمام چیزوں کا تقدس زائل ہو گیا ہے۔ اب وہاں شادی بھی برائے نام ہوتی ہے اور علیحدگی بھی اسی آسانی کے ساتھ ہو جاتی ہے

**انگلستان میں** | ازدواج و طلاق کے مسئلہ میں انگلستان کا قانون فرانس اور امریکہ سے بہت گرا ہوا ہے ۱۸۵۷ء میں ایک قانون پاس ہوا تھا جس میں زن و مرد کو برابر کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ یعنی عورت اگر غیر وفادار ثابت ہو تو شوہر طلاق حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن اگر شوہر اسی جرم کا مرتکب ہو تو بیوی طلاق حاصل نہ کر سکتی تھی عورت اسی صورت میں طلاق حاصل کر سکتی تھی کہ شوہر اس پر ظلم و ستم کرے یا اسے چھوڑ کر بھاگ جاوے۔ ابتدا میں لفظ ظلم و ستم کا مفہوم محض سنگدلانہ تک محدود تھا لیکن بعد میں اسے وسعت دے دی گئی یعنی اب اس میں ایسی بھی باتیں شامل ہیں جن سے بیوی کی طبیعت کو رنج

## ۳۲

یا صدمہ پہونچے۔ علاوہ ازیں شوہر کی سرد مہری اور غفلت بھی "ظلم" میں داخل سمجھی جاتی ہے۔

**امریکہ میں** امریکہ میں خواہ مدعی خاوند ہو یا بیوی، بدسلوکی کا عذر فسخ نکاح کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے مگر تعریف یہ ہے کہ جن باتوں کو "بدسلوکی یا افعال خلاف انسانیت" کہا جاتا ہے وہ نہایت ہی معمولی باتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر بیوی شوہر کے کوٹ یا کسی اور کپڑے میں بٹن نہ ٹانکے تو یہ بھی بدسلوکی سمجھی جائے گی یا میاں اگر اپنے پاؤں کے ناخن نہ تراشے تو اس فعل کو بھی خلاف انسانیت سمجھا جائے گا اور طلاق ہو جائے گی۔ ایک بار کسی عورت نے دعوی کیا کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے اس وقت سے اب تک میرا شوہر کبھی گاڑی میں بٹھا کر سیر کو نہیں لے گیا چنانچہ اس کا یہ فعل خلاف انسانیت قرار دیا گیا اور طلاق کی ڈگری دیدی گئی۔

**دیگر ممالک** سوئٹزرلینڈ میں اگر میاں بیوی کے درمیان ناموافقت ہو جائے تو دو سال کے لئے طلاق حاصل کی جا سکتی ہے۔ ناروے میں بھی قانون طلاق بہت آسان ہے۔ رومانیہ میں باہمی رضامندی کے ساتھ علیحدگی ہو سکتی ہے بشرطیکہ ماں باپ اپنے مال میں سے بقدر نصف بچوں کو دیدیں۔

۳۳

# مذہبی فحاشیاں

**ہیروڈوٹس کے چند بیانات** بہ ظاہر یہ عنوان نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگا کیونکہ "مذہب" جس کا مقصود ہی یہ ہے کہ دنیا سے "فحاشی" کو فنا کر دے وہ کیونکر اس کا معاون ہو سکتا ہے، لیکن اگر آپ مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ سوائے چند الہامی و آسمانی مذاہب کے دنیا کے تمام مذاہب نے نہ صرف فحاشی کو گوارا کیا بلکہ اس کے رواج و اشاعت میں سبب اولین کی حیثیت اختیار کی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پہلے چند بیانات ہیروڈوٹس (مشہور مورخ) کے سُن لیجئے

جب ہیروڈوٹس لیڈیا (Lydia) کی سیاحت کرنے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں شاہ الیاتیس (Alyattes) کا شاندار مقبرہ شہر سارڈیس (Sardis) کے مختلف سوداگروں اور پیشہ ور لوگوں کے چندہ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ مورخ مذکور لکھتا ہے کہ اس شاہی مقبرہ کی چوٹی پر پانچ سنگی مینار میرے زمانہ (یعنی پانچویں صدی قبل مسیح) تک قائم تھے اور ان میناروں پر جو عبارتیں کندہ تھیں ان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مختلف طبقہ کے لوگوں نے اس کی تعمیر میں کس قدر روپیہ ادا کیا۔ چنانچہ اس تعمیر میں سب سے بڑا حصہ پیشہ ور عورتوں نے لیا تھا۔ لیڈیا میں عام لوگوں کی لڑکیاں سب کی سب پیشہ ور ہیں۔ اور اپنے جہیز کے لئے روپیہ اسی طرح جمع کرتی ہیں۔

## ۳۴

عہد قدیم میں فحاشی کے خیال کو معیوب سمجھا جانا کیونکر رفتہ رفتہ کم ہوا؟

اس کے متعلق ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ :- اول اول مصریوں میں اس کو بہت معیوب جانتے تھے کہ وہ مقدس مقامات میں عورتوں سے بات چیت کریں۔ چنانچہ عورت سے بات کرنے کے بعد جب تک وہ غسل نہ کر لیتے تھے اس وقت تک وہ مندر میں ہرگز داخل نہ ہوتے تھے۔ لیکن مصریوں اور یونانیوں کے علاوہ دنیا کی تقریباً تمام قومیں اس بارہ میں دوسرے نظریہ کی پابند تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جب مندروں اور دیگر مقدس مکانوں میں مختلف قسم کے جانور یا ہمدگر ملتفت ہوتے ہیں اور دیوتا اس کو گوارہ کر لیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ چڑیوں اور جانوروں کی طرح عورتوں اور مردوں کا اختلاط گوارا نہ ہو۔ چنانچہ یہ عمل رفتہ رفتہ مذہبی ادارہ میں داخل ہو گیا

ہم اس جگہ مورخ ہیروڈوٹس کی ایک اور عبارت نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

"بابل والوں میں ایک نہایت ہی شرمناک رواج یہ ہے کہ ہر عورت جو اس ملک میں پیدا ہو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ آفرودیتہ (Aphrodite) دیوی کے مندر میں جا کر بیٹھے اور آزاد انہ مردوں سے ملے چنانچہ اس مندر میں عورتوں کی بہت بڑی تعداد ایسی نظر آتی ہے جو اپنے چوٹیوں میں پھول گوندھے ہوئے بیٹھی رہتی ہیں غیر مرد ان کو دیکھتے ہوئے سامنے سے گذرتے رہتے ہیں اور جس پر نظر انتخاب پڑتی ہے ٹھہر جاتے ہیں کوئی عورت جو ایک مرتبہ بیٹھ جاتی ہے پھر اسے اس وقت تک اٹھ کر جانے کی

## ۳۵

اجازت نہیں ہوتی جب تک کوئی غیر محرم مرد اس کی گود میں چاندی کا کوئی سکہ نہ پھینکدے۔ جب مرد چاندی کا سکہ گود میں ڈالتا ہے تو وہ اپنے منھ سے یہ الفاظ کہتا ہے کہ "ملیتا [illegible] دیوی تیرا بھلا کرے" اور عورت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ نقرئی سکہ کتنا بڑا ہے۔ لیکن جب وہ گود میں پھینکدیا جاتا ہے تو اس کے لینے سے انکار کرنا قانوناً جرم ہے کیونکہ وہ سکہ متبرک ہو جاتا ہے۔ جو عورتیں حسین ہوتی ہیں وہ تو بہت جلد مخلصی حاصل کر لیتی ہیں لیکن جو بدصورت ہوتی ہیں ان کو زیادہ وقت و زمانہ صرف کرنا پڑتا ہے اور تین تین چار چار دن تک پڑی رہتی ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی ایک رسم جزیرہ قبرص کے بعض مقامات میں بھی پائی جاتی ہے۔"

قدیم زمانہ کے دیوتاؤں میں کمتر ایسے ہیں جن کو خواہش نفسانی سے مبرا کہا جا سکے۔ اسی لئے بہت سے مذہبی تہوار حد درجہ بدمستیوں کے ساتھ منائے جاتے تھے چنانچہ یونانیوں کے دیوتا دیونسوس Dionysus اور اہل روما کے دیوتا باخوس Bachus اس باب میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

بائبل کی بہت سی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک فلسطین کے غیر عبرانی باشندے مذہب کی آڑ میں کافی داد بدمستی دیا کرتے تھے اور یرمیاہ اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل نے ان رسموں پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ ہیروڈوٹس کے نزدیک زن و مرد کے تعلقات ناپاک سمجھے جاتے تھے۔ بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم یونان میں "مذہبی فحاشی" بکثرت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ابتدائے اپریل وسٹی میں فلوریلیا Floralia دیوی کے نام سے جو میلہ آٹھ روز تک ہوا کرتا تھا، اس کا مقصود ہی عیش پرستی تھا

اور اس موقعہ پر رومی کسبیاں سب کے سامنے برہنہ ہو کر نہایت ہیجان انگیز ناچ ناچا کرتی تھیں۔ رہا یہ امر کہ "فحاشی" ادارۂ مذہبی میں کس طرح داخل ہوئی۔ سو اس کا بیان ذرا تفصیل کا محتاج ہے:۔

**مذہب میں رواج فحاشی کے اسباب** انسان کی ارتقائی حالتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عہد تمدن سے قبل انسان تین حالتوں سے گذر چکا ہے، سب سے پہلی وہ جب صرف شکار پر اس کی زندگی کا انحصار تھا، دوسری وہ جب اس نے چوپانی اختیار کی اور تیسری فلاحت و زراعت اولین دور میں جب صرف شکار اُس کا مشغلہ تھا، افزایش نسل کا مسئلہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جس قدر کم شکاری ہوں گے اسی قدر شکار زیادہ ملے گا۔ اور اسی لئے تعلق جنسی کی کوئی اہمیت اس کے نزدیک نہ تھی لیکن بعد کو جب اس نے دیکھا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی کئی دن شکار نہیں ملتا تو اس نے جانوروں کے بچے پکڑ کر پالنا شروع کئے اور اس طرح وہ بتدریج چوپانی حالت میں آگیا۔ پھر چونکہ چوپانی حالت میں مویشیوں کی نگہداشت اور اُن کو ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ تک لے جانے کی ضرورت پڑتی تھی اس لئے اُسے اپنا خاندان بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور سب سے پہلے تعلق جنسی کی اہمیت اس پر واضح ہوئی۔ جب انسان چوپانی حالت سے گذر کر زراعت کی طرف متوجہ ہوا تو اُسے اور زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی اور اس نے محسوس کیا کہ جب تک خاندان میں بہت سے آدمی نہ ہوں اس وقت تک چوپانی اور کسانی کے کام اچھی طرح نہیں چل سکتے اسلئے

انسان نے افزائش نسل کی طرف پوری توجہ کی اور اس کو ایک مذہبی فریضہ کی صورت دیدی کیونکہ دینوی باتوں کے مقابلہ میں انسان پر مذہبی باتوں کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اور اس طرح بچے پیدا کرنا اور تعلقات جنسی کو وسیع کرنا گویا ہر مرد کا فرض قرار پایا اور اسی کے ساتھ تعدد ازدواج یا ایک ہی وقت میں متعدد بیویاں رکھنے کا رواج پیدا ہوا اس امر کا ثبوت کہ جب تک انسان شکاری حالت میں رہا اس کے مذہب میں سوائے پرستش ارواح کے اعضاء جنسی کی پرستش کا کوئی خیال پیدا نہ ہوا تھا، ان اقوام کے مطالعہ سے مل سکتا ہے جو ہنوز ابتدائی شکاری حالت میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا کی بعض قوموں، ردواہ یا ہگان، اور ٹھانی، کو دیکھئے کہ وہ ابھی تک بالکل عہد عتیق کی شکاری حالت میں ہیں۔ اور فحاشی کا کوئی شائبہ ان کے مراسم مذہبی میں نظر نہیں آتا کیونکہ ان کا مذہب صرف روح کی پرستش ہے۔

یہ لوگ تعلقات جنسی کے مسئلہ میں اس قدر ناواقف ہیں کہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اولاد کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو عورت کے پیٹ میں کوئی روح داخل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب یورپین قومیں آسٹریلیا میں داخل ہوئیں اور انھوں نے ان لوگوں کو بچہ پیدا ہونے کا اصلی سبب بتایا تو وہ لوگ بہت حیران ہوئے۔

الغرض یہ امر تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ جب تک انسان اپنے ابتدائی "دور صید و شکار" میں رہا تعلق جنسی کی طرف سے وہ بہت بے پرواہ تھا لیکن جب اس نے چوپانی اور فلاحی شروع کی تو سب سے پہلے اس نے جس چیز کی

طرف توجہ کی وہ ارتباط زن و مرد تھا اور اس لئے اس دور کے تمام مذاہب میں آپ کو مذہبی فحاشی کثرت سے ملیں گے۔

**افریقہ میں مذہبی فحاشی کے آثار** | سر آر۔ برٹن (Sir R. Burton) سرزمین داہومی (Dahomi) کی نسبت تحریر کرتے ہیں کہ وہاں سے لے کر دارالحکومت تک کوئی راستہ ایسا نہیں ہے جہاں اعضاء جنسی کی علامات موجود نہ ہوں اور ان کے سنگین بُت نظر نہ آئیں۔ عام طور پر صرف اعضاء جنسی ہی پتھروں کی صورت میں نظر آتے ہیں لیکن کبھی کبھی کسی مشہور دیوتا کے عریاں بُت میں اسے دکھاتے ہیں ان کا سب سے بڑا دیوتا لگبا ہے جو جذبات شہوانی سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کسی شخص کو احتلام ہوتا ہے۔ تو وہ اسی دیوتا سے منسوب کرتا ہے اور صبح ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی پوجا کرتا ہے اور نذر چڑھاتا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ رات کو خواب میں کسی کا بصورت مرد یا عورت دکھائی دینا گویا خود لگبا دیوتا کا نظر آنا ہے۔ اس دیوتا کا بت سُرخ مٹی کا اس طرح بنایا جاتا ہے گویا وہ اکڑوں بیٹھا ہوا اپنے آپ کو برہنہ دیکھ رہا ہے اس قسم کے بت تقریباً ہر مکان کے سامنے ایک چھوٹے سے چھپر یا سائبان کے نیچے بنائے جاتے ہیں۔

بعض سوڈانی قبائل میں عشق و محبت کی دیوی بھی ہوتی ہے جو عموماً ایک حاملہ عورت کی صورت میں بنائی جاتی ہے۔ اور اس کا سینہ بہت طویل اور عضو جنسی بہت بڑا بنایا جاتا ہے۔ الغرض ان ممالک میں اعضاء جنسی کی پرستش وسیع پیمانہ پر موجود ہے۔

## ۳۹

ایک سوڈانی قوم ہے جس کا نام پورد باہے، ان کے یہاں اس دیوی کا بت اس طرح بنایا جاتا ہے گویا ایک عورت بیٹھی ہوئی اپنے بچہ کو گود میں لئے دودھ پلا رہی ہے۔ اس دیوی کے ساتھ ایک دیوتا بھی ہوتا ہے اور مندر کی دیواروں پر دونوں کے اعضار جینی بحالت اتصال دکھائے جاتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کا کام یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ زن و مرد دونوں کے دلوں میں عشق و محبت پیدا کرتے ہیں، بانجھ عورتوں کو بارآور کرتے ہیں اور وضع حمل کے وقت تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ بعض مندروں میں جہاں اس قسم کی پوجا ہوتی ہے، عورتیں بھی ہوتی ہیں، جو خاص تہواروں اور میلوں کے وقت بالکل آزاد ہوتی ہیں اور ان صورتوں میں جو اولاد پیدا ہوتی ہیں انھیں مذہبی حیثیت دیجاتی ہے۔

مغربی افریقہ کے اس حصہ میں جسے "Slave Coast" یا ساحل غلامان) کہتے ہیں افریقی لوگ مردانہ عضو جینی کا نہایت شان و تجمل کے ساتھ بازاروں میں جلوس نکالتے ہیں۔ اور اگر اتفاق سے کوئی نوجوان لڑکی نظر آجاتی ہے تو اس کے جسم سے مس کرکے بہت عریاں مذاق کرتے ہیں۔

سر ہینری جانسٹن نے وادی دریائے کانگو کے لوگوں کا حال بیان کیا ہے کہ وہ اپنے لکڑی کے مندروں میں بہت سے زنانہ اور مردانہ بُت ایسے رکھتے ہیں جن کے اعضار جینی بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ان بتوں پر بصینت چڑھا کر ان کی پوجا کی جاتی ہے۔ بعض اوقات ان لوگوں کے گھروں میں بھی یہ نشان چھتوں میں لٹکتا ہوا اور ہلتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ ایک اور یورپین سیاح نے وادی کانگو

کی بانیزی قوم کا حال لکھا ہے کہ یہ لوگ مٹی سے اس قسم کے عضو بناتے ہیں۔ اور ان کو چڑیوں کے پروں سے آراستہ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ زنانہ عضو بھی بناتے اور ان دونوں کی پوجا کرتے ہیں۔ اُن پر مرغوں کی بھینٹ بھی چڑھائی جاتی ہے کیونکہ مرغ بہت قوی خواہش کا جانور سمجھا جاتا ہے۔

ایک فرانسیسی فوجی افسر نے حال بیان کیا ہے کہ اس نے وادی کانگو میں ایک خاص تہوار دیکھا جس میں عضو تناسلی کی خاص نمائش کیجاتی ہے اور تہوار میں ایک خاص تماشہ بھی کیا جاتا ہے جس میں ایک بڑا برہنہ بت بنایا جاتا ہے اور اس کے عضو کو کمانیوں کے ذریعہ سے حرکت دیجاتی ہے بعض مندروں میں ایسے دیوتاؤں کے پجاری مخنث ہوتے ہیں۔

ناگجریا کی قوم ایکوئی میں ایجانا نامی ایک دیوتا ہے جس کا تہوار بالکل لگبا کی طرح منایا جاتا ہے ان لوگوں کا عام عقیدہ ہے کہ اس قسم کی بدمستیوں سے دیوتا خوش ہوتے ہیں اور فصلیں بھی اچھی پیدا ہوتی ہیں کسی زمانہ میں یہ لوگ ہر سال ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی کی قربانی کیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے یورپین اقوام کا اثر ہوا ہے بجائے عورت کے مرغ کی قربانی ہونے لگی ہے۔

**یوروپ میں مذہبی فحاشی کے آثار** | یورپ کے غاروں سے جو زمانہ قبل تاریخ کے بہت سے نقوش برآمد ہوئے ہیں اُن میں ننگی تصویریں بھی ہیں، جو سینگ یا ہڈی پر کسی چقماقی آلہ کی باریک نوک سے بنائی گئی ہیں۔ عورتوں کے بھی چھوٹے چھوٹے مجسمے ہیں۔ جو عموماً بحالت نشست بنائی گئی ہیں۔ ان کی وضع قطع افریقی ہے اور یہ قصادیر وادی کانگو کے بتوں سے ملتی جاتی ہیں

ان مردانہ تصاویر اور نسائی مجسموں کے اعضاء تولید بہت بڑے بنائے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم یورپ میں بھی اس قسم کی پرستش کا رواج پایا جاتا تھا۔

الغرض تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کی پوجا کا عقیدہ تمدن کے اس درجہ میں پیدا ہوتا ہے جو آسٹریلوی اور افریقی درجوں کے درمیان ہے انسان دیکھتا ہے کہ اس کی "روح" کس طرح اس کے جسم کو اپنا آلۂ کار بناتی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جب اس کا سایہ جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو گویا اس کی روح عالم ارواح کو چلی جاتی ہے۔ اس طرح گویا وہ جملہ حوادث و مناظر قدرت کی تشریح و توجیہ ارواح کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ وہ خورشید و قمر، رعد و باراں وغیرہ سب کے لئے ایک ایک روح یا موکل مقرر کر دیتا ہے۔ لیکن کوئی روح خلاق عرصۂ دراز تک اس کے ذہن میں نہ آئی تھی۔ جب کبھی کوئی بچہ پیدا ہوتا اور وہ اس واقعہ کی نسبت خیال آرائی کرتا تو سمجھتا کہ کسی انسان یا حیوان کی روح جسد خاکی سے علیحدہ ہو کر عورت کے اندر حلول کر گئی ہے جو از سر نو متشکل ہو کر معہ جسم خاکی کے پیدا ہوئی ہے۔ وہ بالکل ناواقف تھا کہ عورت سے بچہ پیدا ہونے میں مرد کا بھی کوئی حصہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں منازل ارتقاء کی ان پست حالتوں میں انسان زراعت نہیں کرتا تھا نہ مویشی پالتا تھا۔ اس کی تمام ضروریں قدرت خود بخود پیدا کر دیتی تھی اور سامان خورد و نوش کی کسی وحشی انسان کو قطعی فکر نہیں تھی علاوہ اس کے ایک بات یہ بھی تھی کہ چونکہ دنیا کی تمام پست قومیں گرم ممالک میں پائی

جاتی ہیں۔ جہاں موسموں کا تغیر و تبدل چنداں نمایاں نہیں ہوتا، لہذا اس کے لئے فصل بہار جبکہ تمام عالم میں نیا جوش پیدا ہوتا ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ تیسرے یہ کہ ارتقا کی اس پست حالت میں نباہی جنگ و جدال پایا جاتا ہے نہ کوئی قبائلی تنظیم ہوتی ہے اس لئے انسان اول عادتاً غیر جنگجو تھا اور اُسے زیادہ اولاد کی تمنا نہیں تھی۔

اس کے بعد جب انسان شکاری حالت سے گذر کر چوپانی یا کسانی حالت میں پہونچا تو اسے زیادہ آدمیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ گھر بار اور مویشیوں کی دیکھ بھال ہر چند عورتیں کر لیتی تھیں لیکن شکار زراعت اور لڑائی کے لئے مردوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ مردوں کو تمنا ہوئی کہ بچے زیادہ پیدا ہوں اور عورت کا بانجھ پن لعنت سمجھا جانے لگا۔ افزائش نسل کے دیوتاؤں کی پوجا اور ان کو خوش کرنے کے لئے مختلف قسم کی رسمیں ادا کرنا پڑیں کیونکہ قوم کا سردار تو جنگ کے لئے مرد چاہتا تھا اور مرد پیدا کرنے کے لئے عورتیں درکار تھیں اور یہیں سے اعضا جنسی کی پوجا کا آغاز ہوتا ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے دنیا میں مباشرت کو مذہبی حیثیت دی گئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

**مباشرت کی مذہبی حیثیت** | پست اور جاہل اقوام کے نزدیک بہشت نام ہے کثرت ازدواج، کثرت اولاد، فراوانی کاشت کا، پھر جب پیٹ بھر جاتا ہے تو انسان دوسری طرف راغب ہوتا ہے اور دوسری طرف راغب ہونیکا نتیجہ اولاد ہے اور اولاد پیدا ہوتی ہے اعضا جنسی کے اتصال باہمی سے لیکن چونکہ بعض اوقات سالہا سال گذر جاتے تھے اور اولاد پیدا نہیں ہوتی تھی اسلئے

۴۳

ان دیوتاؤں کو خوش کرنے کی ضرورت پڑی جن کا تعلق افزایش نسل سے تھا اور اس طرح اعضاے جنسی کی پوجا شروع ہوئی۔

جن ممالک میں مغل نسل کی اقوام آباد ہیں وہاں تو اس قسم کی پرستش کا پتہ نہیں ملتا، لیکن جاپان میں بیشک کسی زمانہ میں اس کا رواج تھا چنانچہ انیسویں صدی میں جب جاپان کے دروازے دیگر اقوام کے لئے کھل گئے تو امریکن سیاح یہ بات دیکھکر سخت حیران ہوے کہ وہاں کھلم کھلا اعضاے جنسی کی نمائش و پرستش ہوتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مذہب شنتو کے پرانے مندروں میں تو دیوتاؤں کے بُت ایسے بناے جاتے تھے جن میں مردانہ اعضاے جنسی پوری آمادگی کی حالت میں دکھاے جاتے تھے۔

ہندوستان کے جنوب اور جنوب مشرق میں جو جزائر ہیں اُن میں بھی یہ پوجا عام ہے۔ مثلاً مجمع الجزائر بار بار میں سورج کا انسانی بت معہ عضو جنسی کے بنایا جاتا ہے اور جب اس کا میلہ ہوتا ہے تو پورے عیش و نشاط سے کام لیا جاتا ہے۔ ماورائے سماترا، جزائر نیاس کے باشندے اپنے مرے ہوے اعزہ کی تصویریں اپنے مکانوں کی دیواروں پر کھینچتے ہیں جو بالکل برہنہ ہوتی ہیں اور تصویروں کی پوجا کرکے وہ افزایش نسل کی التجا کرتے ہیں۔

جزیرۂ نیوگنی کی بعض قوموں میں یہ دستور ہے کہ تمام لڑکے اور بن بیاہے نوجوان، مخصوص مکانات میں سوتے ہیں جو اسی کام کے لئے علحدہ کردیے جاتے ہیں۔ اور جن کی دیواروں پر ننگی تصویریں مختلف آسنوں کے بہ حالت اتصال منقوش ہوتی ہیں۔ بظاہر تو یہ رواج بہت اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس طرح

۴۴

گویا اُنہیں تجرد کی زندگی کا درس دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں وہ غیر فطری ذرائع سے اپنی خواہشیں پوری کرنے پر مجبور رہتے ہیں۔

جزیرۂ سیلی بیز میں بھی اسی قسم کی پوجا بہت ہوتی تھی۔ یہاں عورتوں کے ایسے بُت بنائے جاتے تھے جن کے عضو جنسی کے ظاہر کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیا جاتا تھا۔ مندروں کی دیواروں پر جو پتھر کے مردانہ بت بنائے جاتے تھے وہ بالکل عریاں ہوتے تھے۔ بعض مندروں میں مرد بحالت اتصال دکھائے جاتے تھے۔ اس جزیرہ کے جنوبی علاقہ میں ایک خاص دیوتا افزایش نسل کا کارنیگ آلو دہ ہے جو بالکل عریاں بنایا جاتا ہے اور اس کے مندر میں نوجوان عورتوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہتی ہے بعض مندروں میں اس کے طلائی بت بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی جزیرہ میں بعض قبائل ایسے بھی ہیں جو ایک خاص دیوتا کی پرستش کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں اس دیوتا کا بت سات فٹ بلند اور بالکل عریاں بنایا جاتا تھا جس کی پوجا نہایت فخر کے ساتھ کی جاتی تھی جب دلندیزیوں نے مداخلت کی تو یہ بُت چھپا دیا گیا اور لوگ برسوں تک اس کی پوجا پوشیدہ طور پر کرتے رہے

جزیرۂ جاوا میں اس قسم کی پوجا بکثرت ہوتی ہے۔ وہاں کے بعض حصوں میں یہ عام رواج ہے کہ جب دھان کے پودوں میں بالیں نکلنے کو ہوتی ہیں تو کھیت کا مالک اور اس کی بیوی دونوں ننگے ہو کر کھیت کا طواف کرتے ہیں اور اسی کھیت میں ایک دوسرے سے ملتفت ہوتے ہیں۔ قدیم یورپ میں بھی عمدہ فصل پیدا کرنے کے لئے اس طریق عمل پر کاربند ہونا پڑتا تھا۔ ایک سیاح نے اہل جاوا

کی اس پرستش کا عجیب و غریب حال تحریر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ دلندیزیوں کی ایک توپ جنگل میں رہ گئی۔ عوام میں یہ خیال پھیل گیا کہ یہ توپ یوروپ کے کسی بُت کا "عضو مخصوص" ہے اس خیال کے پھیلتے ہی مقامی پجاریوں نے چاروں طرف پروپیگنڈا کر کے عوام کو اس توپ کی پوجا کرنے کی ترغیب دی اور لوگ دور دور سے آکر اس پر چاول اور پھول چڑھانے لگے خصوصاً بانجھ عورتوں کا تو ہر وقت تانتا لگا رہتا تھا۔ یہ عورتیں زرق برق لباس پہن کر آتیں اور توپ پر گھوڑے کی طرح بیٹھ جاتیں۔ بعض اوقات دو دو عورتیں ایک ہی وقت میں ایسا کرتیں بالآخر عیسائیوں نے حکومت کو مجبور کیا کہ اس "توپ دیوتا" کو وہاں سے اُٹھا لیا جاوے۔

برہما کے بالائی حصہ میں بھی رواج ہے کہ ہر سال فصل بہار کے وقت لوگ ایک بُت کا جلوس نکالتے ہیں جس کا عضو جنسی بہت نمایاں ہوتا ہے اور جلوس والے بہت فحش قسم کا مذاق کرتے ہوئے اور گالیاں گاتے ہوئے ساتھ چلتے ہیں۔

مسٹر جوزف میک کیب جو ایک مشہور امریکن مصنف سیاح ہیں لکھتے ہیں کہ یوکاٹان کے شمالی حصہ میں یوکسل کے مشہور کھنڈر واقع ہیں۔ چند ماہ گذرے میں ان خرابوں کی سیر کرنے گیا۔ جس وقت جنگل سے نکل کر صاف جگہ میں پہونچا تو وہاں ایک چھوٹا سا بلند ٹیلہ دیکھا جہاں کسی زمانہ میں مندر بنا ہوا تھا۔ اس کے دامن میں جہاں خوبصورت اور عالیشان عمارتوں کا خرابہ ہے میں نے دو پتھر دیکھے جو چار یا پانچ فٹ لمبے تھے۔ یہ بلحاظ شکل و شباہت نہایت مکمل مردانہ عضو

تھے۔ کسی زمانہ میں یہ دونوں مندر کے دروازہ پر دونوں جانب نصب تھے۔ اور یہ مندر ——— ایک نہایت عظیم الشان اور متمدن شہر کے وسط میں واقع تھا گویا اس وقت یہاں بھی اس قسم کی پوجا ہوتی تھی۔

امریکہ بھر میں جہاں جہاں اقوام مایا و پیرو کا تمدن پایا جاتا تھا وہاں کے مندروں کی خصوصیت انھیں اعضا کی پرستش تھی جن کے نشانات کثرت سے پرانے کھنڈروں میں اب بھی ملتے ہیں۔

امریکہ کی "مندان" قوم میں ایک سالانہ تہوار ہوتا تھا۔ جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک مضحکہ انگیز بت کا جلوس نکالتے تھے جو بالکل عریاں ہوتا تھا اور ایک چوبی عضو رکھتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بت کی جگہ ایک مردے لیتا تھا اور عورتوں کے پیچھے دوڑتا تھا۔ جب اس کے ہاتھ نہیں آتی تھیں تو وہ خوبصورت لڑکوں کی طرف راغب ہوتا تھا جب وہ یہ حرکت کرتا تھا تو عورتیں اس کا پیچھا کرتی تھیں۔ اور اس کا چوبین عضو ایک عورت توڑ لیتی تھی اور اُسے ہاتھ میں لیکر ایک تقریر کرتی تھی اور کہتی تھی کہ "وہ آج کے بعد سے حقیقی زندگی کی مالک ہے"

قدیم ملک مصر میں بھی یہ پوجا نہایت شد و مد سے جاری تھی چنانچہ وہاں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "سیت" نے جو خداوند شر تھا اپنے بھائی "اوسیرز" خداوند خیر کو قتل کر کے اس کی لاش کے مختلف ٹکڑے مختلف مقامات میں علیحدہ علیحدہ دبا دیے "اوسیرز" کی بہن اور بیوی آئسیس نے نہایت جانفشانی سے تلاش کر کے ٹکڑے نکال لئے لیکن عرصہ دراز تک باوجود تلاش بسیار عضو جنسی نہ ملا۔ مجبور ہو کر

لکڑی کا ایک عضو بنا کر لاش کے ساتھ دفن کیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ خصوصیت کے ساتھ مصری عورتوں میں اس پوجا کا بیحد رواج ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ تمام مصر اور افریقہ میں یہ رسم اس طرح پھیل گئی کہ مصر کے پجاریوں کو بھی یہ فحش رسم اپنے مذہب میں داخل کرنا پڑی۔ مشہور یونانی مورخ و سیاح ہیرو ڈوٹس نے لکھا ہے کہ وہاں اوسیرز کا سالانہ تہوار نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ عورتیں باجے گاجے کے ساتھ اوسیرز کا بت لیکر نکلتی تھیں۔ بت کا قد دو فٹ کے قریب ہوتا تھا۔ اس کے عضو جینی میں ڈورے بندھے ہوتے تھے۔ جن کو کھینچنے سے اس میں عمودی جنبش پیدا ہوتی تھی۔ قدیم مصریوں میں اس پرستش کے عام ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک عالی مرتبہ مصری خاتون کی حنوط شدہ لاش کے ساتھ ایک سانڈ بیل کا حنوط شدہ عضو بھی برآمد ہوا تھا۔

مسٹر بانے بیان کرتے ہیں کہ جنوبی اطالیہ کے شہر پائسٹم میں جہاں یونانیوں کا اثر تھا۔ آئسین کے مندر سے چار ہزار پتھر کے ٹکڑے مردانہ عضو کی شکل کے برآمد ہوئے تھے۔ ہندوؤں میں پرستارانِ شیو اب بھی "لنگ پوجا" کے لئے خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔

**مذہبی فحاشیوں کی عجیب و غریب صورتیں** بیان ماسبق سے غالباً یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ اعضاء جینی کی پرستش کہاں کہاں اور کس کس طرح پائی جاتی تھی اور اب بھی پائی جاتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک پہلو بحث کا یہ رہ جاتا ہے کہ اس طریق پرستش کا اثر عام اخلاق انسانی پر کیا ہوا اور اس سلسلہ میں عبادتگاہوں کے اندر کس کس طرح داد عیش و کامرانی

دی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اول اول اکثر قبائل میں یہی دستور تھا کہ شادی بیاہ اپنے ہی عائلہ و قبیلہ کے افراد میں کرتے تھے۔ نہ کسی غیر قوم کی بیٹی لیتے تھے نہ اپنی بیٹی دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اولاد کمزور پیدا ہونے لگی اسی اثنار میں لوگوں نے دیکھا کہ اگر لڑکی کی شادی کسی غیر خاندان والے سے ہو جاتی ہے تو اولاد جسمانی و دماغی لحاظ سے ترقی یافتہ پیدا ہوتی ہے۔ پس بقاء قوم اور تقویت نسل کے خیال سے لوگوں کو غیر اقوام کے ساتھ وابستگی کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن چونکہ اس میں ایک قسم کی سبکی اور اخلاقی برائی تھی، اس لئے قوم کے بزرگوں اور مقتدایان دین نے بین الاقوامی طریقۂ ازدواج جاری کرکے جھگڑے پیدا کرنا تو مناسب نہ سمجھا لیکن ہر عورت کے لئے مذہبی فرض قرار دیدیا کہ وہ عمر بھر میں کم از کم ایک مرتبہ کسی اجنبی کو ملتفت ہونے کا موقعہ دے، پھر چونکہ اس کا تعلق مذہب سے قرار دیا گیا تھا اس لئے عبادت گاہوں کو ہی اس کا مرکز قرار دیا گیا اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ کسی دیوی کا مندر تاکہ عورتیں جلد اس طرف مایل ہو سکیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سینجر نے لکھا ہے کہ:-

"کلدانیہ میں کسی وقت ہر بابلی عورت کا قانونی فرض تھا کہ وہ عمر میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور مایلتا دیوی کے مندر میں جاکر آزاد ہو جائے۔ ہیروڈوٹس نے دوران سیاحت میں وہ معبد، میدان اور باغ دیکھا تھا جہاں اس قسم کی آزادی سے کام لیا جاتا تھا۔ یہ مقامات ہر وقت ایسی عورتوں سے بھرے رہتے تھے جن کے سر کے بالوں میں ڈوری بندھی ہوتی تھی۔ یہ گویا علامت تھی

۴۹

اس امر کی کہ ایسی عورت آزاد ہے) جب کوئی عورت اس مقررہ مقام میں داخل ہو جاتی تھی تو جب تک وہ اپنا فرض ادا نہ کر لیتی تھی اُسے باہر جانے کی ہرگز اجازت نہ تھی اور اس سلسلہ میں جو رقم وہ وصول کرتی تھی اُسے دیوی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ بعض عورتیں جو بدصورت ہوتی تھیں انھیں کوئی خریدار نہ ملنے کے باعث تین تین سال تک مندر کے احاطہ میں پڑا رہنا پڑتا تھا، اور جو عورت نوجوان، خاندانی اور خوبصورت ہوتی تھی اُس کو چند منٹ سے زیادہ انتظار کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی، اسی عجیب و غریب رسم کا حال یا، وخ نبی نے بھی بیان کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اس وقت اس کا رواج اس قدر بڑھ گیا تھا کہ روز کی گفتگو میں جب کوئی عورت اپنی ہمسائی کو طعن دیتی تو کہتی تھی کہ تو اس قابل نہ تھی کہ "تیرے گھر بند پر ہاتھ ڈالا جاتا" اسی قسم کا حال یونانی مورخ و سیاح استرابو (Strabo) نے بھی لکھا ہے۔ اور دیگر مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکندر اعظم کے زمانہ میں اس قسم کی فحاشی انتہا کو پہونچ گئی تھی"۔

کلدانیہ میں جس دیوی کا نام مائلتا تھا وہی دیوی فنیقہ، شام و قرطاجنہ میں استار کہلاتی تھی، یعنی صرف نام کا فرق تھا ورنہ ہر جگہ یہی تمام باتیں پائی جاتی تھیں۔ اور یہی فواحش ہر جگہ نظر آتے تھے۔

اسی قسم کی باتیں لیجیون۔ اور ان کے جانشین قدیم ایرانیوں میں بھی جاری تھیں۔ ان کے ہاں عشق و محبت کی دیوی کا نام متر اتھا۔ اس دیوی کے تہواروں میں بیحد فحش ہوتا تھا۔

بابل میں جو معبد اسکے لئے مخصوص تھا اسے "بیت نجات" (Bit-Shagatha)

۵۰

یعنی "مقام وصل" کہتے تھے۔ بابل کے متعلق دیودورس سیقولس نے لکھا ہے کہ "ملک کی ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ تمام عمر میں کم از کم ایک مرتبہ دیوی کے معبد میں جائے اور کسی اجنبی سے مواصلت چاہے۔ بہت سی عورتیں جو دولت مند اور عالی خاندان ہوتی ہیں وہ پردہ کی گاڑیوں میں بیٹھ کر آتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر عورتیں یہ کرتی ہیں، کہ سر کے بالوں پر چاروں طرف قلادہ سا باندھ کر بیٹھ جاتی ہیں اور اس طرح کی عورتیں کثرت سے آتی جاتی رہتی ہیں۔ میدان میں ہر طرف سیدھے راستے بنا دیے جاتے ہیں۔ جہاں عورتیں موجود رہتی ہیں۔ اجنبی مرد انہی راستوں سے گذرتے ہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ جو عورت ایک مرتبہ معبد میں جا بیٹھتی ہے وہ اس وقت تک وہاں سے نہیں جا سکتی جب تک وہ اپنے مقصد کو نہ حاصل کرے یعنی جب تک مردوں کی گود میں سکہ ڈال کر ان سے ملتفت نہ ہوئے۔ جو مرد کسی عورت کی گود میں سکہ ڈالتا ہے اسے یہ الفاظ کہنے پڑتے ہیں:۔ "تیری دعا ہے کہ مائلتا دیوی تجھ پر اپنا فضل و کرم کرے" (یہ دیوی دیبی ہے جسے یونانیوں میں وینس کہتے ہیں) سکہ جو عورت کی گود میں ڈالا جاتا ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو لیکن وہ عورت اس کے لینے سے انکار نہیں کر سکتی۔ الغرض سکہ لینے اور دیوی پر چڑھانے کے بعد وہ عورت اپنے خریدار کے ساتھ مندر سے باہر چلی جاتی ہے۔ جو عورت جمیل اور متناسب الاعضاء ہوتی ہے اس کا خریدار بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جو بدصورت ہوتی ہے اسے بعض اوقات برسوں تک مندر ہی میں پڑا رہنا پڑتا ہے۔"

اول اول مصر میں اس قسم کی فحاشی کا رواج نہ تھا لیکن کلدانیوں اور

۵۱

دیگر مشرقی اقوام نے یہ مشغلہ وہاں بھی جاری کرا دیا اور جاری بھی ہوا تو حد درجہ شدت کے ساتھ! استرابو نے لکھا ہے کہ مصر کے بڑے بت کے لئے پجارنیں جمیل ترین لڑکیاں پسند کیا کرتے تھے۔ جو مندر میں کچھ دنوں خدمت کرنے کے بعد شادی بھی کر سکتی تھیں۔

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اڈمنڈ دوپواسے تحریر کرتے ہیں کہ:۔ مصر میں نوجوان عورتوں اور مردوں کو عیش و نشاط کے جملہ اسرار سے آگاہ کر دیا جاتا تھا اور مرد عورت باہم مل کر مندر کے اُن راستوں سے گزرتے تھے جو بالکل سنسان اور زمین دوز تھے ہیرو دوطوس نے لکھا ہے کہ بوبستیز میں ہر سال آفرس دیوی کا جو میلہ ہوتا تھا اس میں سات لاکھ حاجتریوں کو عشق و محبت کے اسرار سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ اس فحاشی سے دیویوں کے مندروں کو بیحد آمدنی ہوتی تھی۔ اور چونکہ اس "عشق آموزی" یا "اُپدیش" دینے کا اختیار صرف پجاریوں کو حاصل تھا اس لئے تمام آمدنی وہی آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے۔"

بعض فرقوں میں اب بھی یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں دیوتا لڑکیوں سے اور دیویاں مردوں سے ملتفت ہو جاتی تھیں اسی طرح اب بھی ہو سکتا ہے۔ مصر قدیم کے شہر تھیبار (Thebes) کی نسبت ہیرو دوطوس نے لکھا ہے کہ وہاں ہر رات ایک عورت مندر میں پلنگ پر لٹا کر اوپر سے نیچے لٹکا دیجاتی تھی۔ اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ رات کو کسی وقت دیوتا آئے گا اور اس سے ملتفت ہوگا۔ اسی طرح ملک لیسا کے شہر پتارہ میں یہ رواج کہ کسی نوجوان لڑکی کو دیوتا کے مندر میں بند کر کے قفل لگا دیا جاتا تھا۔ قطب شمالی کی رہنے والی

## ۵۲

ایسکیمو قوم میں اگرچہ لنگ پوجا تو نہیں پائی جاتی لیکن بعض تہواروں کے موقعہ پر ان کے ہاں فحاشی ضرور ہوتی ہے۔ شمالی امریکہ کے دیگر قبائل میں سورج دیوتا کا جو سالانہ تہوار ہوتا تھا اس کی رسمیں عجیب دلچسپ طریقہ پر ادا کی جاتی تھیں۔ یعنی ایک شوہر دار عورت ننگی ہو کر زمین پر لیٹ جاتی تھی اور اپنا نفس دیوتا کے سامنے پیش کر دیتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دیوتا کا جو انسانی نمائندہ ہوتا تھا وہ عورت کی پیشکش کو قبول کر لیتا تھا۔ اسی طرح ملک نکاراگوا کے قدیم باشندے اور امریکہ کی ناٹچز قوم فصل بہار کے زمانے میں ایک دن کے لئے اپنی عورتوں کو ہر قسم کی آزادی دیدیتی تھی۔

وسطی امریکہ کی پیپاکل قوم کو ان کے مقتدایان دین یہ ہدایت کیا کرتے تھے کہ اگر عمدہ فصلوں کے پیدا ہونے کی تمنا ہو تو کھیت کے مالک کو لازم ہے کہ وہ اور اس کی بیوی تخم ریزی کے زمانہ میں چند روز تک ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں اور جب تخم ریزی سے فرصت ہو جائے تو ایام مقررہ منقضی ہونے کے بعد وہ پورے جوش کے ساتھ عیش و نشاط میں مصروف ہو جائیں۔ بعض مقامات میں اس کے لئے خاص آدمی مقرر کئے جاتے تھے۔ جزیرہ قبرص میں بمقام پافاس اور ملک شام میں بمقام بائبلوس میں فحاشی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ مشہور یونانی جغرافیہ دان استرابو نے ایشیائے کوچک کے شہر انطاکیہ کی نسبت بیان کیا ہے کہ یہاں کے معبدوں میں ہزارہا عورتیں رہتی تھیں اور [illegible] درجہ آزادی کے ساتھ داد عیش دیجاتی تھی۔

بحیرہ روم کے مشرقی سواحل پر جتنے ملک [illegible] میں وسعت کے ساتھ

"دیوی ماتا" کا مذہب جاری تھا۔ جزیرہ کریٹ میں "دیوی ماتا" کے سوا کسی دوسرے دیوتا کا بت تھا ہی نہیں اور ملک فریجیہ میں بھی ایک بڑی دیوی "دیوتاؤں کی ماتا" کے نام سے پوجی جاتی تھی اور لوگ نہایت عقیدتمندی سے اس کے عضو جنسی کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح قدیم یونانیوں میں دیمیتر نام کی ایک دیوی تھی جو دراصل "دیوماترس" یعنی دیوتاؤں کی ماتا" تھی۔ اسی طرح تمام مہذب اور متمدن ممالک میں ایک ہی دیوی مختلف ناموں سے پوجی جاتی تھی جس کے نام ایشتار، استارتھ، سائبلا، دیمیتر، آلسیس، افرودیتہ تھے اور اُن کے معبدوں میں انتہا درجہ کی فحاشی ہوتی تھی۔ شہر ایفی سوس میں دیانا دیوی کا مشہور بت بالکل برہنہ ہی بنایا جاتا تھا۔ اور پافوس میں سیکڑوں عورتیں افرودیتہ کے نام سے دنیا بھر کے مردوں کی خواہشات پوری کرتی تھیں۔ اسی طرح اسکندریہ ہیلیو پولیس۔ ہیپی نوس وغیرہ میں ہر جگہ شدت کے ساتھ یہ نام حرکات ناشائستہ پائے جاتے تھے اور انسانی زندگی خواہش نفسانی کے لئے وقف تھی۔

تھسموفوریا کے نام سے دیمیتر دیوی کا ایک تہوار ہوتا تھا۔ جس میں عورتیں آٹے کا عضو جنسی بناتی تھیں۔ اور اس کے ساتھ فحش مذاق کرتی ہوئی نکلتی تھیں لیکن ان کے جلوس میں کسی مرد کو شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہی حال بالوہ تہوار میں ہوتا تھا۔ اور سائراکیوز میں یہ رواج تھا کہ جب تھسموفوریا کا تہوار آتا تھا تو زنانہ شکل کی میٹھی روٹیاں پکا کر دیوی کے استھان پر چڑھائی جاتی تھیں۔ قدیم رومیوں میں باخوس، لائبر پیاپس اور وینس کی پرستش ہوا کرتی تھی جن کا تعلق عشق و محبت سے تھا۔ اول الذکر دیوتا کا تعلق شراب خواریوں

اور بدمستیوں سے تھا۔ دوسرا دیوتا وہی ہے جس کے نام سے انگریزی لفظ "Venus" یعنی عیاش یا شہوت پرست نکلا ہے۔ وینس عشق و محبت اور عیش و عشرت کی دیوی تھی۔

پریاپس کا بت برہنہ بنایا جاتا تھا۔ اور جن لڑکیوں کی شادی ہونے والی ہوتی تھی، یا جو عورتیں بانجھ ہوتی تھیں وہ اس بت کے عضو پر گھوڑے کی طرح ادھر اُدھر ٹانگیں کر کے بیٹھ جاتی تھیں اور پھول چڑھاتی تھیں۔ سالانہ تہوار کے دن اس بت کو رتھ میں بٹھا کر عورتیں گاتی ہوئی بصورت جلوس نکلتی تھیں۔

جب وینس کا تہوار ہوتا تھا تو پریاپس کے بت کو باقاعدہ لے جا کر اسکے مندر میں پہونچایا جاتا اور وینس کے ساتھ اس کو ملا دیا جاتا سالانہ تہواروں کے موقعہ پر میٹھی ٹکیاں پکائی جاتی تھیں۔ جن پر اعضاء جنسی کی صورت کے پھیتے لگا کر نئی دلھنوں اور شادی شدہ عورتوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

یہ حالت تو قدیم زمانہ کی تھی لیکن تماشہ یہ ہے کہ بلاد یورپ میں دین مسیح کی اشاعت کے بعد بھی یہی فحاشیاں بدستور جاری رہیں جس شہر کا نام کسی زمانہ میں پافوس تھا وہ اب کو کلیا کہلاتا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں ایک انگریزی سیاح مسٹر ڈی جی۔ ہوگرتھ نے لکھا ہے کہ اس علاقہ کے کسان ہر سال ایک روز افرودیتہ دیوی کے تباہ شدہ مندر میں محراب کے وسطی پتھر پر تیل لگاتے ہیں اور پتھروں میں جو سوراخ ہوتے ہیں وہاں اپنے حرکات کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس عمل سے ان کی بیویوں کا بانجھ پن جاتا رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کی پوجا میں عیسائی بھی شریک ہوتے ہیں۔

## ۵۵

امریکہ کا سیاح جوزف میک کیب لکھتا ہے کہ "میں نے ۱۹۰۶ء میں دیزہ (قدیم پایہ تخت ملک تھریس) کے گرد و نواح میں یونانی عیسائیوں کو دیکھا کہ وہ ہر سال ایک مذہبی ڈرامہ کھیلتے ہیں، جس میں خاص ایکٹر کے پاس ایک بہت بڑا چوبیں عضو ہوتا ہے۔ یہ شخص لڑکیوں کو پکڑنے دوڑتا ہے۔ اور جس کو پکڑ لیتا ہے گویا اُس سے شادی ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں وہ مرد اور لڑکی نہایت فحش طریقہ سے ناچتے ہیں۔ اور یہ حرکت کرتے ہوئے بازاروں میں نکلتے ہیں اور چندہ جمع کرتے ہیں۔ الغرض یہ تہوار انتہائی سیاہ مستیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ناردے اور سویڈن کے عام کھیل تماشوں میں اس قسم کے حرکات کی جاتی ہیں۔"

آئرلینڈ میں ایک عورت کا بت جو اپنے خاص حصۂ جسم کی طرف اشارہ کرتی ہوئی دکھائی جاتی تھی گرجا کے صدر دروازہ میں محراب کے وسطی پتھر کے بجائے نصب کرتے تھے کہ شیاطین داخل نہ ہوں۔ اس کو قلطی زبان میں شیلانہ جگ کہتے تھے۔ ایسا ہی ایک پتھر چند سال گذرے ملک کارک کے کلانے گرجا کے صدر دروازہ میں نصب تھا دوسرا پتھر شہر ڈبلن میں رائل آئرش اکاڈیمی کے اندر پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کی اور تصویریں برطانیہ اور اسپین کے گرجاؤں میں بھی تھیں لیکن اصلاح مذہب کے زمانہ میں اس طرح کی اکثر تصاویر تباہ کر دی گئیں۔

ڈاکٹر ہارلنفورڈ نے لکھا ہے کہ اس قسم کی ایک تصویر ہیر فورڈ شائر اور دوسری کارنوال میں ابھی تک موجود ہے انگلستان کے بعض حصوں میں اس شکل کے پتھر ابھی تک کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ ورسٹ شائر میں ایک پتھر

۵۶

چار فٹ لمبا موجود ہے۔ جو بالکل اصل کے مطابق ہے۔ اسی ملک میں ٹرنڈیل پہاڑی پر زمین کھود کر ۱۸۰ فٹ لمبی ایک دیوزاد تصویر بنائی گئی ہے جسے سرنی دیو کہتے ہیں یہ بت بالکل عریاں ہے۔ اور ہر سات برس کے بعد اس کو صاف کیا جاتا ہے۔

اطالیہ کے ملک ابروزائی میں بمقام آکسرنیا ہر سال سینٹ کاسماس اور سینٹ دامیال کے میلے ہوا کرتے تھے۔ ان میں شریک ہونے کے لئے بانجھ عورتیں اور اعضاء جنسی کی بیماریوں کے مریض دور دور سے آتے تھے۔ دکانیں موم کے بنے ہوئے اعضاء سے بھری ہوتی تھیں اور بانجھ عورتیں انہیں خرید کر گرجا میں چڑھاتی تھیں۔ امراض جنسیہ کے مریض ننگے ہو کر پادریوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور وہ متبرک تیل لگاتے تھے۔ جب پیروں وائیٹر نے ان کا بُری طرح مضحکہ اُڑایا تو مجبور ہو کر ۱۷۷۸ء میں پاپائے اعظم کے ایک فرمان کے ذریعہ سے یہ مراسم بند کرا دئے گئے۔

الاتمری میں جو رومہ سے اور بھی زیادہ قریب ہے مکانات کی دیواروں پر اعضاء جنسی کی تصویریں کھنچی ہوئی موجود ہیں جو غالباً پہلے زمانہ میں تمام اطالیہ کے اندر عام طور سے پائی جاتی تھیں۔ مگر اب یہ رسم ہو گئی ہے کہ ایسٹر سنڈے کے روز لوگ جا کر ان تصویروں پر کنکریاں مارتے ہیں۔ قدیم طریقہ یہ ہے کہ جو عورتیں اس سنگباری میں شریک ہوتی ہیں ان کے ٹخنوں میں سونے کے بنے ہوئے اعضاء جنسی پہنے ہوتے ہیں ان کی صورت عام طور پر ایسی ہوتی ہے گویا کسی مٹھی بند ہے اور انگوٹھا انگلیوں کے درمیان دبا ہوا سی قدر باہر

۵۷

نکلا ہوا ہے، اس زیور کو عام طور پر دیہاتی پہنتے ہیں اور اس کا نام فیکو ہے۔ روم کے پورٹسائی عجائب خانہ میں ایک قربانگاہ کا ظرف ہے۔ جس میں ایک عورت کی تصویر اس طرح کھدی ہوئی ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں میں مردانہ عضو لئے ہوئے ہے۔ مقام ترانی میں چند سال پیشتر تک کارنیوال کے موقعہ پر ایک عریاں بت نکالا جاتا تھا، جس کا نام مقدس عضو رکھا گیا تھا۔

۱۵۵۵ء میں جب پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگوں نے امبردم فتح کیا تو انھوں نے تبرکات میں ایک دلچسپ چیز پائی جس کو با بچھ عورتوں نے شراب ملتے ملتے سُرخ کر دیا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جسے لا معلوم زمانہ سے پادری لوگ فوتین راہب کا عضو بنایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ راہب شہر لائینس کا اولین پادری تھا۔ اور تمام علاقہ اس کا بیحد معتقد تھا اور ہر جگہ اس کے محض حصہ جسم کے مومی نمونے پائے جاتے تھے۔

جنوبی فرانس میں گرجاؤں کے اندر مومم کے بنے ہوئے اعضا چھتوں میں لٹکا کرتے تھے۔ بیٹھی ٹکیاں جن پر اعضا جنسی کا نشان بنا ہوتا تھا بکثرت فروخت ہوتی تھیں پُرانے زمانے کے جو پتھر کہیں کہیں نصب تھے وہاں با بچھ عورتیں جا کر اپنا جسم اُس سے مس کرتی تھیں۔

اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یہ بھی سننے کے قابل ہے۔ کہ راہب فوتین کون بزرگ تھے۔ درحقیقت یہ ایک عریاں بت تھا جس کے معتقدین کی بہت کثرت تھی۔ جب مسیحیت کا دور شروع ہوا تو پادریوں اور راہبوں نے دیکھا کہ اگر یہ بُت توڑ دیا گیا تو نہ صرف یہ کہ عوام کو ناگوار گزرے گا بلکہ آمدنی کا

ایک معقول ذریعہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اس لئے اُنھوں نے یہ چالاکی کی کہ اس بت کو اصطباغ دیکر عیسائی بنالیا اور اس کے متعلق یہ روایت گھڑی کہ یہ کسی وقت بڑا زبردست ولی گذرا ہے۔

سینٹ ٹرز، ٹینی میں سینٹ گائلز اور انجو میں اور سینٹ رینی سب اسی قسم کی فرضی ہستیاں تھیں۔ ایک بزرگ اور بھی تھے جن کا اسم مبارک سینٹ آرنوو تھا۔ لیکن اُن کے بت پر کپڑا پڑا رہتا تھا۔ جو صرف بانجھ عورتوں کے لئے اُٹھایا جاتا تھا۔ آرینج میں سینٹ یوٹروپیس کے گرجا کے اندر ایک چوبی عضو تھا جس پر چمڑا منڈھا رہتا تھا۔ لوگ اس کی بہت پوجا کرتے تھے۔ بائبل میں جو روایات اس قسم کے فحاشی کی درج ہیں ان کو ہم یہاں درج نہیں کرتے ہر شخص انہیں دیکھ سکتا ہے۔ قدیم زمانہ کے عبرانیوں میں یہ رواج تھا کہ جب وہ حلف اُٹھاتے تھے تو حلف پر پورا زور دینے کے لئے اپنے عضو پر ہاتھ رکھکر قسم کھاتے تھے کیونکہ عضو مخصوص تمام جسم میں نازک ہونے کے علاوہ ایسی چیز بھی ہے جس پر انسان کی نسل کا انحصار ہے اور اپنی اولاد بہت زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ قدیم زمانہ کے لوگوں کے نزدیک یہ عضو افزایش نسل کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ مثلاً کتاب پیدایش کے باب ۲۴ آیتہ ۲ میں ابرہام اپنے سب سے مسن نوکر کو طلب کرکے کہتا ہے:۔ میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو اپنا ہاتھ ران کے تلے رکھ اور میں تجھ سے خداوند کی جو آسمان کا خدا ہے اور زمین کا خدا ہے قسم لوں گا اسی طرح اسرائیل نے کتاب پیدایش کے باب ۴۷ میں یوسف کو حلف دیتے ہوئے کہا ہے:۔

۵۹

اور جب اسرائیل کے مرنے کا وقت پہونچا تب اس نے اپنے بیٹے یوسف کو بلا کر اس سے کہا کہ اب جو میں نے تیری نظر میں مہربانی پائی تو اپنا ہاتھ میری ران تلے رکھ دیجئے۔ اور مہربانی اور صداقت سے میرے ساتھ سلوک کیجئے۔ مجھکو مصر میں مت گاڑیے۔ میں اپنے باپ دادوں کے پاس سوؤں گا۔ تو مجھے مصر سے باہر لیجائیو اور ان کے گورستان میں گاڑیو۔

بائبل کی ان آیات میں "ران تلے" کے جو الفاظ آئے ہیں ان سے مراد خصیتین ہیں۔ کیونکہ عبرانیوں میں سب سے زیادہ پختہ حلف وہ ہوتا تھا جو خصیتین پر ہاتھ رکھکر لیا جاتا تھا۔ واضح ہو کہ بائبل میں دو حصہ ہیں ایک Old Testament یعنی عہد نامہ عتیق اور دوسرا New Testament یعنی عہد نامہ جدید اور (Testimony) (شہادت) اور (Testament) (معاہدہ) کا مادہ بھی وہی ہے جو (Testicle) (خصیتین) کا ہے۔ اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد و پیمان یا حلف قسم کے باب خصیتین کو کیا اہمیت حاصل تھی۔

قدیم مصریوں میں بھی یہی رواج تھا کہ جب وہ قسم کھاتے تھے تو اپنے عضو کو اوپر اٹھا دیتے تھے۔

## مذہبی فحاشیوں کی مروج علامتیں

گزشتہ بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ (عضو) جنسی کا تقدس یعنی قدرت کے قوائے تخلیقیہ کی پرستش انسان قدیم کے دائرۂ مذہبی میں داخل تھی اور اب بھی [illegible] صورت سے اس کا رواج چلا آرہا ہے۔ جو قومیں ترقی کرکے اپنے قدیم مراسم کو

ترک کر چکی ہیں گو ان کے ہاں براہ راست اس قسم کی پرستش نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی بہت سی علامات اُن کی معاشرت و تہذیب اور موجودہ طریق عبادت میں ایسی نظر آتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی وقت ان کے ہاں یہ مخصوص پرستش ضرور پائی جاتی تھی

قدیم ترین اقوام دملل میں تولید و تناسل ایک طرح کا مقدس فعل سمجھا جاتا تھا اور اسی لئے اعضاء جنسی کی علامتیں اور صورتیں بالکل نمایاں طور پر بنائی جاتی تھیں۔ چنانچہ اب بھی بیشمار باقیات قدیم زمانہ کے ایسے پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح کی پرستش کا عقیدہ پہلے بہت عام تھا۔ بعد کو امتداد زمانہ کے ساتھ جب اُن علامتوں سے حجاب آنے لگا، تو ان میں تغیر و تبدل کیا گیا اور آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ انسان رفتہ رفتہ انکی کھلی ہوئی پرستش سے منحرف ہو کر مروز علامتوں سے کام لینے لگا۔ اس زمانہ میں بھی اگر اُن قوموں کی معاشرتی رسموں اور قدیم روایات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی روزکی زندگی میں پوشیدہ یا علانیہ متعدد علامتیں اس طریق عبادت کی پائی جاتی ہیں۔

قدیم مصریوں، فینیقیوں، بوبیائی والوں، یونانیوں اور بہت سی ایشیائی اقوام دملل میں چونکہ مقدس مباشرت کا رواج بہت تھا اس لئے اعضاء جنسی کی پرستش بھی بکثرت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ان کے کھنڈروں سے ان کی حجری شکلیں کثرت سے برآمد ہوئی ہیں اور اب بھی اُن کے عبادت خانوں میں اس قسم کی علامتیں یا صورتیں اکثر و بیشتر نظر آتی ہیں

کھیم[1] مصر قدیم کا نہایت مشہور دیوتا تھا اور اس سے جذبات محبت یا جذبات نفسانی منسوب کئے جاتے تھے۔ اس کے متعلق رالنس نے اپنی تاریخ مصر قدیم میں لکھا ہے کہ اس کو حد درجہ فحش و حیا سوز صورتوں میں دکھایا جاتا تھا زمانہ حال کے بعض ماہرین مصریات اُس کی عریانی پر تاویلات کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی شرم انگیز عریانی کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی اور نہ عقل انسانی باور کر سکتی ہے کہ ایسے دیوتا کی پرستش کا اخلاق انسانی پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے۔ قدیم اہل مصر کا خیال تھا کہ کھیم قدرت کے قوائے تخلیقیہ کا مظہر اتم ہے اور اس کا بت دیکھنے سے دل میں اُس قانون قدرت پر عمل کرنے کی تحریک ہوتی ہے، جس کے ماتحت موالید ثلاثہ اپنا ہمجنس پیدا کرتے ہیں۔ جس طرح قدیم یونان میں پان بُت کے سلسلۂ پرستش میں صدہا قسم کی ناپاک رسمیں داخل مذہب ہو گئی تھیں اسی طرح مصر میں بھی کھیم کی پرستش کے سلسلہ میں سیکڑوں حرکات ناشائستہ سرزد ہوتی تھیں اور اس مقدس دیوتا کا بت سر تمام اعضاء کے عریاں بنایا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اس میں بکرے کی تمام خصوصیات شہوانی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کے مندر میں ایک بکرا بھی رکھا جاتا تھا جس کا نام "کامتف" تھا۔ ہر چند قدیم زمانہ کے لوگوں میں یہ رواج عام تھا کہ وہ اعضاء جنسی کی تصویر چاندی یا تانبہ کی تختی پر کھدوا کر بطور تعویذ یا طلسم گلے میں ڈالے رہتے تھے۔ اور یقین

---

[1] غالباً کھیم یا کامتف وہی دیوتا ہے جسے ہندوؤں کے یہاں "کام دیو" کہتے ہیں اور جو عشق و محبت یا تعلق جنسی کا دیوتا مانا جاتا ہے۔

کرتے تھے کہ اس تعویذ یا طلسم کے اثر سے اولاد زیادہ ہوگی۔ لیکن اس زمانہ کی عورتیں بھی بعض ایسے زیور استعمال کرتی ہیں جو حقیقتاً اعضاء جنسی ہی کی مرموز صورتیں ہیں، لیکن انھیں اسکا علم نہیں۔ ذیل میں ہم اُن بعض رموز و اشکال کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق حقیقتاً انھیں اعضا سے تھا۔ لیکن لوگ اسکی اصلیت سے ناواقف ہیں۔

**صلیب** صلیب کا تعلق عموماً عیسائی مذہب سے سمجھا جاتا ہے اور عیسائی اسکو اپنے مذہب کی خاص علامت سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسطرح عیسائیوں کی بہت سی مذہبی رسمیں، بجنسہ یا کسی قدر تغیر و تبدل کے ساتھ قدیم مذاہب سے لی گئیں ہیں، اسی طرح صلیب بھی اُن میں آئی۔ غالباً یہ سنکر حیرت ہوگی کہ صلیب مسیح سے صدیوں قبل مصر قدیم میں مردانہ آلۂ جنسی کی مرموز شکل تھی، جیساکہ وہاں کے آثار قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اور ہندوستان میں بھی صلیب کا نشان اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ اور ابتک ہوتا ہے چنانچہ ڈیون پورٹ لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کا "لنگم" یونانیوں کا "فلس" رومیوں کا "دوپر یا پس" اور عیسائیوں کی صلیب جسے وہ "حیات ابدی" کی نشانی سمجھتے ہیں درحقیقت ایک ہی چیز ہیں۔ اور ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں۔ قدیم مصر میں "T" وضع کی صلیب مسیحیت سے صدیوں پیشتر قوائے تخلیق کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اور چونکہ اسی قوت کے ذریعہ سے دنیا کا سلسلۂ تخلیق جاری رہتا ہے، اسی لئے غالباً عیسائیوں نے صلیب کو "حیات ابدی" کی نشانی قرار دیا۔ تمام بڑے بڑے عجائب خانوں میں مثلاً مٹروپولٹن میوزیم نیویارک۔ برٹش میوزیم لندن، یا لوور

(پیرس) شعبۂ مصریات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس عہد میں اعضاء جنسی کو ظاہر کرنے کے لئے کنایتہً بہت سی چیزوں سے کام لیا جاتا تھا اور انھیں میں سے ایک شکل "T" تھی لیکن اگر اسکو دستہ دار صلیب یعنی اس شکل + میں ظاہر کرتے تھے تو اس سے دونوں جنس کے اعضاء کا اتصال مقصود ہوتا تھا چنانچہ وادی النیل (ملک مصر) کے آثار قدیمہ کی سیر کرنے سے آپ کو وہاں کے در و دیوار پر "تاؤ" (T) کی ہزار ہا صورتیں کھنچی ہوئی یا کھدی ہوئی نظر آئینگی۔ حتیٰ کہ بعض بعض دیوتاؤں کے ہاتھ میں بھی "تاؤ" (T) ہوگا۔

دستہ دار صلیب کو قدیم کلدانیوں اور فینقیوں میں بھی نگاہ تقدس و احترام دیکھا جاتا تھا۔ تاؤ وضع کی صلیب کا استعمال مسیحیت سے پیشتر آئرلینڈ میں بھی پایا جاتا تھا اور قدیم میکسیکانیوں میں بھی اس وضع کی صلیب کے مختلف نام تھے مثلاً:۔ "شجرۃ الحیات" شجرۃ القوۃ۔ اور شجرۃ اللحم۔ قدیم حبش میں جو شکل تاؤ کی بنائی جاتی تھی وہ عام مسیحی صلیب کی طرح تھی۔ مس الیزبتھ اسی گولڈ اسمتھ نے قدامت صلیب کے متعلق تحریر کیا ہے کہ :۔

"صلیب عالم انسانی میں قدیم زمانہ سے استعمال ہوتی ہے اور مختلف اقوام و ملل میں ایک مذہبی نشان تصور کی جاتی ہے تمدن انسانی کے ہر درجہ میں یہ چیز موجود رہی ہے۔ امریکہ کی ایک قوم جس کا نام "انکا" ہے صلیب کا بہت زیادہ احترام کرتی ہے۔ پٹاگونیا کے قدیم باشندے صلیب کا نشان اپنی پیشانیوں پر گود لیتے ہیں۔ قدیم انگلستان کے ڈروڈ لوگ اس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور عیسائیوں کے نزدیک تو یہ حیات ابدی کا نشان ہے۔ الغرض

زندگی کا خیال صلیب کی علامت سے کبھی خالی نہیں رہا۔"

مسٹر ہسلاپ تحریر کرتے ہیں کہ "عیسائی دنیا میں گڈ فرائڈے کو جو صلیب نما وضع کی میٹھی روٹی کھائی جاتی ہے اور ایسٹر سنڈے کو جو رنگے ہوئے انڈے کھائے جاتے ہیں یہ سب رسمیں قدیم کلدانیوں سے لی گئی ہیں جن کے نزدیک چیزیں ایک خاص مذہبی حیثیت رکھتی تھیں۔ میٹھی روٹیاں کلدانیوں میں "ملکۂ فلک" کی پوجا کے روز کھائی جاتی تھیں جس کا نام "ایسٹر دیوی" یا ایشتار یا استارتہ تھا اور یہ تمام باتیں اسوقت بھی پائی جاتی تھیں جب سیکرا پس نے یونان کے دارالحکومت شہر ایتھنز کی بنیاد قائم کی تھی۔"

**مثلث** یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ عیسائیوں میں تثلیث کا خیال کیونکر آیا تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مثلث قدیم زمانہ میں ایک متبرک نشان سمجھا جاتا تھا اور اعضا جنسی کی مروج شکل متصور ہوتا تھا اگر اسکی چوٹی نیچے ہوتی جیسے ▽ تو وہ نسائی عضو کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر اسکی چوٹی اوپر ہوتی جیسے △ تو اُسے مردانہ عضو کی نشانی سمجھتے اور دو مثلثوں کے میل سے جو چھ کونوں کا ستارہ بنتا ہے جیسے ✡

تو اسکو دونوں جنس کے اعضا کا اتصال سمجھا جاتا تھا، یہودیوں کے تمام معابد میں اس قسم کے ستارے ✡ بکثرت دیکھنے میں آتے تھے اور ان کی اصطلاح میں "مہر سلیمانی[1]" کہتے تھے، قدیم عبرانیوں میں مثلث کی شکل زمین کے توالدِ تخلیقیہ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔"

[1] معلوم ہوتا ہے کہ بعض تعویذوں کو نقش سلیمانی کہنا اسی بنا پر ہے کیونکہ وہ تعویذ بھی تقریباً اسی طرح کے بنائے جاتے ہیں۔

۶۵

چینیوں میں قدرت کی تخلیقی قوتیں دو سمجھی جاتی ہیں۔ ایک کا نام "یانگ" ہے جو مذکر قوت ہے۔ دوسری کا نام "ین" ہے یعنی قوت مؤنث۔ چینیوں کے عقیدے میں انھیں دونوں قوتوں کے اتصال باہمی سے ایک تیسری جداگانہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے "جان" کہتے ہیں۔ چینی مذہب میں تثلیث کے اجزاء آسمان، یانگ، اور ین ہیں۔ انکے عقیدے میں انہی تینوں چیزوں کے ملنے سے "قوت خلاق" پیدا ہوتی ہے۔ اس قوت کو اُن کی اصطلاح میں "اتحاد قوائے ثلاثہ" بھی کہتے ہیں۔ بہت سی قدیم قوموں میں بجائے مثلث کے ترسول کا نشان ہوتا ہے۔ جو انکے نزدیک مختلف قوموں کے اتحاد کا مظہر متصور ہوتا تھا مثلاً کسی کے نزدیک آسمان۔ زمین اور پانی۔ کسی کے نزدیک آتش آب اور ہوا۔ کسی کے نزدیک شمس قمر اور زہرہ پیروانِ زردشت کے نزدیک مثلث یا ترسول۔ آتش۔ نور اور اثیر کا مظہر تھا اور عبرانیوں کے نزدیک آتش۔ نور اور ہوا (یا روح) کی علامت سمجھا جاتا تھا۔"

قدیم مصریوں میں ہر مندر تین مورتوں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ (۱) دیوتا۔ (۲) دیوی۔ (۳) ان دونوں کا ثمرۂ اتصال یعنی بچہ، لیکن یہ تینوں تثلیث فی التوحید کی صورت میں ہوتے تھے۔ اور اس تثلیث کی اظہار کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک حلقہ میں مثلث کھینچ دیا جاتا تھا جیسے اسکے معنی سیت ہورس اور شو تھے اور ان تین معبودوں کی تشریح یہ کی جاتی تھی کہ ہورس برسات ہے، اور سیت خشک سالی اور شو ہواؤں اور طوفانوں کا دیوتا ہے، شو کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلا دیوتا

تھا جس نے زمینوں سے آسمانوں کو بصورت مثلث پیدا کر کے بلند کیا اور اسکی تصویر بھی اس طرح دکھائی جاتی تھی کہ وہ ایک مثلث پر کھڑا ہوا ہے جس کے اندر سات زینے (یعنی سات آسمان) بنے ہوتے ہیں یہ دیوتا دوسرے فسادی اور جنگجو دیوتاؤں کے درمیان ثالث اور حَکَم کا کام کرتا تھا۔

ایک تشریح مصری تثلیث کی یہ بھی تھی کہ نوت آسمان کا دیوتا ہے۔ سیب زمین کی دیوی ہے۔ اور شو فضا کا دیوتا ہے۔ لیکن قدیم مصریوں کی سب سے زیادہ مشہور تثلیث اوسیرس۔ آئسیس اور ان کے بیٹے ہورس پر مشتمل تھی اور اسی تثلیث سے غالباً مسیحی تثلیث لی گئی ہے جس کا مفہوم ان کے یہاں باپ۔ بیٹا اور روح القدس ہے لیکن ان تمام "تثلیثات" کی اصل وہی اعضاء جنسی یا قوائے شہوانی کی تعبیر ہے جو باعث وجود حیات ہے۔

**مچھلی** ڈاکٹر فرائیڈ اور دیگر ماہرین نفسیات نے لکھا ہے کہ مچھلی بھی قدیم اقوام و ملل میں عضو جنسی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اور ایک مقدس چیز سمجھکر اس کی پرستش کی جاتی تھی چنانچہ بودھوں، مصریوں، بابلیوں، آشوریوں اور فینقیوں کی مقدس تصاویر اور نقوش سنگتراشی میں مچھلی کی شکلیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔

دو مچھلیاں اگر اس طرح بنائی جائیں کہ ایک کی دم دوسرے کے سر سے ملی ہو جیسے اور اس پر کھبدا سا انجیر کا پتہ ہو تو اسے عورت کا عضو جنسی سمجھا جاتا تھا۔ مصریوں میں جب آئسیس دیوی کی تصویر بنائی جاتی تھی تو اس کی گود میں اس کا بچہ ہورس بھی بناتے تھے لیکن اسی کے ساتھ دیوی کے سر پر ایک مچھلی بھی بنا دیجاتی تھی۔

ہندوؤں کے بت ارد ناری ایشوری کے سر پر بھی ایک بنت البحر یعنی حل کنیا کی صورت بنائی جاتی ہے یہ بت گویا برہما کا ہے اور ایسی حالت میں دکھایا جاتا ہے جبکہ وہ تکوین عالم کے کام میں مصروف تھا اس کا داہنا حصہ مردانہ اور بایاں حصہ زنانہ ہے اور اعضاء جنسی دستہ دار صلیب سے دکھائے جاتے ہیں جو مردانہ و زنانہ اعضاء کے اتصال باہمی کی نشانی ہے۔ چونکہ مچھلی بیشمار انڈے سے بچے دیتی ہے اس لئے قدیم زمانہ کے لوگ اسے افزائش نسل کی دیوی سمجھتے تھے۔

**بیضاوی یا بیضوی شکل** بیضاوی شکل ⬭ بھی ایک عام علامت ہے جسکے ذریعہ سے نسائی عضو جنسی کو عموماً ظاہر کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک لمبوتری چوگوشیہ شکل سے ◊ بھی یہی معنی ظاہر کئے جاتے ہیں۔

ناظرین یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ گرجاؤں کی کھڑکیاں اور دروازے عموماً زنانہ عضو جنسی کی شکل کے بنائے جاتے ہیں بعض مذہبوں کے ماننے والے ایسے سوراخوں میں سے گذرتے ہیں جو پتھر میں اس شکل کے بنائے جاتے ہیں جس سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ گویا وہ از سر نو پیدا ہوئے ہیں اور ایسے ہی معصوم و بے گناہ ہیں جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر لی الگزینڈر اسٹون نے گرجاؤں کی طرز تعمیر پر بحث کرتے ہوئے اسکی جنسی یا شہوانی نوعیت پر کافی روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی گرجا میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک دوہرے دروازہ کے ذریعہ سے داخل ہوتا ہے جو بمنزلہ عورت کے شفرۂ کبیرہ Labia majara کے ہے اس سے آگے بڑھکر اس شخص کو ایک اور دوہرے دروازہ میں جانا پڑتا ہے جو بمنزلہ

شفرۂ صغیرہ (Labia Minora) کے ہے جب وہ اندر یعنی اندام
اندرونی (Vagina) میں پہونچتا ہے تو اسے اپنے سامنے قربان گاہ یعنی رحم
(Womb) نظر آتا ہے اور قربان گاہ کے دونوں طرف اسے دروازے نظر
آتے ہیں جو گویا نلے (Fallopian tubes.) ہیں قربان گاہ میں
اسے بپتسمہ دیا جاتا ہے یعنی رطوبت رحمی (Amniotic fluid)
لگتی ہے اس کے بعد وہ گرجا سے باہر آتا ہے یعنی دوبارہ پیدا ہو کر نکلا ہے قرون وسطیٰ
کے بہت سے گرجاؤں کے صدر دروازوں پر نسائی عضو جنسی کی تصویر کھود دیکھائی
تھی۔ اور اب بھی کلیسائے ڈمبلین کی کھڑکی پر جس کی نسبت رسکن نے لکھا ہے
کہ وہ انگلستان بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے نسائی عضو کی تمام تفصیلات
منقوش ہیں۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بھی یہ دستور تھا کہ جب ان کی کوئی اونٹنی
مرجاتی تھی تو وہ اس کے اندام کو کاٹ کر مکان یا خیمہ کے دروازہ پر لٹکا دیتے تھے
تاکہ خیر و برکت حاصل ہو اسیطرح قرون وسطیٰ کے یورپ میں بھی یہ رواج تھا
کہ وہ کسی مردہ گائے یا گھوڑی کا اندام کاٹ کر دروازہ پر آویزاں کر دیتے تھے۔
مگر اب اس کے بجائے گھوڑے کے نعل کا استعمال ہونے لگا ہے جو عورت کے
عضو جنسی کی نشانی ہے۔

**سانپ** سانپ کو اکثر ممالک میں خواہشات نفسانی کا مکمل مظہر سمجھا گیا ہے۔
اور کوئی مذہب دنیا کا ایسا نہیں ہے جسمیں کسی نہ کسی صورت سے سانپ
موجود نہ ہو۔ جذبات شہوانی کے علاوہ سانپ کو عقل و دانش کی علامت

بھی سمجھا جاتا تھا سانپ کی شکل اس طرح سے بنائی جائے کہ اس کی دم اس کے منھ میں ہو جیسے ○ تو اسکے غیر فانی ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اسرائیلیات میں سانپ کو جذبات شہوانی کی علامت قرار دیا گیا تھا اور سانپ کی شکل قدیم اقوام و ملل میں اسی معنی کے لئے بکثرت استعمال ہوتی تھی۔ مثلاً قدیم یونانیوں میں جب طب یونانی کے ابوالآباء اسقلیبوس اور اس کی بیٹی ہائجیہ کے بت بنائے جاتے تھے تو ان کے سروں پر ایک سانپ کی تصویر ضرور بنائی جاتی تھی۔

ڈاکٹر وال نے لکھا ہے کہ:۔ ہائجیہ نے ایک سانپ پال رکھا تھا جسے وہ دودھ پلایا کرتی تھی یہ سانپ مندر میں رہا کرتا تھا جس کی وہ پوجا کیا کرتی تھی جب کوئی مریض مندر میں آکر علاج کا خواہاں ہوتا تو یہ اسے حکم دیتی کہ مندر میں جاکر شگون لے کہ مندر کا سانپ تمھاری دی ہوئی غذا کس طرح قبول کرتا ہے۔ وہ شخص مندر میں داخل ہو جاتا تھا۔ مندر کے اندر کی حالت یہ تھی کہ خوبصورت لڑکیوں کی بڑی تعداد وہاں رہتی تھی جو اس شخص کو ہر طریقہ سے لبھاتی تھیں اور آخر کار وہ شخص کسی نہ کسی کے قبضہ میں آ ہی جاتا تھا۔ پھر اگر وہ اس دعوت شباب سے پوری طرح فائدہ اٹھاتا، تو یہ حکم لگایا جاتا کہ شفا جلد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ ہر سال مقررہ دن میں ایک دوشیزہ برہنہ حالت میں مندر کے اس مقام پر غذا لیجاتی تھی جہاں سانپ پلے ہوئے تھے۔ اگر سانپوں نے وہ خوراک جلد اور شوق سے کھالی تو سمجھا جاتا تھا کہ یہ سال اچھا ہے ورنہ نہیں۔

سانپ کی پرستش امریکہ کے قدیم آبادی میں بھی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ اوہیو میں ابتک سانپوں کا ٹیلہ موجود ہے۔۔ اور قوم ازتیق کی ناگ پوجا

کی یادگاریں وہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں ناگ پوجا اور ناگ پنچمی سے ہر شخص واقف ہے آدم و حوا اور جنت عدن کے قصہ میں جو سانپ کا ذکر آتا ہے اس کے متعلق قدیم مسیحیوں مثلاً جسٹن۔ اگسٹائن۔ غریغوری وغیرہ کا عقیدہ یہ تھا کہ سانپ سے مقصود صرف جذبۂ شہوانی کا اظہار ہے۔ آئرلینڈ میں جب سینٹ پیٹرک نے مذہبی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا تو اس نے کوشش کی کہ ملک کے اندر سے سانپ نکلوا دیئے جائیں کیونکہ وہاں قوائے تخلیقیہ کا اظہار سانپوں کی مورتوں سے کیا جاتا تھا۔

قدیم چین و جاپان کی روایات میں بھی سانپ کا عنصر بڑی حد تک موجود ہے۔ اور چین کا تو قومی نشان ہی ابھی تک اژدہا ہے چونکہ سانپ کی صورت ایک طویل عضو جنسی کی طرح ہوتی ہے اس لئے اس کو از دیاد نسل کی قوت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اور اسکی انگوٹھیاں۔ تعویذ اور کڑے ابتک بعض ملکوں میں شوق سے پہنے جاتے ہیں۔

قدیم یونانیوں کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ بعض دیوتا سانپ کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جیوپیٹر آمون اسکندر اعظم کی ماں اولمپیاس سے سانپ ہی کے بھیس میں ملا تھا اور اس مواصلت سے سکندر پیدا ہوا۔ عہد قدیم میں بدکار اور مغلوب النفس عورت کو ناگن سے تشبیہ دینے کا رواج تھا۔ چنانچہ مصر کی ملکہ قلوپطرہ کو نیل کی ناگن کہنا اسی بنا پر تھا۔

**بعض پھل اور پودے** قدیم اقوام و ملل میں پھلوں اور پودوں سے بھی اعضاء جنسی اور جذبات شہوانی کی تعبیر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یورپ میں ابھی تک

سنترہ کے پھول کو شادیوں میں صرف اسی لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کے اثر سے دُلھن بہت زیادہ صاحب اولاد ہوگی۔ اسی طرح انگور کو جذبات شہوانی کا مظہر خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انگور سے شراب بنتی ہے اور شراب مقوی و مہیج چیز ہے۔ آشور کے دیوتا بعل سے شمشاد و صنوبر کا پھل منسوب تھا اور انجیر کو بھی عضو جنسی سے تشبیہ دیتے تھے۔ کیونکہ اس کا پتا سہ شاخہ ہوتا ہے جو رسول سے مشابہت رکھتا ہے جو ممالک سواحل بحیرۂ روم پر واقع ہیں وہاں لوگوں میں انجیر کے درخت کی پوجا کی جاتی ہے۔

مصر قدیم اور دیگر ممالک مشرقی میں کنول اور بعض دوسرے پھولوں کو ہمیشہ بنظر احترام دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ بین نائٹ لکھتے ہیں کہ :۔ کنول یا نیلوفر کو شمالی نصف کرۂ ارض کے جملہ ممالک میں مذہبی احترام کے ساتھ دیکھا جاتا تھا اور بعض ممالک میں (مثلاً ہندوستان اور چین) یہی حال ہے۔ تاتاریوں جاپانیوں اور ہندوؤں کی تمام مورتیاں کنول کے پھول پر قائم کی جاتی ہیں اور اس پھول کو ہندوستان، تبت اور چین میں اب بھی متبرک سمجھا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کا کنول کے پھول سے پیدا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پھول عورت کے مخصوص حصۂ جسم کا مظہر ہے۔ لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ کنول کا پھول دیوتا کی ناف سے پیدا ہوا تو خیال گذرتا ہے کہ یہ مردانہ عضو جنسی کی علامت ہے۔

**درخت** | بلحاظ جمالیات دنیا میں بعض درخت نہایت خوبصورت اور دلکش ہوتے ہیں ان کے سیدھے سڈول تنے، گنجان شاخیں اور پتے، خوبصورت رنگین اور خوشبودار پھول، لذیذ اور خوبصورت پھل انسان کا دل لبھائے بغیر

نہیں رہتے ۔ اور بہت سے درخت سدا بہار ہوتے ہیں جنھیں دیکھکر بقاء ابدی کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے بعض درختوں پر ہر سال خزاں آتی ہے ہر سال نئے پھول پتے اور پھل نکلتے ہیں اور ہمیشہ یہی سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ اس لئے قدما کے نزدیک درخت ابدیت کی نشانی تھی ۔

آریا وسامی عقائد میں تین طلسمی درخت پائے جاتے ہیں ۔ شجرۃ الحیات ۔ شجرۃ العلم ۔ شجرۃ الجنۃ ۔ ڈاکٹر ڈی الویلا لکھتے ہیں کہ ان عقائد کے مطابق ان درختوں کی خصوصیات حسب ذیل تھیں :۔

شجرۃ الحیاۃ سے ایک قسم کا رس پیدا ہوتا تھا جسکے پینے سے دوامی شباب حاصل ہو جاتا تھا ۔ شجرۃ العلم میں یہ کمال تھا کہ وہ غیب کی باتیں بتا دیتا تھا ۔ شجرۃ الجنۃ کا تعلق روشن و منور اجرام سماوی سے تھا "

قدیم ایرانیوں میں ہوما یا ہوم نامی ایک درخت ہوتا تھا جس کا رس ابدی زندگی بخش دیتا تھا ۔ ایسا ہی ایک درخت قدیم ہندوؤں میں تھا جسے سوما یا سوم کہتے تھے اس کا رس بھی آبحیات تھا ۔ یہ درخت گویا شجرۃ الحیاۃ تھا ۔

چین والوں کے نزدیک سات طلسمی درخت تھے جن میں ایک شجرۃ الحیوۃ بھی تھا یہ ساتوں درخت کوہستان کوئن لوئن کے اطراف میں پیدا ہوتے تھے ۔ اہل چین کے نزدیک یہ کوہستان بہشت ارضی تھا ۔ جہاں سائی وانگ مو دیوی کی حکومت تھی یہ شجرۃ الحیوۃ دس ہزار ہاتھ لمبا تھا اور ایک ہزار ہاتھ اس کے تنہ کا دور تھا ۔ یہ جڑ سے چوٹی تک نیلم اور زمرد کا بنا ہوا تھا ۔ اس پر تین ہزار سال میں ایک مرتبہ پھل آتا تھا ۔ تاؤ مذہب والوں کے نزدیک یہ درخت شقتالو کا ہے اور اس مذہب

والوں کے نزدیک شادی بیاہ کا درخت ہے۔

قدیم دنیا کے تمام متبرک اور مقدس درختوں میں ملک آشوریہ کا ایک شجرۃ الحیوٰۃ بھی تھا۔ پروفیسر لیارڈ کا خیال ہے کہ یہ درخت ایشتار دیوی کی پرستش سے تعلق رکھتا تھا۔ آشوریہ درخت اور اس کی پوجا کا رواج ممالک عرب، وسط ایشیا ایشیائے کوچک اور ایران میں پہونچا۔

ممالک یورپ میں شاہ بلوط کے درخت کو متبرک سمجھا جاتا تھا جس کا باعث غالباً اس کی مضبوطی اور پائیداری ہوگا علاوہ ازیں اس کے پھل کی صورت بھی ایسی ہوتی ہے گویا مردانہ و زنانہ اعضاء جنسی کا اتصال ہے۔ قدیم یونانیوں کے نزدیک شاہ بلوط کا درخت شجرۃ الحیوٰۃ سمجھا جاتا تھا۔ انگلستان کی ڈروئڈ اقوام اس درخت کو بہت مقدس درخت خیال کرتی تھیں۔ شاہ بلوط کے جنگلوں ہی میں یہ لوگ اپنی پوجا پاٹ کے باغ بناتے تھے۔ اور یہی تقدس صنوبر کے درخت کو حاصل تھا۔ جو فصل بہار کے دیوتاؤں آتیس اور دیونسوس وغیرہ سے منسوب تھا۔ اس کا پھل بھی شاہ بلوط کے پھل سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں برگد اور پیپل کے درخت متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی مندر ایسا نہ ہوگا جہاں برگد یا پیپل کا درخت نہ ہو۔ ان کی شاخوں میں سے چونکہ دودھ نکلتا ہے اس لئے عورتیں ان درختوں کو خاص طور پر پوجتی ہیں۔

**بیل** | جو قومیں سورج کو پوجتی تھیں۔ یا پوجتی ہیں ان کے معتقدات میں بیل کو خاص تقدس حاصل ہے۔ بیل کو یہ لوگ افزائش نسل کا مظہر سمجھتی تھیں۔ اور اب بھی اس کی عزت کا سبب یہی خیال ہے۔ منطقۃ البروج میں بھی ایک برج

## ۷۴

بیل کی شکل کا فرض کیا گیا ہے جسے انگریزی میں "Taurus" کہتے ہیں۔ اس کا موسم فصل بہار میں اپریل سے ۲۰ مئی تک ہوتا ہے۔ اور یہی زمانہ جوش شہوانی کا ہے۔

بیل سے قدیم مذاہب کو خاص تعلق رہا ہے۔ مثلاً قدیم مصریوں کے ہاں آپیس بیل تھا جسے خداوند اوسیریز کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ یہودیوں میں گوسالۂ سامری کی روایت موجود ہے۔ آشوریوں کے مندروں میں پردار بیل بنائے جاتے تھے ہندوؤں میں مہادیو کا بیل نندا ابتک موجود ہے۔

آشوریوں کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کی نسل بیل ہی سے چلی ہے۔ جاپان میں سانڈ بیلوں کو بنظر احترام دیکھا جاتا ہے اور ہندوستان میں تو سانڈ بیل کو "راجہ" کہتے ہیں۔

قدیم مصریوں میں قوا مردانہ کو اوسیریز کہتے تھے اور اوسیریز کا اوتار آپیس بیل کو سمجھا جاتا تھا۔ اوسیریز کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ وہ ایک بچھیا کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے جسے چاند کی شعاع مخروطی یا بجلی کی چمک نے حاملہ کر دیا تھا۔

جب آپیس بیل مرجاتا تھا تو پجاری لوگ ملک بھر میں تلاش کر کے دوسرے بیل کا اسی طرح انتخاب کر لیتے تھے۔ شناخت کی چند خاص علامتیں ہوتی تھیں یعنی بیل کا رنگ سیاہ ہونا چاہیئے پیشانی پر سفید رنگ کا ایک مثلثی ٹیکا (علامت) ہونا چاہیئے۔ پہلو میں ایک سفید رنگ کا ہلال (علامت زن) ہونا چاہیئے اور زبان کے نیچے کن سلائی کی وضع کی ایک سوئی ہونی چاہیئے۔

جب آپیس بیل مرجاتا تھا تو یہ اعتقاد کیا جاتا تھا کہ اس نے اپنا آسمانی چولا

۷۵

اختیار کرلیا ہے یعنی اوسیرز بنگیا ہے ۔ اس کے بعد اپیس کی لاش کو حنوط کر کے بہت کچھ اظہار رنج و غم کے بعد ایک مقبرہ میں رکھدیا جاتا تھا ۔ بعد ازاں دوسرا اپیس نہایت شان و شوکت کے ساتھ لایا جاتا تھا ۔ عرصہ تک خاص خاص رسمیں ادا کی جاتی تھیں ۔ اول چالیس روز تک صرف عورتیں ہی اسے دیکھ سکتی تھیں اور وہی اس کی خدمت اور پرورش کرتی تھیں ۔ یہ حرکتیں مصر میں بہت ہوتی تھیں ۔

**بکرا** مصر کی عورتیں صرف اپیس سانڈ ہی سے نہیں بلکہ مندیس کے مقدس بکرے کی طرف بھی یہی خیال رکھتی تھیں ۔ توریت کتاب احبار میں اس رواج کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے : ۔ "نہ تو کسی جانور کے ساتھ سوئیگا تاکہ خود کو اس کے ساتھ ناپاک کرے ۔ اور نہ کوئی عورت کسی جانور کے نیچے لیٹے گی یہ بات خراب ہے" قدیم آشوریوں میں بھی بکرے کو بنظر احترام دیکھا جاتا تھا کیونکہ وہ لوگ اس جانور کو قوت نفسانی کا مجسمہ سمجھتے تھے اور عورتیں معبدوں میں نہایت حیا سوز حرکات کی مرتکب ہوتی تھیں ۔

**گائے** گائے کو قدیم اقوام میں دسہرتی ماتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا جس طرح بیل مرد کی علامت ہے اسی طرح گائے عورت کی نشانی ہے ۔ گائے کا احترام مشرق کے تقریباً تمام ممالک میں کیا جاتا تھا ۔ مصر میں گائے ہاتور ۔ نوت ۔ آئسیس نفتیس اور دیگر معبودہ قدرت سے منسوب تھی ۔ ہندوستان میں اس کی پوجا ابتک ہوتی ہے ۔

**کچھوا** قدیم اقوام میں کچھوا بھی ایک خاص اہمیت رکھتا تھا ۔ کچھوے کی بہت

۷۶

جو عضو جنسی سے ہے وہ دراصل اس کی گردن میں ہے۔ قدیم یونانیوں میں اسی مشابہت کی وجہ سے کچھوے کو عشق و محبت کی دیوی وینس سے منسوب کیا جاتا تھا۔ قدیم یونانی فنون لطیفہ میں بعض اوقات وینس دیوی کو کچھوے کی پشت پر استادہ دکھایا جاتا ہے۔ قدیم مصریوں میں بھی کچھوے کو افزائش نسل کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے قدیم ہندوؤں، جاپانیوں اور امریکیوں میں کچھوے کا دخل تکوین کائنات میں بھی مانا جاتا ہے۔ مثلاً ہندو روایات میں ہاتھی کو جس کی پشت پر دنیا قائم ہے ایک کچھوے کی پشت پر استادہ دکھایا جاتا ہے۔ اور جاپانیوں میں کچھوے کی پشت پر دیوتاؤں کا مسکن بتایا جاتا ہے جس کا مرکز ایک پہاڑ ہوتا ہے۔

امریکہ کی قدیم سنیکا کا یہ اعتقاد تھا کہ "مادر فلک" کا جب ہبوط ہوا تو وہ ایک آبشار پر گری آبشار نے اس کو ایک کچھوے کی پشت پر سوار کر دیا۔ امریکن قوم دلاویر میں ایک روایت ہے کہ "دنیا کا مرکزی درخت" ایک کچھوے کی پشت سے اُگا تھا چینیوں کے روایات قدیمہ میں بھی کچھوے کو بہت کچھ دخل ہے

**بلی** مصر قدیم میں بلی کی بھی پوجا ہوتی تھی اور اُسے سورج کا نمائندہ خیال کیا جاتا تھا کیونکہ بلی کی آنکھوں میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کا رنگ سورج کے عروج و زوال کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ جانور عادتاً شب گرد ہے اور چوری چھپے اپنا کام کر جاتا ہے۔ اور رات ہی کے وقت عشق و محبت کے رازو نیاز ہوتے ہیں۔ اس لئے اس جانور کو جذبات شہوانی کا مظہر قرار دیا گیا۔

: ۷۷

مصریوں میں باست ایک گربہ نما دیوی تھی جس کے رتھ میں بلیاں جوتی جاتی تھیں۔ جب کبھی کوئی بلی مرتی تھی تو اس کی لاش کو حنوط کر کے ایک بکس میں محفوظ رکھ دیا جاتا تھا اور جو شخص کسی بلی کو مارڈالتا تھا اُسے سزائے موت دیجاتی تھی۔

**شیر** جن اقوام میں سورج کی پرستش ہوتی تھی ان میں شیر کو بھی بنظر احترام دیکھا جاتا تھا جس کا باعث وہی ہے جو بلی کے بارہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں شیر کو سورج کی حرارت سے منسوب کیا جاتا تھا۔ شیر کا قد و قامت چونکہ شاندار ہوتا ہے، اس کی رفتار میں ایک خاص دلفریبی ہوتی ہے اور قوت جسمانی کے لحاظ سے وہ تمام حیوانات پر فوقیت رکھتا ہے اسلئے قدمائے اُسے طاقت مردمی کا مجسمہ قرار دیا۔ اسی لئے قدیم مندروں کے دروازوں پر شیروں کی صورت تعمیر کیجاتی تھی۔ اور ہندوستان کے مندروں میں اب بھی شیروں کے مجسمے دیکھے جا سکتے ہیں۔

**ابوالہول** سب سے زیادہ عجیب و غریب اور دلچسپ چیز مصری ابوالہول ہے۔ اس عجیب الخلقت جانور کا سر اور چہرہ تو ایک خوبصورت عورت کا ہوتا ہے لیکن باقی تمام جسم شیر کا بنایا جاتا ہے گویا اس میں زنانہ اور مردانہ دونوں قوتیں موجود ہیں ابوالہول کے بت میں ایک دلچسپ استعارہ یہ بھی ہے کہ عورت ایسی چیز نہیں ہے جسکے پھندے میں پھنس کر کوئی جان بچالے جائے۔ کیونکہ وہ اپنی جمیل صورت سے فریفتہ کر کے انسان کو شیر کی طرح پھاڑ ڈالتی ہے

۷۸

# فحاشی پر عمومی تبصرہ

**محافل نشاط** جن حضرات نے ارتقاء تہذیب و تمدن پر نظر ڈالی ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ جوں جوں انسان کا روایتی اخلاق، احساس مہ و مشرب، اور سوسائٹی کا آئین ترقی پاتا گیا اسی قدر انسان میں جذبۂ زہد و اتقاء بھی بڑھتا گیا۔ لیکن جب اس کا ردِ عمل ہوا تو پھر اسی مذہب سے رواج فحاشی کا کام لیا گیا۔ اور محافل عیش و نشاط پر تقدس کا رنگ چڑھا کر ان کو جائز و مباح قرار دیا گیا انگریزی زبان میں اس قسم کی محافل شبینہ کو "اورجی" (Orgy) کہتے ہیں۔

لفظ "اورجی" درحقیقت یونانی زبان کے لفظ "اورجیا" (Orgeia) سے مشتق ہے جس سے مراد قدیم یونان کا وہ جشن ہے جو شراب کے دیوتا کی یادگار میں منایا جاتا تھا۔ اس جشن میں اس دیوتا کی سوانح حیات کا کوئی واقعہ منتخب کر کے بطور تمثیل دکھایا جاتا تھا۔ اور نوشانوش کے ساتھ ایسا زبردست ناچ ہوتا تھا کہ لوگ آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں لوگ اپنی خواہشات نفسانی بھی پوری کر لیتے تھے۔

---

اسی طرح ہندوستان میں سری کرشن جی مہاراج اور برج کی گوپیوں کی رنگ رلیاں بطور تمثیل عموماً دکھائی جاتی ہیں۔ جن کو رہس کہتے ہیں اس میں بھنگ، چرس، گانجہ کا استعمال ہوتا ہے اور ناچ گانے کی آزاد

محفلیں برپا کیجاتی ہیں۔ اگرچہ ان تماشوں کا اصل مقصد تعمیر سیرت تھا لیکن بعد کو خواہشات نفسانی کا عنصر بھی ان میں شامل کر دیا گیا۔

اسی طرح مسیحیت میں بھی یہ رہس لیلا پائی جاتی تھی جس میں حضرت مسیحؑ یا دیگر اکابر مذہب کے سوانح حیات میں سے کوئی واقعہ چنکر بطور تمثیل دکھاتے تھے۔ مسیحی دنیا میں یہ محافل عیش و نشاط عموماً خانقاہوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جن میں بڑے بڑے راہبان مرتاض اور بڑی بڑی پاکدامن "مسیح کی مرلیاں" (Nuns.) شریک ہوا کرتی تھیں۔ چنگ و ارغنوں کے ساتھ دور بادۂ ناب چلتا تھا اور خوب خوب خوش فعلیاں ہوتی تھیں یہ سب باتیں اس زمانہ کی "باقیات" سے تھیں جب تمام یورپ شرک و بت پرستی کی تاریکی میں مبتلا تھا۔

**عید الحمقاء** ۷۴۳ء میں بمقام "ہینالٹ" کلیسائے مقدس کے علماء کا اجلاس ہوا جسے سناڈ کہتے تھے اس میں یہ بات پیش کی گئی کہ "فروری" میں جو "اورجی" ہوتی ہے اسے بند کیا جائے کیونکہ وہ زمانۂ بت پرستی کی یادگار ہے۔ لیکن یہی "بت پرستوں کی عید" کلیسائے مسیحی کی مقدس ترین عید کارنوال میں شامل کر لی گئی جو مسیحی تہوار لینٹ کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس تہوار کے شروع ہونے سے قبل جو منگل واقع ہوتا تھا اس دن اور اسکے بعد والے اتوار کو عیسائیوں کی بڑی بڑی محافل عیش و نشاط برپا ہوتی تھیں، جن میں ہر طبقہ کے لوگ شرکت کرتے تھے۔ اور آزادی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بعض آدمی بیحیائی سے خوش غلاف ہو کر چلتے پھرتے تھے۔

بعض جانوروں کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں کے بل نقل وحرکت کرتے تھے اور بعض بالکل حیوان مطلق بنجاتے تھے۔"

بارھویں صدی میں یورپ میں عموماً اور فرانس میں خصوصاً بسلسلۂ عید نوروز ایک عید الحمقاء قائم ہوئی۔ جسے انگریزی میں (Feast of fools) کہتے تھے۔ اس تقریب میں تمام مسیحی دنیا حد درجہ بیہودگیوں کا اظہار کیا کرتی تھی۔ جس میں سب سے زیادہ حصہ مقدس پادری لیتے تھے۔

## قدیم یونانیوں ورومیوں کا خیال

قدیم یونانیوں اور رومیوں نے اس خیال کو اکثر جگہ ظاہر کیا ہے کہ مسلسل محنت اور زہد واتقاء کے بعد انسان کو کبھی کبھی "غم غلط" کرنا چاہیئے چنانچہ نیشچے (Nietzsche) نے قدیم یونانیوں کی نسبت بالکل صحیح کہا ہے کہ وہ لوگ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو پوری طرح تسلیم کرتے تھے خواہ ان میں بعض کتنے ہی ادنیٰ درجہ کے کیوں نہ ہوں اور اسی لئے وہ ایسا انتظام کر لیا کرتے تھے کہ کسی خاص دن، خاص رسوم کے ساتھ جذبات کو آزاد چھوڑ دیتے۔

حکیم (Seneca) نے جو رومی معلمین اخلاق میں سب سے زیادہ صاحب اثر شخص تھا یہانتک سفارش کی ہے کہ انسان کو کبھی کبھی بدمست بھی ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ حکیم صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ:۔

"کبھی کبھی ہمیں اتنی شراب پی لینی چاہیئے کہ سر و پا کا ہوش نہ رہے کیونکہ شراب ہمارے آلام وافکار کو دھو دیتی ہے۔ اور ہم کو عمیق ترین گہرائیوں سے

ابھار کر مسرت و شادمانی کی سطح پر لے آتی ہے۔ شراب کے موجد کا نام لائبر (Liber) ہے کیونکہ وہ انسان کی روح کو تفکرات کی قید سے آزاد کر دیتا ہے۔ غلامی کے طوق و سلاسل توڑ دیتا ہے۔ نئی روح پیدا کرتا ہے اور ہم کو تمام کاموں کے لئے پوری طرح دلیر بنا دیتا ہے۔"

روم والے بھی یونانیوں کے شاگرد تھے۔ اور ان لوگوں نے بھی اس بات کی ضرورت محسوس کی تھی کہ جذبات و خواہشات کو کبھی کبھی نکلنے کا موقعہ دینا چاہیئے۔ لہذا انھوں نے بھی اپنے یہاں بعض ایسے تہوار قائم کر لئے تھے جن میں انسان کی خواہشات نفسانی کو بالکل آزادی دیدی جاتی تھی۔

## وحشی اقوام کی رنگ رلیاں

دنیا کی کوئی قوم خواہ وہ کتنی ہی وحشی و پست ہو، ایسی نہیں جس میں وقتاً فوقتاً یا مقررہ اوقات پر رنگ رلیاں منانے کی ضرورت کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ اسپنسر اور گلن نے اپنی کتاب "وسطی آسٹریلیا کی شمالی قومیں" کے باب دوازدہم میں لکھا ہے کہ وسطی آسٹریلیا کی واڈا مونگا قوم میں ایک تہوار ہوتا ہے جسے وہ لوگ ناتھ اگورنکیتے ہیں۔ اس تہوار میں لوگ آگ سے کھیلتے ہیں اور بعض عجیب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ یہ تہوار بالکل ویسا ہی ہے جیسا رومیوں میں "سیٹرنیلیا" ہوتا تھا یا ہندوؤں میں ہولی کی ڈنڈی ہوتی ہے۔ اس میں تہذیب و اخلاق کے تمام آئین و قوانین اٹھا کر بالائے طاق

---

لہ اسی سے انگریزی لفظ (Saturnalia) بنا ہے جسکے معنی عیاش و فحاش کے ہیں

رکھ دیئے جاتے ہیں۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ اور لوگوں کو نوشانوش اور کوشاکوش کے سوا اور کوئی شغل نہیں ہوتا۔

ہل ٹاؤٹ نے "جرنل اینتھروپولاجیکل انسٹی ٹیوٹ" بابت جولائی و دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۲۹ میں لکھا ہے کہ برطانوی کولمبیا کی امریکی قوم سالش بیان کرتی ہے کہ یوروپینوں کے آنے سے قبل ان کے آبا و اجداد ہفتہ میں ایک روز یوم السبت[1] یعنی آرام و آسائش کا دن منایا کرتے تھے۔ اس روز وہ دنیا کا کوئی کام نہیں کرتے تھے اور صبح سے لیکر دوپہر تک مذہبی ناچ رنگ میں مصروف رہتے تھے۔

اے۔ ای کرالی نے اپنی کتاب "پراسرار گلاب" (Mystic rose) میں لکھا ہے کہ مختلف اقوام میں رنگ رلیوں کے لئے جو دن مخصوص کر دیئے جاتے تھے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ انسان پرانا بوجھ اتار کے ہلکا ہو جائے اور دنیا میں از سر نو کام کرنے لگے۔ بعض ملکوں میں لوگ یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ ایسے تہواروں پر اپنی بیویاں تک بدل لیتے ہیں۔ اس کا مقصد شادی بیاہ نہیں ہوتا بلکہ قانون ازدواج کو توڑنا ہوتا ہے۔ اور یہ تبدیلی

---

[1] یوم السبت = آرام و آسائش کا دن۔ دنیا کی تقریباً تمام متمدن و مہذب اقوام میں ایک دن ہفتہ کے اندر یوم السبت مقرر ہے یا تھا۔ مثلاً یہودیوں میں ہفتہ، عیسائیوں میں اتوار، قدیم یونانیوں میں دوشنبہ، قدیم ایرانیوں میں سہ شنبہ۔ آسٹریلیا والوں میں چہارشنبہ۔ قدیم مصریوں میں جمعرات اور مسلمانوں میں جمعہ۔ یوم السبت کو عیش و عشرت سے خاص تعلق ہے۔ دکن کے مسلمانوں میں شادی کے بعد جب پہلا جمعہ آتا ہے تو دلہن "جمعہ نہانے" اپنے میکے جاتی ہے۔ گویا یوم السبت کی رات عیش زنانہ کی خاص شب ہے۔ عیسائیوں میں بھی سنیچر کی رات کو کولڈن نائٹ یعنی سنہری رات کہتے ہیں

دوای نہیں بلکہ عارضی ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اور بھی معمولی رشتے توڑ دیئے جاتے ہیں۔ حرام و حلال کی کوئی تفریق باقی نہیں رہتی۔ اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ زندگی از سرِ نو شروع کی جائے۔

مندرجہ بالا حالات سے ناظرین کرام پر روشن ہوگیا ہوگا کہ انسان نے تقاضائے فطرت سے مجبور ہو کر اپنی خواہشات و جذبات کی رعایت کس کس طریق سے کی اور اپنی عیش رانیوں پر مذہبی رنگ چڑھا کر کسطرح ان کو جائز و مباح کر لیا۔

مگر اب "مقدس عیش رانیوں" کی جگہ "مہذب عیش رانیوں" نے لے لی ہے۔ تھیٹر۔ سینما۔ ناچ گھر۔ خرابات۔ قمار خانے وغیرہ سب اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ قحبگی ایک باقاعدہ ادارہ بنگیا ہے۔ کھیل تماشوں میں زن و مرد شریک ہو کر ہیجان انگیز تصویریں اور تماشے دیکھتے ہیں۔ قہوہ خانوں میں شراب و کباب کے بعد پوری آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ "محافل شبینہ" (Night Club) جگہ جگہ بنگئے ہیں۔ اور اس لئے اب قدیم "اوجیا" کی کسی شخص کو ضرورت نہیں رہی۔

## عصمت فروشی وحشی اقوام میں

باقاعدہ اور پیشہ ور عصمت فروشی کی ابتدا معلوم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ابتدائی قسم کی عصمت فروشی جو پیشہ کی صورت نہیں رکھتی وحشی یا نیم وحشی اقوام و ملل میں بھی اکثر دیکھی گئی ہے۔ مثلاً کوئی مرد کسی عورت کو کوئی چیز بطور تحفہ دیتا ہے تاکہ وہ اس کی معیت کا لطف حاصل کرے۔ ہر چند

یہ ایک قسم کی حرامکاری ہے مگر عصمت فروشی کے درجہ تک نہیں پہونچتی۔ کیونکہ وہ تحفہ یا نذرانہ کوئی اجرت نہیں سمجھی جاتی بلکہ عارضی تعلقات کی ابتدا شمار کی جاتی ہے۔ اور وہ عورت اس مرد کو متمتع کرنے کے بعد بھی اپنی مجلسی وقعت و منزلت کم و بیش برقرار رکھتی ہے۔ اور ایسا نہیں ہوتا کہ اسکے لئے وجہ معاش کے تمام دروازے بند ہو جائیں اور وہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بیان کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ جب کپتان کوک کا جہاز جزائر نیوزیلینڈ پہونچا تو جہازران جو عرصہ دراز سے بحر و بر دیکھے یہ معلوم کر کے خوش ہوئے کہ جزائر کی عورتیں ان کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ اور انکے شرائط بہت معقول ہیں اور بالکل ویسے ہی ہیں جیسے مہذب لوگوں میں شادی کے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کے عارضی معاہدۂ ازدواج میں کوئی شائبۂ معصیت نہیں تھا۔ صرف اسقدر ضرورت تھی کہ عورت کے سرپرست سے اجازت حاصل کر لی جائے اور تکمیل معاہدہ کے بعد اس "عروس یک شبہ" (Bridal a night) کے ساتھ ویسا ہی باعزت برتاؤ کیا جائے جیسا مہذب و متمدن اقوام میں اپنی بیویوں سے کیا جاتا ہے

بیان کیا جاتا ہے کہ بحرالکاہل کے بعض جزائر میں کبھی کبھی عورتیں پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ بدچلنی کی وجہ سے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ان عورتوں سے نفرت و حقارت نہیں کی جاتی۔ بلکہ اگر وہ اپنے پیشہ میں دولت جمع کر لیتی ہیں تو معزز آدمی ان سے نکاح

کر لیتے ہیں ۔ اس کے بعد ان کے سابق چال چلن یا پیشہ کی نسبت کسی قسم کا اشارہ کرنا بھی برا سمجھا جاتا ہے ۔

اگر پست اور وحشی قوموں میں اول اول ایسی عورتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ تو بسا اوقات انھیں ذلت و حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا جس کا باعث یہ ہے کہ ان اقوام میں ابھی تک پاکدامنی اور حفظ عصمت کا خیال پیدا نہیں ہوا ۔ مثلاً ڈاکٹر شورٹز نے بحوالہ ایک عرب جغرافیہ داں کے یوروپ کی سلافی قوم کی نسبت حسب ذیل دلچسپ معلومات حاصل کی ہیں کہ اگر اس قوم میں کوئی جوان لڑکی کسی مرد پر عاشق ہو جاتی ہے تو وہ اس کے پاس جا کر اپنی خواہش پوری کر لیتی ہے اور اسکو مطلق برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ برعکس اسکے اگر شادی کے بعد کوئی مرد اپنی بیوی کی دوشیزگی کو سلامت پاتا ہے تو وہ اسے گھر سے باہر نکال دیتا ہے ۔ یا اگر نہیں نکالتا تو بہت ذلت کے ساتھ رکھتا ہے ۔

بعض قوموں میں نوجوان لڑکیاں ان تحائف کو جو ان کے عشاق پیش کرتے ہیں نہایت فخر کے ساتھ لیتی ہیں ۔ اور جب ان کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ ان تحائف کو بھی اپنے ساتھ لیجاتی ہیں ۔ اور سمجھتی ہیں کہ جس قدر ایسے تحائف زیادہ ہوں گے اتنی ہی اس کی قدر و منزلت شوہر کے گھر میں زیادہ ہوگی ۔ سلافی قوم کے مندرجہ بالا رواج کی تصدیق ڈاکٹر کراوش نے بھی کی ہے ۔

وحشی اقوام میں شادی سے قبل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلقات شہوانی بہت آزادی کے ساتھ ہوتے ہیں اور بعض خاص تہواروں اور

تقریبوں میں کوئی روک ٹوک ہوتی ہی نہیں۔ لیکن ان وحشیوں میں پیشہ ور کسبیاں ہرگز نہیں ہوتیں۔ اگر نی زمانا وحشی عورتیں نفس فروشی کرتی ہیں یا ان کے شوہر انھیں فروخت کر ڈالتے ہیں تو یہ صرف جدید تہذیب و تمدن کا اثر ہے۔

**مقدس مباشرت** ڈاکٹر شورٹز کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جس قوم میں نوجوانوں کے آزادانہ اختلاط وارتباط میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی اور اس کے ساتھ جلد شادی کرنے کا بھی کوئی انتظام نہ ہوگا اس قوم میں عصمت فروشی لازمی طور پر پیدا ہوگی۔ اور حفظ نفس کے مختلف طریقے پیدا ہو جائیں گے۔

ماہرین اور محققین نے جہاں تک تحقیق کی ہے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس فعل کی ابتدا مذہب کی آڑ میں ہوئی۔ پانچویں صدی قبل مسیح کی کیفیت یونان کے مشہور و معروف مورخ و سیاح ہیرو ڈوٹس نے جو کچھ بیان کی ہے اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

اور اس بیان کی تصدیق ان لوگوں نے بھی کی ہے جنھوں نے بابلی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ بابلی آثار قدیمہ سے ایک لوح برآمد ہوئی ہے۔ جس پر ایک رزمیہ نظم بنام جلجامش کندہ ہے۔ پروفیسر ماریس جسٹراؤ نے اس لوح کا مطالعہ کرکے بیان کیا ہے کہ شہر اروک یا ایریخ میں استار دیوی کا جو مندر تھا اس میں کثرت سے عورتیں موجود رہتی تھیں

اسی قسم کا رواج ایشیا کے دیگر حصص، شمالی افریقہ

مغربی افریقہ[1] - جزیرہ قبرص - بحر روم کے دیگر جزائر اور مصر و یونان[2] وغیرہ میں بھی پایا جاتا تھا - یونان کے شہر کورنتھ کے قلعہ میں آفرودیتہ دیوی کا ایک مندر تھا جس میں ایک ہزار سے زیادہ "مرلیان" یا "مقدس اچھوتیاں" مندر کی خدمت کے لئے رہا کرتی تھیں - اور بقول مورخ استرابو جن لوگوں کو دیوی کے مندر میں کوئی منت ماننا ہوتی تھی وہ ان عورتوں کے تمام نخرے برداشت کرتے تھے - اور لطف یہ ہے کہ لوگ ان کو عام طور پر بہت نیک اور پارسا بھی سمجھتے تھے - اور ہر قومی مصیبت کے وقت ان سے دعائیں کراتے تھے -

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ قبل تاریخ سے جو آزادی چلی آتی تھی اُسے مذہب کی آڑ میں قائم رکھا گیا اور پھر عوام کے دلوں میں رفتہ رفتہ یہ خیال جاگزین ہو گیا کہ مرد عورت کا مندروں کے اندر تعلقات شہوانی

---

[1] اے - بی - ایلس (A.B. Ellis) نے اپنی کتاب (The Ewe speaking people of S. Africa) میں لکھا ہے کہ جو لڑکیاں کسی دیوتا کے نام سے منسوب کر دی جاتی تھیں وہ جوان ہو کر "پنچائتی" عورتیں بنجاتی تھیں - اسی طرح ڈبلو - جی سمر (W.G. Summer) نے اپنی کتاب (Folk ways.) باب ۱۶ میں بہت سے واقعات مذہبی عصمت فروشی کے لکھے ہیں - [2] فلنڈرس پیٹری (Flinder petrie) نے اپنی کتاب "قصص المصر" میں لکھا ہے کہ قدیم مصریوں میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی عورت کسی مرد پر عاشق ہو جاتی تھی تو وہ اسے اپنے کپڑے بھیجکر "دعوت" دیتی تھی - خواہ وہ زن شوہر دار ہو یا کنواری - رفتہ رفتہ یہ رواج موقوف کر دیا گیا لیکن باینہمہ آمن (Amen) دیوتا کی داسیوں نے دیوتا کے زیر سایہ اپنا یہ طریقہ قائم رکھا

قائم رکھنا خود دیوتا یا دیوی کی خدمت اور ان کی خوشنودی مزاج کا باعث ہے۔ عورتیں چونکہ سریع الاعتقاد ہوتی ہیں اس لئے ان میں عام طور پر یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ دیوتا یا دیوی کے استھان میں پجاریوں یا اور مردوں سے اختلاط رکھنا ثواب کا کام ہے۔ یہی باعث تھا کہ دنیا کے تمام وحشی ممالک میں عموماً اور مغربی ایشیاء میں خصوصاً مذہبی عمارتوں کے اندر "مقدس عصمت فروشی" کا سلسلہ جاری تھا۔

ڈاکٹر ایف۔ ایس۔ کراؤش[1] نے لکھا ہے کہ بروچ کے زمانہ میں جو ہیرو ڈوٹس کے بعد گذرا ہے مذہبی فحاشی درختوں کے نیچے ہوا کرتی تھی۔ اور ڈاکٹر جے۔ جی۔ فریزر نے اپنی مشہور کتاب (Adonis Attis Osiris) میں اس کا عقیدہ اور اسکے اسباب حسب ذیل بیان کئے ہیں:۔

"جملہ حالات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ایک "مہادیوی ماتا" جو قدرت کے تمام قوائے تخلیقیہ کی حامل تھی، اس کی پرستش مختلف ممالک میں مختلف ناموں سے کی جاتی تھی۔ اور تمام مغربی ایشیاء کی مختلف اقوام میں اس دیوی کے متعلق قریب قریب یکساں روایات اور یکساں رسوم پرستش جاری تھے۔ ان قدیم روایات میں اس دیوی کا تعلق کسی خاص عاشق یا متعدد عشاق سے بتایا جاتا تھا۔ یہ عاشق یا عشاق عموماً دیوتا مگر فانی ہوتے تھے۔ وہ دیوی ہر سال ان عشاق سے

(1) Dr F. S. Krauss ("Beischlafensübung als Kulthandlung" Anthropophyteia vol III. p.20)

مواصلت کرتی تھی ۔ اور ان کی یہ مواصلت انسانی وحیوانی افزائش نسل اور شادابی فصل کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی ۔ بعد میں ان آسمانی عاشق ومعشوق کی مواصلت کا کھیل دنیا میں بھی کھیلا جانے لگا ۔ یعنی لوگ دیوی کے استھان میں جاکر خود حرامکاریاں کرنے لگے اور عقیدہ وہی تھا کہ ان کی ان سیہ کاریوں سے اولاد پیدا ہوگی ۔ مویشیوں کی نسل بڑھے گی اور فصل خوب پیدا ہوگی ۔ مدت دراز کے بعد جب لوگوں کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی ۔ اور انفرادی شادی ونکاح کا رواج بڑھنے لگا ۔ اور اشتراک فی النسواں کا طریقہ برا سمجھا جانے لگا تو عورت کا عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی کسی غیر مرد سے اختلاط مذموم شمار ہونے لگا ۔ بالآخر لوگوں نے اس فحاشی سے اپنی عورتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بہت سے انسدادی طریقے اختیار کئے جس سے وہ عملی کیفیت تو جاتی رہی لیکن عقیدہ بدستور قائم رہا ۔ اور عورتیں مندروں میں جاکر فرضی رسمیں مواصلت کی ادا کرتی رہیں ۔ مگر چونکہ پرانی عادتیں بہت مشکل سے چھوٹتی ہیں اور مردوں کو رنگ رلیوں کا چسکا پڑا ہوا تھا اسلئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ عورتوں کی ایک تعداد پرانے طریقے پر مقدس عصمت فروشی کرتی رہے ۔ چنانچہ لڑکیاں وقتاً فوقتاً دیوتا یا دیوی کے نام سے منسوب کرکے مندروں پر چڑھائی جاتی رہیں ۔ جو زندگی بھر یا کچھ عرصہ کے لئے فحاشی میں مصروف رہتی تھیں ۔ اور چونکہ یہ عورتیں دیوتا یا دیوی کے نام سے منسوب ہوتی تھیں اسلئے ان میں ایک قسم کا تقدس سا پیدا ہوگیا مختلف ممالک میں ان عورتوں کے مختلف نام تھے

۹۰

نویان میں "ہائروڈیول" (Hierodules) کہلاتی تھیں۔
روما میں ان کا نام "وستا کی کنواریاں" (Vestal Virgins)
تھا۔ بابل میں یہ "کادشتو" (Kadishtu) کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔
جنوبی ہند میں یہ "دوشیزگان مقدس" دیوداسیاں اور مرلیاں کہلائیں۔
اور مسیحی دنیا میں "نن" (Nun) ہوگئیں۔

جب امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مذہبی رہنماؤں کا اثر زیادہ قوی ہوگیا۔
تو انھوں نے یہ دیکھکر کہ لوگ عام طور پر اس سے متنفر ہوتے جاتے ہیں یہ تبلیغ
شروع کی کہ جو شخص دیوتا یا دیوی کے استھان پر کوئی چیز چڑھا دیتا ہے خواہ
وہ عصمت وعفت ہی کیوں نہ ہو اس کو بہت نفع ہوتا ہے۔ اور عورت کی
قوت "بچہ کشی" بہت بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر ویسٹر مارک (Westermark)
نے بھی یہی توجیہ کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جو مرد مندر میں
کسی عورت کی گود میں سکہ پھینکتا تھا وہ یہ الفاظ کہتا تھا: "دیوی تمھیں
برکت دے اور تم پر مہربان ہو" ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا
مقصد یہی ہوتا تھا کہ وہ بانجھ نہ رہے اور دیوی اسے خوب اولاد دے۔

اہل بابل کی اسی رسم کے متعلق فارنیل کا یہ نظریہ ہے کہ بعض قدیم
اقوام میں یہ عقیدہ تھا کہ جو شخص دوشیزہ سے ملتفت ہوتا تو جو ارواح خبیثہ
اس عورت پر عاشق ہوتی ہیں وہ اس مرد کو ستاتی ہیں۔ چنانچہ اہل بابل
کی عورتیں اپنے شوہروں کو ارواح خبیثہ کے خراب اثر سے محفوظ رکھنے کیلئے
اجنبی مردوں سے مل لیا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس نامعقول حرکت

سے ان لوگوں میں عورتوں کی قدر و منزلت بھی بڑھ جاتی تھی۔ کیونکہ جو عورتیں مندر میں جاکر اسی مقصد خاص سے بیٹھتی تھیں اور انھیں کوئی مرد نہیں پوچھتا تھا تو سوسائٹی میں ایسی عورتوں کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

واضح ہو کہ جس طرح بقول ہیروڈوٹس بلیطہ دیوی کے مندر میں یہ رواج قائم تھا تقریباً اسی عقیدہ کے ساتھ ملک مصر میں عورتیں ایک خاص رسم ادا کیا کرتی تھیں۔ مصری عورتوں میں یہ عقیدہ تھا کہ دیوتا، یا اس کے نائب یا دیوتا کی مورتی سے چھوا جانا باعث خیر و برکت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کام کے لئے مندر کے اندر ایک مقدس بکرا پالا جاتا تھا۔ جو پان[1] دیوتا (Pan) کا مظہر تھا۔ عقیدتمند عورتیں مندر میں جاکر اس بکرے کی خوب خدمت کرتیں۔ پجاریوں کی تحائف دیتیں۔ برہنہ ہو کر اس بکرے کے سامنے چوپایہ کی طرح اپنے آپ کو پیش کر دیتیں

ایسی ہی رسم قدیم رومیوں میں بھی تھی۔ رومی عورتوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ دیوتا کے التفات سے آسمانی خیر و برکت نازل ہوتی ہے اسی خیال سے رومی عورتیں پریاپس (Priapus) (ممکن ہے یہی دیوتا ہندوؤں میں پرجاپتی کے نام سے مشہور ہو گیا ہو)

---

[1] ملاحظہ ہو ہیروڈوطس جلد دوم باب ۴۶۔ پان دیوتا در حقیقت گڈریوں۔ شکاریوں اور زراعت پیشہ دیہاتیوں کا دیوتا تھا۔ یہ مرکری کے نطفہ اور پینی لوپ کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اسکے بت کے سر پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ چپٹی سی ناک اور جسم زیریں بکرے کا سا بنایا جاتا تھا۔

[2] ملاحظہ ہو سینٹ آگسٹائین کی کتاب "De Civitate Dei. Book VII"

کے بت کی پوجا کیا کرتی تھیں جبکا عضو مخصوص بحالت آمادگی بنایا جاتا تھا۔ رومیوں کی بڑی بوڑھیاں نوعروس کو مندر میں لیجاکر پریاپس کے اس عضو پر بٹھادیتی تھیں

## شادی کا خرچ اور جہیز

مدت مدید گذر جانے پر بھی یونان کے مندروں میں مقدس کسبیاں موجود رہیں۔ کورنتھ کے مندر میں وینس کی داسیاں عرصہ تک پائی جاتی تھیں، اور جبتک ان مقدس سیہ کاروں کا تعلق مندر سے رہا لوگ ان کی عزت و وقعت کرتے رہے۔ مگر بعد کو انھوں نے حرامکاری کا پیشہ اختیار کرلیا۔ جن مندروں میں یہ داسیاں رہتی تھیں وہ عموماً بندرگاہوں، جزیروں، اور بڑے بڑے شہروں میں ہوتے تھے۔ جو عام طور سے اجنبی سوداگروں اور ملاحوں کے آماجگاہ بنے رہتے تھے۔ جزیرۂ قبرص میں یہ داسیاں ایک طرف تو دیوی کے استھان کی دیکھ بھال کرتی تھیں، مورتی کے سامنے بخور جلاتی تھیں اور بھجن بھی گاتی تھیں لیکن اس کے علاوہ بقول پنڈار Pindar "یہ نوجوان عورتیں اجنبیوں کی آؤ بھگت اور ان کی میزبانی بھی کرتی تھیں" گویا مندر کی خدمت کے ساتھ ساتھ یہ عورتیں ان مردوں کی ضرورتیں بھی رفع کردیتی تھیں جو اپنے گھروں سے دور ہوتے تھے۔

ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ و سیاحت نامہ جلد دوم باب ۹۳ میں ملک لیڈیا (Lydia) کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں کی نوجوان اور نوخیز لڑکیاں اپنے آپ کو مردوں کے حوالہ کردیتی ہیں تاکہ شادی کا خرچ اور جہیز

کے مصارف نکال سکیں ۔ اس رواج کی نسبت ڈاکٹر فریزر تحریر کرتے ہیں کہ غالباً یہ طریقہ فحش "مذہبی فحاشی" سے پیدا ہوا تھا ۔ اور اس خیال کی تائید اس واقعہ سے بھی کچھ کچھ ہوتی ہے کہ جب رومی شہنشاہ جسٹینین جزیرہ قبرص میں گیا تو اسوقت یہ معلوم ہوا کہ مندر کی داسیوں کو جو رقم اجنبیوں کی طرف سے وصول ہوتی ہے وہ دیبی کی قربانگاہ پر نہیں چڑھائی جاتی بلکہ ایک بڑے صندوق میں رکھی جاتی ہے ۔ تاکہ اگر کوئی داسی مندر کی خدمت سے اُکتا کر شادی کرنا چاہے تو اس کی شادی اور جہیز وغیرہ کے اخراجات اسی بیت المال سے دیئے جائیں ۔ پاڑ نے اپنی کتاب "سہراب ورستم" صفحہ ۱۶۸ میں لکھا ہے کہ دنیائے قدیم و جدید دونوں میں ایسی قومیں اکثر پائی جاتی ہیں جن میں نوخیز لڑکیاں شادی اور جہیز کا خرچ حاصل کرنے کے لئے فحاشی کرتی ہیں

الجزائر میں ایک قبیلہ بنی نائل کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کی لڑکیاں خصوصیت کے ساتھ نہایت حسین و جمیل ہوتی ہیں ۔ یہ لڑکیاں جوان ہو کر باہر چلی جاتی ہیں ۔ اور دو چار سال میں خوب دولت کما کر واپس آتی ہیں اور شادی کر لیتی ہیں ۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہی عورتیں شادی کے بعد نہایت اچھی بیویاں اور مائیں ثابت ہوتی ہیں ۔ اسی طرح فیا سچی نے ملک حبش کی نسبت لکھا ہے کہ وہاں کسبیوں کو ہمیشہ قدر و عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اگرچہ اس زمانہ میں انہیں قانون انھیں ہفتہ میں دو بار ڈاکٹری معائنہ کرانا پڑتا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے پیشہ میں

کوئی ذلت نہیں سمجھتیں۔ ان کے پاس جب کافی دولت جمع ہو جاتی ہے تو وہ اکثر شادی کر لیتی ہیں۔

**فحش کی ابتداء** انسان کے معتقدات مذہبی میں جوں جوں عنصر روحانیت زیادہ ہوتا گیا مذہبی فحاشی کا تقدس بھی زائل ہوتا گیا۔ اور اگرچہ ایشیائے کوچک کے سواحلی بلاد میں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں قسم کی حرامکاری پائی جاتی تھی لیکن جب مذہبی فحش کو انحطاط شروع ہو گیا تو لوگوں کی عام توجہ غیر مذہبی فحاشی کی طرف ہو گئی۔ جس کا بہانہ یہ تھا کہ جوان لڑکیاں اپنے شادی کے مصارف کے لئے روپیہ جمع کرتی ہیں۔ شاہ قسطنطین اعظم نے اس قسم کی فحاشی کا بھی خاتمہ کر دینا چاہا تھا۔ لیکن چونکہ دنیا سے توہم پرستی ہمیشہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی ہے اسلئے لوگوں کے دل میں یہ خیال جاگزیں رہا کہ جو عورت دیوی کے استھان پر اپنے نفس کی بھینٹ نہیں چڑھاتی وہ خواہش نفسانی کی آگ سے جلتی رہتی ہے۔ الغرض معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی عورتوں سے بازاری فحش کی ابتدا ہوئی۔ اور جب مذہبی فحاشی کا فقدان ہو گیا تو غیر شادی شدہ مردوں نے تقاضائے فطرت سے مجبور ہو کر لوگوں کی بہو بیٹیوں کو گھورنا اور چھیڑنا شروع کر دیا۔ جس سے نظام معاشرت میں خلل پڑنے لگا اور انھیں تمام باتوں سے متاثر ہو کر یونان کے مشہور و معروف مقننن حکیم سولن نے سب سے پہلے ایک عام قحبہ خانہ قائم کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اوباش نوجوانوں کی تسکین خواہشات کے لئے

سرکاری طور پر کوئی سہل انتظام کیا جائے اور اس طرح شریف عورتوں کی عزت و آبرو کو محفوظ کر دیا جائے۔ علاوہ اس کے ایک خیال یہ بھی تھا کہ ان سے سرکاری خزانہ کو فائدہ پہونچے گا۔ الغرض اس تحریک نے فحاشی کو ایک قانونی صورت دیدی اور وہی چیز جو پہلے یونان میں ڈکٹیریئن (Dicteria) کے نام سے موسوم تھی موجودہ زمانہ کا قحبہ خانہ (Brothel) ہوگئی۔ اور جو عورت قدیم یونان میں "ڈکٹیریئیڈ" کہلاتی تھی وہی اس زمانہ میں سرکاری قانون کے ماتحت "کسبی" کہلائی جانے لگی لیکن قدیم یونان میں جن عورتوں سے خانگی کا کام لیا جاتا تھا وہ کنیزیں ہوتی تھیں۔ یعنی یا تو وہ عورتیں جو جنگ میں اسیر ہو کر آئی ہوں یا وہ عورتیں جنھیں خرید لیا گیا ہو اس کے بعد قدیم یونان میں ایسی کسبیوں کی جماعت پیدا ہوئی جو آزاد ہوتی تھیں۔ ان کا نام ہتائرہ (Hetairae) تھا یہ عموماً تعلیم یافتہ، مہذب، علم مجلسی میں کامل، موسیقی میں ماہر اور متمول ہوتی تھیں لیکن ان کو مندر کی خدمت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

## فحاشی ممالک مشرق میں

دنیا کی مختلف قوموں کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں فحاشی نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن باقاعدہ عصمت فروشی صرف متمدن اقوام کا حصہ ہے۔ اور جہاں بھی تہذیب کا قدم پہونچا ہے وہیں یہ بھی ساتھ ساتھ گئی ہے۔ مثلاً بحر جنوبی کے جزیرہ رد تو ما (Rotuma) میں عصمت فروشی قطعی مفقود تھی

۹۶

لیکن اب وہاں باقاعدہ عصمت فروش عورتیں کثرت سے موجود ہیں اور قریب قریب یہی حال افریقہ کی بمبولا بنتو قوم کا ہوا۔ اسی طرح ملک ویلز کی قدیم قوم میں جو بہت کچھ متمدن تھی فحاشی موجود تھی لیکن باقاعدہ عصمت فروشی جرم قرار دیگئی تھی۔

**برھما** برھما میں آوارگی یا عصمت فروشی اس سے قبل بالکل مفقود تھی۔ بلکہ لوگ اس کو ایک شرمناک فعل خیال کرتے تھے۔ لیکن اس زمانۂ آزادی میں وہاں بھی اس کا رواج ہوگیا ہے۔ اور ہندوستانیوں کی تقلید میں وہاں بھی اس کا چرچا کثرت سے پایا جاتا ہے۔ ہرچند وہاں کے مقتدایان دین نے زن و مرد کے اس آزادانہ تعلق کی روک تھام کرنے میں بہت سختی کی یہانتک کہ ایسے لوگوں کو جلتی آگ پر تیل ڈالنے کی خدمت سپرد کی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

**ہندوستان** ہندوستان میں مذہبی اور غیر مذہبی پیشہ ور عورتیں ہمیشہ سے موجود ہیں۔ کتاب کام شاستر میں جو اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل کی تصنیف ہے بعض نہایت دلچسپ معلومات درج ہیں اس میں لکھا ہے کہ :-

"اگر عرصہ دراز تک بیوی لاولد رہے تو ہندو شوہر آخری تدبیر یہ اختیار کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو لباس فاخرہ اور زیورات سے آراستہ کرکے معہ سامان دلکشا کسی مندر میں چلہ کشی کے لئے بھیج دیتا ہے۔ اور یہ امر بھی محقق ہے کہ بعض لوگ وقت اور پریشانی سے بچنے کے لئے اپنی دلہن کو اول ہی شب مندر میں

بھیجدیتے ہیں۔ مندر کے اندر یہ ہوتا ہے کہ عورت دن بھر دیوتا کی پوجا پاٹ کرکے اس سے اولاد کی التجا کرتی ہے اور شب کو دیوتا کے حجرہ میں سو رہتی ہے صبح کو وہ مندر کے مہنت سے تمام ماجرا جو بوقت شب اس پر گذرا ہو بیان کرتی ہے۔ جس پر مہنت عورت کی تسکین بایں الفاظ کرتا ہے کہ :۔ "او صاحب عصمت و عفت عورت خوش ہو کہ وہ ہستی (جو رات کو تیرے ساتھ ہمبستر ہوئی) خود دیوتا کی تھی"۔

اسکے بعد وہ عورت اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ اس سرگذشت کے بعد اگر وہ عورت حسن اتفاق سے حاملہ ہو جائے اور وضع حمل کے بعد جیتا جاگتا بچہ پیدا ہو تو سال بھر کے بعد وہ عورت چند تحائف اور بچہ کے سر کے چند بال لیکر پھر مندر میں جاتی ہے[1]۔" ایسے مندروں کا وقار قائم رکھنے کے لئے عموماً نوجوان اور تندرست پجاری مندر میں رکھے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے بعض حصص خصوصاً جنوبی ہند اور اڑیسہ میں متعدد جگہ یہ رواج ہے کہ عورت و مرد کسی دیوتا کی منت مانتے ہیں کہ اگر ان کے اولاد پیدا ہوئی تو وہ اپنی پہلی لڑکی یا اپنی تمام لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی دیوتا کی نذر کردیں گے۔ اگر خوش قسمتی سے یہ منت پوری ہو جاتی ہے تو حسب الاقرار ایک خوبصورت لڑکی مندر کی نذر کردیجاتی ہے۔ اس لڑکی کو مندر کی ایک عورت (جو خود بھی اسی طریقہ سے آئی تھی) لیکر پرورش کرتی ہے۔ یہاں اس لڑکی کو رقص و سرود کی تعلیم دیجاتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب "ہندوؤں کے عادات رسوم و اخلاق" مصنفہ ڈوبے صفحات ۵۹۳-۵۹۴

۹۸

بعض اوقات یہ خوبصورت لڑکی دس برس کی عمر تک بھی نہیں پہونچنے پاتی کہ مندر کا مہنت اسے اپنی معشوقہ بنالیتا ہے۔ اگر وہ زندہ رہتی ہے تو مندر میں ناچنے گانے کی خدمت انجام دیتی رہتی ہے۔ اور جب مندر کے میلے کے وقت وہاں مختلف دیار و امصار کے جاتری جمع ہوتے ہیں اور مندر کے اردگرد دھرمسالوں اور مسافر خانوں میں ٹھہرتے ہیں تو یہ عورتیں ان مردوں کے ساتھ مخلوط ہوتی ہیں۔ اس لڑکی کی جب تک جوانی باقی رہتی ہے اسوقت تک وہ ہمیشہ عمدہ اور بیش قیمت لباس اور خوبصورت زیور سے آراستہ و پیراستہ رہکر حسن فروشی کرتی رہتی ہے۔ اور جب وہ کسی قابل نہیں رہتی بلکہ مندر پر بار ہوجاتی ہے تو اس کی پیشانی پر دیوتا کی تصویر داغ کر دیجاتی ہے۔ اور مندر سے نکال دیجاتی ہے۔ تاکہ بقیہ عمر بھیک مانگ کر گذارے۔ اس لڑکی کے والدین کو خواہ وہ کسی رتبہ و حیثیت کے ہوں اپنی لڑکی کی حیا سوز زندگی پر کوئی غیرت نہیں آتی۔ کیونکہ عام ہندو پبلک اپنی اولاد کو دیوتا کی نذر کر دینا قابل تعریف ایثار سمجھتی ہے۔ اس قسم کی عورتوں کو اصطلاح میں "دیوداسی" کہتے ہیں۔ اور بقول مسٹر رنگاچاریر مندروں کی ان دیوداسیوں سے کسی فرقہ یا ذات کا ہندو بھی شادی نہیں کرسکتا۔ اسلئے گاؤں کے زمینداروں یا تعلقداروں کو ترغیب دیکر اسپات آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس لڑکی کو اپنی آشنا یا داشتہ کے طور پر رکھ لیں۔

ہندوستان میں عوام کے خواہشات نفسانی کو جوش میں لانے کیلئے مندروں کے در و دیوار پر بھی فحش تصویریں بنائی گئیں۔ جب بین الاقوامی

مجلس نے انسداد فحش تصاویر کا ریزولیوشن پاس کیا جس پر ۱۹۲۳ء میں بمقام جنیوا سب کے دستخط ہوئے تو اس کی تعمیل میں ہندوستان کی اسمبلی نے بھی یہ قانون بنایا کہ جو شخص فحش تصاویر بیچتا ہو۔ یا کرایہ پر دیتا ہو۔ یا تقسیم کرتا ہو۔ یا منظر عام پر رکھتا ہو۔ یا کسی فحش کتاب یا تصویر یا مجسمہ کے ذریعہ سے نفع کماتا ہو، وہ عدالت سے سزا پانے کا مستحق ہوگا۔ لیکن ہندو سوسائٹی کے جذبات مذہبی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس قانون کو مندرجہ ذیل استثناء کے ساتھ منظور کیا گیا کہ:۔ "کوئی کتاب۔ رسالہ۔ تحریر۔ تصویر۔ یا نقوش جو رسوم مذہبی کے لئے رکھے جاتے ہوں، یا استعمال ہوتے ہوں، یا وہ مجسمے اور تصویریں جو مندروں پر یا مندروں میں کھدی ہوئی ہوں، یا بذریعہ رنگ بنائی گئی ہوں، یا وہ بت جو تھوں پر رکھے ہوں یا جو کسی مذہبی رسم کی ادائیگی کے لئے رکھے گئے ہوں یا استعمال ہوتے ہوں اس دفعہ میں نہیں آتے"[1]

**فلسطین** مغربی اشیاء کے اکثر حصوں میں جہاں انسان کی تمدنی حالت وحشت و بربریت کی انتہا تک پہونچ گئی تھی عصمت فروشی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ عبرانیوں میں حرامکاری کثرت سے ہوتی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ بائبل میں فاحشہ عورتوں کا بار بار ذکر آتا ہے۔ صحیفۂ امثال کے ابواب فاحشہ عورتوں کی مذمت سے بھرے پڑے ہیں باینہمہ عبرانی قوم غیر عورتوں کے فحش کو گوارا کر لیتی تھی اور خود اپنی عورتوں

[1] ملاحظہ ہو قانون تعزیرات ہند ایکٹ ۴۵ مجریہ ۱۹۳۵ء دفعہ ۲۹۲۔

کی مجگی پر سخت قانون نافذ کرتی تھی۔

اسلام نے فحش اور مجگی کا قلع قمع کر دیا تھا چنانچہ علامہ حلبی کا قول ہے کہ رسول مقبول صلعم کی وفات کے بعد پہلی صدی میں دنیائے اسلام کے اندر عصمت فروشی بالکل مفقود تھی۔ لیکن اب وہ زمانہ ہے کہ ہندوستان کے اندر ۵ فیصدی سے زیادہ کسبیاں مسلمان ہیں۔ یا مسلمان ہوگئی ہیں۔

**قدیم ایران** ہر چند مذہب زرتشت میں زہد و اتقا اور نیکوکاری پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اور ان کے ہاں کسبیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن قدیم ایران میں کثرت سے ایسی عورتیں موجود تھیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے جو پارسیوں کی کتب مقدسہ سے لیا گیا ہے قدیم ایران میں فاحشہ عورتوں کی موجودگی اور ان کی حالت پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اگر اس زمانہ میں فاحشہ عورتیں موجود نہ ہوتیں تو ان کی مذمت اس طرح نہ کی جاتی :-

"اے سپیتما زرتشترا! یہ گاہی (یعنی کسبی) ہے جو اپنے اندر مومنین و منکرین، پرستاران مزدا اور پیروان دیو، یعنی بُرے اور بھلے دونوں قسم کے آدمیوں کا بیج ملاتی ہیں۔ اے زرتشترا! اس کی نگاہ اس عظیم الشان سیلاب کے پانی کو جو پہاڑوں سے نازل ہوتا ہے، بقدر ایک ثلث خشک کر دیتی ہے۔ اے زرتشترا! اس کی نگاہ ایک ثلث خوبصورت طلائی رنگ پودوں کو افسردہ کر دیتی ہے۔ اسکی نگاہ سپنتا ارمائتی (دھرتی ماتا) کی ایک ثلث طاقت زائل کر دیتی ہے۔ اور اسکے چھونے سے مومنین کی

کے ایک ثلث نیک خیالات ایک ثلث اقوال پسندیدہ، ایک ثلث اعمال حسنہ، ایک ثلث طاقت جسمانی، ایک ثلث قوائے فہمندی اور ایک ثلث تقدس خاک میں ملجاتا ہے۔ اے سپیتما زرتشترا! میں تجھ سے کہتا ہوں کہ رینگنے والوں سانپوں سے، غرانیوالے بھیڑیوں سے، اس مادہ گرگ سے جو گلہ پر چھاپہ مارتی ہے، نیز اس مینڈکی سے جو اپنے ہزار ہا بچوں کو لئے ہوئے پانی میں کودتی ہے، ان سب سے زیادہ اس مخلوق کو تباہ ہونا چاہیئے،

**تاتار و ترکستان** تاتار و ترکستان میں بھی کسبیاں بکثرت پائی جاتی ہیں ایک مستند مسیحی سیاح کا بیان ہے کہ یہاں کسبیوں کے مکانات میں جانا ممنوع نہیں۔ نہ خلاف اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں پہونچکر ایک شخص اپنے گھر کو بھی بھول جاتا ہے۔ رقص و سرود سے اس کی طبیعت خوش کی جاتی ہے، دلپسند نظمیں اور غزلیں سنائی جاتی ہیں، لطیفہ اور بذلہ سنجی سے اس کا دل تسخیر کرلیا جاتا ہے پھر تسکین نفس کا انتظام ہوتا ہے۔ کسبی کی نفیس مکان کے دروازہ ہی پر وصول کرلی جاتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد آنیوالے کی اسقدر خدمت کی جاتی ہے گویا وہ اپنے ہی گھر میں محو عیش و راحت ہے۔ وہ کسبی سے وہی کام لیتا ہے جو اپنی بیوی سے لے سکتا ہے۔ کسی قسم کی ہمزگی یا ناگوار بات نہیں ہونے پاتی۔ اس سیاح کا ایک معنی خیز قول یہ بھی ہے کہ:۔

"مشرقی تجربہ خانہ میں کوئی سچائی نہیں ہوتی۔ اور نہ وہاں یورپین کسبیوں کی طرح نادان بچوں کی سی باتیں بنائی جاتی ہیں"

**چین** مشرقی چین میں خصوصاً مغل نسل کی اقوام میں فحاشی تجارتی بنیاد پر قائم ہے۔ لیکن ان لوگوں میں ایک بات نہایت عجیب ہے۔ کہ وہ حرامکاری کو تو بُرا نہیں سمجھتے لیکن کسبیوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیشہ ور عورتیں جو لاولد ہوتی ہیں دوسرے خاندانوں سے خوبصورت لڑکیاں چھوٹی عمر میں خرید لیتی ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت اپنے ذوق کے مطابق کرتی ہیں اور لوگوں کی نظروں سے الگ چار دیواری میں محفوظ رکھتی ہیں۔ چونکہ ان لوگوں میں بیوہ عورتوں کی شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، اسلئے اکثر نوجوان بیوائیں بھی تقاضائے فطرت یا وجہ معاش سے مجبور ہو کر یہ پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ قدیم چین میں کسبیوں کو عمدہ طبقہ کی عورتیں خیال کیا جاتا تھا۔ اور ان کی وقعت تقریباً وہی تھی جو قدیم یونان میں ہیٹائرہ (Hetaerae) کی تھی۔ بہرحال یہ عورتیں موجودہ چین میں بھی بکثرت ہیں۔

سواحلی شہروں اور بڑے بڑے بندرگاہوں میں خاص قسم کی چینی کسبیاں ہیں جو دریا پر خوبصورت بجروں اور مورنکھیوں میں رہتی ہیں۔ ان کی کشتیاں نہایت خوبصورت اور آراستہ ہوتی ہیں کشتیوں کے اندر جو مکان بنے ہوتے ہیں وہ بھی نہایت پرتکلف ساز و سامان سے سجے ہوتے ہیں۔ سچانگ کائی ٹونگ چین کے اٹاچی متعینہ پیرس نے پلاٹس دبارٹیل سے بیان کیا تھا کہ یہ "پھول والیوں" کے بجرے یورپین قحبہ خانوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک قسم کے تفریح خانے ہیں جہاں نوجوان چینی مرد

گانا بجانا سننے، چائے پینے اور پھول والیوں سے لطف صحبت حاصل کرنے آتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ پھول والیاں ان نوجوانوں کے خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کا بھی انتظام کریں (حالانکہ دراصل ہوتا یہی ہے)

**جاپان** جاپان میں کسبیوں کی ایسی ذلیل حالت نہیں جیسی چین میں پائی جاتی ہے۔ جاپان بمقابلہ چین کے زیادہ مہذب متمدن ہے۔ یہی باعث ہے کہ وہاں کی کسبیاں زیادہ خوددار ہوتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جاپان والے ان کو رحم، افسوس، اور ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جاپان کی کسبیاں آزادی کے ساتھ مردوں سے تعلقات رکھ سکتی ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو شادی بھی کر سکتی ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ بڑے بڑے صاحب مرتبہ، عالی نسب اور متمول لوگوں سے شادیاں کر کے معزز بیویاں بنجاتی ہیں۔ کولٹین نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ: "جب میں ٹوکیو سی شہر یاکوہامہ کی طرف گھوڑا گاڑی میں سوار جا رہا تھا تو میں نے چار نوجوان مردوں اور تین خوبصورت نوجوان کسبیوں کو دیکھا جو ایک ہی موٹر میں بیٹھے ہوئے لطف صحبت اٹھا رہے تھے۔ انکے پاس مختلف شرابوں کی دو تین بوتلیں۔ سفترے۔ اور خوبصورت کیک رکھے ہوئے تھے اور وہ دو صہبا کے ساتھ گاتے بجاتے تھے اور آپس میں چل کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سبزہ زار میں چند ہرن اور چند ہرنیاں کلیلیں کر رہی ہیں۔ آپ ملک چین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کر کے دیکھ لیں آپ کو اس قسم کا دلچسپ منظر کبھی نظر نہ آئیگا۔ لیکن جاپانی کسبیوں

کی جو تاریخ ایک انگریز سیاح نے اپنی کتاب "وہ شہر جہاں رات نہیں ہوتی" (The Night-less City) میں تحریر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ جاپان میں قحبگی پر حکومت نے سخت قواعد وضوابط عائد نہیں کئے ہیں لیکن ان کو ذلت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور بعض اوقات ان کو سخت آلام ومصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ کسبی بالکل غلام ہوتی تھی اور اسکے ساتھ برابر تاؤ کیا جاتا تھا۔ مگر اب وہ بالکل آزاد ہوگئی ہیں اور حکومت ایسی کسی بات کو گوارا نہیں کرتی جو انکی آزادی میں خلل انداز ہو۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک جاپانی کسبیوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ اس وقت ان کو فن موسیقی اور علم مجلسی کی خاص طور سے تعلیم دیجاتی تھی۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے تعلیم وتربیت کی طرف توجہ کم کردی جس نے سوسائٹی میں انھیں ذلیل کردیا۔ لیکن نہ اسقدر جتنی ذلت اور جگہ پائی جاتی ہے۔

لیکن بقول مانزنان (Manzinan) اسوقت بھی جاپان میں کسبیوں کو چنداں ذلیل نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ ان میں اسقدر بیحیائی پائی جاتی ہے جتنی یورپ کی کسبیوں میں ہوتی ہے۔ اگرچہ جاپان میں ان کا نظام اسی طرح قائم کردیا گیا ہے جیسے سرکاری ڈاکخانوں یا تارگھر لیکن پھر بھی بے قاعدہ فحش بکثرت ہوتا ہے۔ پیشہ ور عورتوں کو ایک خاص محلہ میں رہنا پڑتا ہے جسے جاپان کی اصطلاح میں یوشی وارہ (Yoshiwara) کہتے ہیں۔ ان کے مکان نہایت صاف

ستھرے ۔خوبصورت اور آراستہ ہوتے ہیں ۔لیکن اس زمانہ میں چونکہ جاپان کی کسبیاں زیادہ تر مغربی وضع قطع اختیار کرنے لگی ہیں اسلئے ان کا قدیم ذوق معاشرت مفقود ہوتا جارہا ہے ۔

تقریباً دو صدی قبل کہ جاپان میں کسبیوں کا زوال شروع ہوگیا تھا اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے جاپان میں گیشا (Geisha) عورتوں کا طبقہ پیدا ہوا ۔حکومت نے ان پر بھی بعض ایسی قیود عائد کردیں ہیں جنکے باعث وہ فحاشی میں باقاعدہ کسبیوں سے مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں ۔لیکن ان عورتوں کے لئے اتنی آزادی ضرور ہے کہ وہ لائسنس دار اور باقاعدہ کسبیوں کی طرح "یوشی وارہ" میں رہنے پر مجبور نہیں ہیں ۔

**کوریا** کوریا میں بھی یہ طبقہ قدیم سے چلا آتا ہے اور جاپان کے قابض ہونے سے قبل وہاں رقاصہ اور فاحشہ عورت میں کوئی خاص فرق نہیں تھا اینگس ہملٹن (Angus Hamilton) نے اپنی کتاب "کوریا" میں لکھا ہے کہ یہاں جو اعلیٰ طبقہ کی ڈیرہ دار اور خاندانی کسبیاں ہیں ، ان کو عموماً بہت اچھی تعلیم دیجاتی ہے ۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ عورتیں حاضر جوابی ۔لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں طاق اور علم مجلسی میں کامل ہوجاتی ہیں ان کی صحبت اسقدر دلفریب ہوتی ہے کہ پاس بیٹھکر اٹھنے کو جی نہیں چاہتا ان ڈیرہ دار اور اعلیٰ طبقہ کی تعلیم یافتہ کسبیوں کو یہاں کی اصطلاح میں گیسائنگ (Gioaing) یعنی "درق النور" کہا جاتا ہے ۔اور ان کی حالت تقریباً ویسی ہی ہے جیسے جاپان میں "گیشا" عورتوں کی ۔

سرکاری حیثیت سے ان عورتوں کا تعلق بھی ایک سرکاری محکمہ سے ہے۔ ان کے ساتھ درباری مغنی اور گویئے بھی ہوتے ہیں۔ ان عورتوں کو قومی خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے۔ اور قصر شاہی کے تمام جلسوں۔ درباروں اور ضیافتوں میں ان ..... کو شریک ہونا پڑتا ہے۔ یہ عورتیں تعلیمیافتہ ہوتی ہیں۔ ناچنے گانے میں کمال پیدا کرتی ہیں۔ فنون لطیفہ میں بھی انھیں دسترس حاصل ہوتی ہے۔ وہ نہایت عمدگی اور سلیقہ سے لباس پہنتی ہیں۔ وہ عموماً نہایت نازکبدن اور لاغراندام ہوتی ہیں۔ اور بہ حیثیت مجموعی نہایت مہذب، صدرجہ خوش اخلاق ہوتی ہیں۔ بلحاظ حسن وجمال یہ عورتیں کوریا بھر میں "چوٹی کا پھول" سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن باینہمہ انھیں اس بات کی اجازت نہیں کہ کسی عالی نسب مرد سے شادی کریں۔

**قحبگی قدیم روم میں** یورپ کے بہت سے معاشری مسائل کی طرح رسم قحبگی بھی غالباً قدیم روم سے یہاں آئی، لیکن ادارۂ فحاشی کی نسبت یہاں کے لوگوں کی بھی رائیں متضاد تھیں اور ابتک وہی حالت چلی جاتی ہے۔ یونان قدیم میں یہ حالت نہیں تھی کیونکہ عوام کے دلوں سے "مذہبی فحاشی" کی یاد فراموش نہ ہوئی تھی اور پیشہ ور عورتوں کا بڑا اثر پایا جاتا تھا۔ یونان کے علاوہ یورپ میں کبھی کسی کسی کو اس قسم کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ ہاں فرانس میں البتہ کوئی کبھی خفیف سا اثر پیدا کر لیتی تھی۔ علاوہ ازیں رومیوں کے طبایع بھی یونانیوں سے

مختلف تھے۔ یونانی شائستہ تھے اور رومی وحشی اور گنوار۔ یونانیوں کے مزاج میں نفاست تھی اور رومیوں کے مزاج میں عسکریت۔ اس لئے رومی سے یہ تو ممکن تھا کہ وہ کسبیوں کے وجود کو گوارا کرے۔ لیکن وہ یہ کبھی پسند نہیں کرسکتا تھا کہ ان کے وجود سے جو قدرتی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں ان کے سامنے بھی سر تسلیم خم کرے۔

حکیم سسرو (Cicero) جو رومیوں کا بہت بڑا معلم اخلاق تھا اگرچہ بظاہر یہ نہیں کہتا تھا کہ یہ پیشہ اچھی چیز ہے مگر اس کا قول یہ ضرور تھا کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ نوجوانوں کو کسبیوں سے حظ اٹھانے میں کون شخص مانع ہو سکتا ہے۔ روم والے کسبیوں سے ضرور ملتفت ہوتے تھے اور ان کے ہاں اعلیٰ طبقہ کی کسبیاں بھی ضرور ہوتی تھیں جنہیں وہ "Bona Meretrix" کہا کرتے تھے لیکن ان کی وہ عزت و وقعت نہیں تھی جو قدیم یونان کی "ہیتائرہ" کو حاصل تھی۔ رومیوں کے مزاج کی سختی انھیں اس طبقہ کی زیادہ مربیہ نہ ہونے دیتی تھی۔ یہ لوگ قحبہ خانوں کی حوصلہ افزائی ضرور کرتے تھے لیکن جب وہاں جاتے تھے تو منہ چھپا کر جاتے تھے تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔ بلکہ کسبیوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ ایک خاص رومی پوشاک جس کا معزز طبقہ کی خواتین سے تعلق تھا اور جسے "وٹا" (Vitta) یا "اسٹولا" (Stola) کہتے تھے، ہرگز نہ پہنیں۔ الغرض ان کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ شریف زادیوں کے لباس کی نقل کریں۔

## مسیحیت کا اثر فحاشی پر

جب دین مسیحی کا دور آیا تو خیال تھا کہ

ادارۂ فحش کی بنیاد متزلزل ہو جائے گی ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسیحیت کے دور میں بھی کوئی تغیر واقع نہ ہوا ۔ اس کا سبب یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں سے قدیم عہد بت پرستی کی یاد فراموش نہ ہوئی تھی ۔ اور مسیحی فرمانرواؤں کو ایک مخلوط اور سرکش رعایا پر حکومت کرنی پڑتی تھی ۔ علاوہ ازیں کلیسائے مسیحی کے ممتاز پادری اس مسئلہ میں رواداری برتنا چاہتے تھے تاکہ فتنے برپا نہ ہوں اور فحاشی کے جراثیم معزز گھرانوں سے دور رہیں ۔ اسکے علاوہ مسیحی شہنشاہوں کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ اپنے پیشرو حکمرانوں کی طرح ادارۂ فحش سے آمدنی حاصل کریں ۔ مگر جو آزادی کسبیوں کو عہد بت پرستی میں حاصل تھی وہ اب غائب ہو چکی تھی بلکہ بعض جوشیلے مسیحی فرمانروا اس امر کی کوشش کرتے تھے کہ سخت قوانین نافذ کر کے اس پیشے کا خاتمہ کر دیا جائے ۔ چنانچہ شہنشاہ تھیوڈوسیس اور ویلنٹی نین نے فرمان جاری کیا کہ قلمروئے روم میں تمام قحبہ خانے بند کر دئے جائیں ۔ اور اگر اسکے بعد بھی کوئی شخص کسی کسبی کو پناہ دیگا تو مستوجب سزا ہوگا ۔ یہ فرمان دراصل تھیوڈوسیس کا تھا ۔ جسکی تصدیق و توثیق بعد میں جسٹی نین نے کر دی ۔ اور حکم دیا کہ تمام کسٹنون کو خارج البلد کیا جائے ۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا ۔

اس کے بعد ہزار برس تک وقتاً فوقتاً یورپ میں اسی قسم کے فرامین جاری ہوتے رہے لیکن سب بیکار ثابت رہے ۔

قوم وزگوت (Visigoth) کے ایک بادشاہ تھیوڈورک (Theodoric) نے ہر اس شخص کے لئے جو پیشۂ قحبگی کو ترقی دینے کی

کوشش کرے سزائے موت مقرر کی۔ اور چھٹی صدی میں اسی قوم کے ایک بادشاہ نے جو کٹھولک مذہب کا پیرو تھا اور جسکا نام Recared تھا ادارۂ قحبگی کا قطعی انسداد کر دیا اور فرمان نافذ کر دیا کہ اگر ملک میں کوئی ایسی عورت پائی جائے تو اسے تین صد ضرب تازیانہ لگا کر شہر سے نکال دیا جائے۔ علاوہ ازیں شہنشاہ شارلمین نیز شاہ قرطاجنہ جنسریخ نے اور کچھ عرصہ بعد جرمنی میں فریڈرک باربروسہ نے کسبیوں کے خلاف نہایت سخت قوانین بنائے۔ مگر سب بے نتیجہ ثابت ہوئے

## قحبگی کے خلاف جہاد

قحبگی کے خلاف سب سے زیادہ سخت جہاد ملک فرانس میں ہوا لوئی نہم نے ۱۲۵۴ء میں فرمان جاری کیا کہ ملک کی تمام کسبیوں کا اسباب چھینکر انھیں ملک سے نکالدیا جائے۔ اسی بادشاہ نے ۱۲۵۶ء میں اسی فرمان کا پھر اعادہ کیا اور ۱۲۶۹ء میں جب وہ جہاد صلیبیہ کے لئے فلسطین جانے لگا تو اس نے حکم دیا کہ تمام کسبیوں کے گھر اور قحبہ خانے مسمار کر دیئے جائیں۔

ایک ہی فرمان کے بار بار اور وہ بھی قلیل عرصہ کے تفاوت سے جاری کئے جانے سے ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسکا ملک پر کسقدر کم اثر ہوا ہوگا۔ بلکہ اس کا اثر ملک پر اُلٹا پڑا۔ یعنی پہلے کسبیاں الگ تھلگ رہا کرتی تھیں اور اب وہ مجبور ہو کر عام لوگوں میں شامل ہو گئیں اور اس طرح ان کا اثر بہت زیادہ پھیل گیا۔ حتیٰ کہ جب شاہ لوئی ممالک مشرق میں مسلمانوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا اور اتفاق و نکوکاری کا زبردست علمبردار

بنا ہوا تھا اسوقت بھی اس کے لشکر میں عصمت فروشی ہوتی تھی۔ اور لشکر تو کیا خود شاہی خیموں کے باہر قرب وجوار کے خیمے کسبیوں کے اڈے بنے ہوئے تھے۔

سترھویں صدی کے وسط تک شاہ لوئی کے فرامین کا اس طرح بے سود اعادہ ہوتا رہا اور جب ۱۶۶۱ء میں چارلس نہم نے ایک فرمان جاری کرکے ملک کے تمام قحبہ خانے توڑ دیئے۔ تو کسبیوں کی تعداد میں اور اضافہ ہوگیا۔ یعنی اگر پہلے کھلے قحبہ خانے موجود تھے تو اب ملک بھر میں خفیہ اڈے قائم ہوگئے جن پر کوئی شخص شبہ نہیں کرسکتا تھا اور جو سرکاری قحبہ خانوں سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔

الغرض باوجود سخت جہاد کے بھی یورپ میں فحاشی کا انسداد نہ ہوسکا اور اٹھارہویں صدی کے پیرس میں تو اس کو اسقدر ترقی ہوئی کہ قحبہ خانے نہایت شاندار اور پرتکلف عمارتوں میں رکھے جانے لگے۔

مانتوا (Mantua) میں کسبیوں کے خلاف نفرت و حقارت کے اسقدر جذبات پھیلے کہ ان کو بازار میں سڑے ہوئے پھل اور خراب دال خرید کر کھانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہی حالت ۱۳۴۳ء میں وینس (Venice) کی تھی اور کتلونیہ (Catalonia) میں بھی کسبیوں کو اسقدر ذلیل کیا جاتا تھا کہ ان میں کسی معزز خاتون کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنے نہ دیا جاتا تھا۔ نہ وہ کسی معزز آدمی کے ساتھ کھانا کھا سکتی تھی۔

وینس میں۔ انسداد فحاشی کے لئے بیشمار سخت قوانین نافذ کئے گئے۔ لیکن ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا چنانچہ سترھویں صدی کی ابتدا میں کوریات

(Coryat) نے شہر وینس کی سیر کی تو اس نے اپنی کتاب (Crudities) میں وہاں کی کسبیوں کا بھی دلچسپ اور مفصل حال لکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ان دنوں وینس میں کسبیوں کی تعداد بیس ہزار تھی جن سے حکومت کو اسقدر ٹیکس وصول ہوتا تھا کہ وہ ایک درجن جنگی جہازوں کے عملہ کے لئے کفایت کرتا تھا۔

یورپ میں انسداد فواحش کے لئے سب سے آخری کوشش اٹھارہویں صدی کے وسط میں (ماریہ تھریسا Maria Theresa) نے کی تھی۔ اس نے لوگوں کو قید کرنا، جرمانہ کرنا، سزائے تازیانہ دینا اور مختلف قسم کے عذاب و عقاب دینا اختیار کئے۔ اسکے علاوہ حرامکاری کے اسباب و علل پر بھی توجہ کی گئی۔ اور عورتوں کا اونچا لباس پہننا منع کیا گیا۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کا سختی کے ساتھ معائنہ کیا جانے لگا۔ میخانوں کی سخت دیکھ بھال ہونے لگی۔ ایسے مقامات میں خادماؤں کا رکھنا ممنوع قرار پایا اور ۱۷۵۱ء میں ایک کمیشن جس کا نام (Chastity Commission) تھا قائم کیا گیا۔ لیکن شہنشاہ جوزف ثانی نے تخت نشین ہوتے ہی اس کمیشن کا خاتمہ کر دیا۔

جے۔ شرنیک (J. Shrenck) نے اپنی کتاب (Prostitution in Asia) میں لکھا ہے کہ ان سخت قوانین سے فحاشی کا خاتمہ تو کیا ہوتا، اس میں اور زیادتی ہو گئی اور یہ واقعہ ہے کہ جسقدر فحاشی دانستہ میں ہوتی تھی یورپ کے کسی شہر میں نہ ہوتی تھی

## قرون وسطیٰ کے ادارات فحش

پیشہ ور عورتوں کی حالت ہر ملک میں مختلف رہی ہے۔ بلکہ ایک ہی

وقت اور ایک مقام میں ان کی حالتوں میں تفاوت رہا ہے۔ دوفور (Dufour) نے لکھا ہے کہ ان پر مذہبی، ملکی، مجلسی ہر طرح کا ظلم و ستم ہوتا تھا تاہم ملک کے تمام طبقات فحاشی کا شوق رکھتے تھے بلکہ نوجوانوں کو تو بغیر ایسی عورتوں کے جینا محال تھا۔

چودھویں صدی میں بعض ممالک نے جن میں انگلستان بھی داخل ہے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایک خاص قسم کا لباس پہنا کریں جس سے ان کا پیشہ ور ہونا ظاہر ہو۔ لیکن اکثر حالتوں میں ان کی کوئی تذلیل نہیں کی جاتی تھی۔ بعض اوقات جب کوئی بادشاہ یا شاہی خاندان کا آدمی کسی بڑے شہر میں جاتا تھا تو ان کی جو ضیافتیں سرکاری طور پر کی جاتی تھیں ان میں قحبہ سرود اور تفریح طبع کے لئے یہ بھی طلب کی جاتی تھیں۔

فرانس میں قحبہ خانوں کو (Abayes) کہتے تھے۔ اور وہاں کے مشہور و معروف قحبہ خانے (Toulouse) اور (Montpellier) میں تھے۔ جنکا حال (Rabelais) نے بھی بیان کیا ہے۔ دُرخیم (Durkheim) کا خیال ہے کہ قرون وسطیٰ سے پہلے آزادانہ عشق بازی اور نکاح کے درمیان بہت کم فرق تھا۔ لیکن جب قرون وسطیٰ میں اس طبقہ اوسط کو عروج ہونے لگا تو اس کو اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی حفاظت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اسلئے ان لوگوں نے کوشش کر کے فاشی کیلئے علیحدہ ادارہ قائم کر دیا جسکی سرکاری طور پر نگرانی ہونے لگی۔ یہ تھی ابتدا گویا "سرکاری قحبہ خانہ" کی۔ ان قحبہ خانوں کو "ادارۂ خدمت عامہ" قرار دیا گیا

اور جو لوگ ان کا انتظام کرتے تھے وہ "ملازمان سرکار" سمجھے جاتے تھے۔ ان لوگون کا فرض تھا کہ وہ اپنے متعلقہ قحبہ خانہ میں کسبیوں کی ایک مقررہ تعداد رکھیں، مقررہ فیس لوگوں سے وصول کریں اور پاس پڑوس کی عورتون کو داخل نہ کریں۔ یورپ میں اس قسم کے قحبہ خانے تین سو برس تک قائم رہے لیکن جب پیروان فرقۂ پروٹسٹنٹ کا زور ہوا اور اُدھر امریکہ کی طرف سے آتشک کی بیماری آگئی تو قرون وسطیٰ کے قحبہ خانون پر زوال آگیا۔

## اعلیٰ معیار کی پیشہ ور عورتیں

اعلیٰ طبقہ کی پیشہ ور عورت جسے انگریزی میں کورٹ زن (Courtesan) کہتے ہیں اور جو پبلک قحبہ خانوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی یورپ کے دور ارتقاء کی پیداوار ہے اور یہ سب سے پہلے پندرہویں صدی میں اطالیہ کے اندر نمودار ہوئی لفظ "کورٹ زن" یا "کورٹی جیانا" کے معنی دراصل وہی ہیں جو اس املاء سے ظاہر ہو رہے ہیں یعنی "درباری عورت" یا "دربار کی محبوبہ" اور یہ وہ عورتیں تھیں جو شاہی حشم و خدم کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ چنانچہ اسکندر بورجیا (Alexander Borgia) کے پاپائی دربار میں بھی ان سے زینت رہتی تھی۔ برچارڈ (Burchard) نے جو اس زمانہ کے دربار پاپائیت کا نہایت سچا مورخ ہے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ ماہ اکتوبر ۱۵۰۱ء میں پاپائے اعظم نے حکم دیا کہ دربار میں پچاس ایسی عورتیں لائی جائیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ عشا کے بعد یہ عورتیں قیصر بورجیا (Caesar Borgia) اور اسکی بہن لقریزیہ (Lucrezia)

کے سامنے پہلے تو پشوازیں پہنکر اہل دربار کے ساتھ خوب ناچین بعد ازاں انھیں ننگا نچایا گیا۔ اسکے بعد شمعہائے کافوری کے جھاڑون کی مختلف روشین بنائی گئین۔ شمعیں روشن کردی گئیں۔ اور فرش پر اخروٹ بکھیر کر ان عورتون کو حکم دیا گیا کہ وہ ان بلوریں جھاڑوں کے درمیان جانورون کیطرح چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلیں اور اخروٹ جمع کریں۔ اس سلسلہ میں انعامات بھی تجویز ہوئے اور ان کو دئے گئے جن کی بیحیائی اہل بزم کو زیادہ پسند آئی۔

لفظ "کورٹ زن" کے وجود میں آنے سے قبل ان کا نام عام طور سے (Sinners) تھا اور اطالوی زبان میں ان کو پیکاترس (Peccatrice) کہا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ ان کو نہ صرف عام طور پر پسند کرتے تھے بلکہ ان کو ایک قسم کی عزت و وقعت بھی حاصل تھی۔ بعد کو اطالیہ میں بھی اعلیٰ طبقہ کی پیشہ ور عورتون کا نام "امپیریا" (Imperia) ہو گیا اور دربار پاپائیت میں جو کسی سب سے پہلے طلب کی گئی تھی وہ لاطینی زبان کی فاضل ہونے کے علاوہ اطالوی زبان میں بھی اسقدر مہارت رکھتی تھی کہ شعر کہہ لیتی تھی۔ یہ عورتیں فن موسیقی اور رقص میں بھی کمال حاصل کرتی تھیں۔ الغرض یورپ کے عہد ارتقاء کی پیشہ ور عورتیں قریب قریب ویسی ہی تھیں جیسی قدیم یونان کی "ہتائرہ"

ان کی فیس دو روپیہ سے لیکر پچاس روپیہ شبانہ تک ہوتی تھی۔

پاندیلو (Bandello) نے لکھا ہے کہ شہر وینس کی پیشہ ور عورتیں

Digitized by commisionedwriting.com for the IdeaMines collective.

عموماً متعدد چاہنے والے رکھا کرتی تھیں - ہر شخص کے لئے ایک شب مقرر تھی وہ اس رات کو وہیں کھانا کھاتا اور وہین رہتا - ہفتہ کے بقیہ ایام میں اُسکو اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا - ہر شخص کی طرف سے ماہوار تنخواہ مقرر ہوتی تھی - لیکن اس کو یہ حق ہمیشہ حاصل رہتا تھا کہ اگر کسی روز وہ اپنے نفع کے لحاظ سے دوسرے شخص کو بلالے تو وہ اُس دن کے آنے والے کا وقت بدلدے نئے آدمی سے بڑی رقم وصول کی جاتی تھی -

## یورپ کی بعض تاریخی پیشہ ور عورتیں

کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کسی بازاری عورت نے کوئی تاریخی خصوصیت نہ حاصل کی ہو - لیکن چونکہ اس طبقہ سے عوام کو ہمیشہ بے اعتنائی رہی ہے اسلئے مورخین نے فروگذاشت کی کہ انھون نے مختلف ممالک کی کسبیوں کے حالات کی طرف توجہ نہیں کی - لیکن یورپ کے بعض مورخین نے مغرب کی بعض ایسی مشہور عورتوں کے حالات لکھے ہیں چنانچہ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ

(طولیہ دی آرگونہ) یورپ کے قرون وسطیٰ میں سب سے زیادہ ممتاز عورت طولیہ دی آرگونہ تھی - جو مشہور مسیحی پادری کارڈنل ڈ - آرگونہ کی لڑکی بیان کیجاتی ہے - اس کی ماں بھی ایک کسبی تھی جسکا تعلق پادری سے ہوگیا تھا - لطف یہ ہے کہ خود کارڈنل بھی اگرچہ ہسپانیہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے مگر تھے کسبی کے پیٹ سے - یہ عورت اپنی اعلیٰ فلسفیانہ شاعری کی وجہ سے بام شہرت پر پہونچگئی تھی - اسکی ایک چاردہ مصرعی نظم (Sonnets)

بیحد مشہور ہے جو اس نے ایک بست سالہ خوبصورت جوان کی محبت میں لکھی تھی۔
یہ عورت نہایت روشن خیال اور مہذب تھی۔ بالآخر اس نے متنفر ہو کر یہ پیشہ
چھوڑ دیا۔ اسکی ہر شخص عزت و وقعت کرتا تھا۔ ۱۵۴۶ء میں فلورنس کے
حاکم نے فرمان جاری کیا کہ تمام کسبیاں چہرہ پر زرد نقاب ڈالا کریں یا ہاتھ میں
زرد رومال رکھا کریں جس سے ہر شخص پر ان کا پیشہ ظاہر ہو جائے۔ تولیہ نے
اسکی شکایت نواب بیگم سے کی جو ایک اعلیٰ سیرت کی ہمیانوی خاتون تھی۔
اس خاتون نے اپنے شوہر پر زور ڈالکر تولیہ کو اس ذلت انگیز حکم سے "بوجہ اعلیٰ
فلسفیانہ شاعری" کے مستثنیٰ قرار دیا۔ اس کے بعد تولیہ نے اپنی نظمیں نواب بیگم
کے نام سے منسوب کیں۔ تولیہ حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اسکے
سنہرے بال اور بڑی بڑی روشن آنکھیں خاص طور پر لوگوں کو محبوب تھیں۔
اس کی آنکھوں میں موہنی تھی وہ جسطرف دیکھ لیتی تھی لوگ مسحور ہو جاتے تھے۔
اور ناممکن تھا کہ کوئی شخص اسکے سامنے آئے اور مرعوب نہ ہو جائے۔

(ورونیکا فرانکو) یورپ کے دور نہضت کی کسبیوں میں سب سے ممتاز ورونیکا فرانکو
وہ (Veronica Franco) تھی جو ۱۵۴۶ء میں بمقام وینس پیدا ہوئی تھی
یہ متوسط طبقہ کی لڑکی تھی جس کی شادی اوائل عمر میں ایک ڈاکٹر سے ہوئی تھی۔
کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ عورت بلحاظ پیشہ کے کسبی تھی لیکن شاعری اور فنون لطیفہ کیلئے
اسکا دماغ بہت موزون تھا۔ وہ ایک تعلیمیافتہ اور شائستہ ہونے کے علاوہ
متعدد زبانیں جانتی تھی۔ گاتی بھی نہایت اچھا تھی اور مختلف ساز نہایت
عمدگی سے بجا سکتی تھی۔ وہ صرف کسبی ہی نہ تھی بلکہ اپنے ناتجربہ کار چاہنے والوں

کے حق میں ناصح مشفق بھی۔ مثلاً ایک نوجوان لڑکا جو ہنوز طالب علم تھا اس پر عاشق ہوا۔ درونیکا نے اس نوجوان کو نصیحت کی :۔ "آپ جانتے ہیں کہ جن لوگوں کو مجھ سے دعوائے محبت ہے اور جو یقیناً مجھے بھی بیحد پیارے ہیں وہ نہایت سختی کے ساتھ اپنی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے ہیں..... اگر مجھے اسقدر استطاعت حاصل ہوتی تو میں اپنا تمام وقت خاموشی کیساتھ قابل لوگوں کی صحبت میں صرف کرتی"

ایک مرتبہ وہ ایک مسیحی اسقف پر عاشق ہوئی۔ اور فریفتگی کی حالت اس درجہ تک پہونچی کہ جب تک وہ پادری کو دیکھ نہ لیتی اسے چین نہ پڑتا لیکن چونکہ پادری صاحب بہت محتاط تھے اس لئے یہ تعلق دوستی کی حد سے آگے نہ بڑھا۔ یہ عورت اسقدر جمیل اور اوصاف حمیدہ کی مالک تھی کہ ایک مرتبہ شاہ فرانس ہنری سوم کو بھی اس کی ملاقات کا شوق دامنگیر ہوا اور چلتے وقت وہ درونیکا کی تصویر بھی لیتا گیا۔ وہ فنون لطیفہ کی بیحد حامی تھی۔ وہ جس سے دوستی کرتی تھی ہمیشہ خلوص کے ساتھ کرتی تھی۔ وہ اسقدر شائستہ تھی کہ بعض اعلیٰ طبقہ کی شریف زادیاں بھی اسکی دوست بنگئی تھیں ۱۵۸۰ء میں اس نے کلیسا میں اقرار کیا کہ اس کے پیٹ سے چھ بچے پیدا ہوئے تھے۔ اسنے ۱۵۹۱ء میں بعارضۂ بخار وفات پائی۔

(نینون دی لنکلوس) نینون دی لنکلوس (Ninon de Lenclos) بھی نہایت بلند ذوق کی عورت تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی اعلیٰ فطرت اور اچھی عقل و فہم والی عورت قحبگی سے خوش نہیں ہو سکتی لیکن نینو اس کلیہ سے

مستثنیٰ تھی۔ اس میں تمام اوصاف پسندیدہ موجود تھے مگر وہ پھر بھی کسبی تھی یہ عورت سترہویں صدی کی ابتدا میں پیدا ہوئی۔ مان باپ دونوں طرف سے نجیب الطرفین تھی۔ اسکا سب سے پہلا چاہنے والا سولہ یا سترہ برس کی عمر میں پیدا ہوا جسکا نام گیسپارڈ ڈی کولگنی (Gaspard-de-Coligny) تھا۔ اسکے بعد نصف صدی تک اسکے چاہنے والوں کا سلسلہ لگاتار قائم رہا۔ بعض اوقات ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ چاہنے والے اس کے موجود رہتے تھے۔ الغرض اسکا نباہ تین برس سے زیادہ کسی چاہنے سے نہ ہوا۔ اس عورت کی صورت ایسی اچھی تھی کہ خاندان سیوزنہ (Sevignes) کی تین پشتیں اس کے چاہنے والوں میں گذریں لیکن اسکا جمال اسی طرح قائم رہا۔ یہ عورت بہت بے نفس تھی اور عام کسبیوں کی طرح اسے زر و مال کی کوئی طمع نہ تھی۔ اس زمانہ کے بڑے بڑے آدمی اسکی عزت و آبرو کیا کرتے تھے۔ وہ بہت باوقار اور صاحب عظمت عورت تھی۔ جو رونق اور دلچسپی اس کے چھوٹے سے دربار میں رہتی تھی وہ اس زمانہ کی شہزادیوں تک کو نصیب نہ تھی۔

## انسداد قحبگی کیلئے سعی و کوشش

ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ انسداد قحبگی کے لئے وقتاً فوقتاً سخت قوانین نافذ کیے گئے۔ اور حد درجہ ظالمانہ فرامین جاری ہوے جن سے انسداد فواحش کے بجائے اس میں اور زیادہ ترقی ہوئی اسلئے دور نہضت میں ارباب حل و عقد نے عاجز آکر قحبگی کے خلاف جہاد

کرنا بھی ترک کر دیا۔ لیکن اسکے بعد موجودہ زمانہ میں بھی اسکے انسداد کے لئے وقتاً فوقتاً سخت تدابیر اختیار کی جاتی رہیں اور آخر کار اب زمانہ بھر نے تسلیم کر لیا کہ علاج مرض سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

۱۸۶۰ء میں پورٹسمتھ کی میر بلدیہ نے حکم جاری کیا کہ اگر کسی نے ان عورتوں کو پناہ دی تو اسکو سخت سزا دی جائے گی۔ اسی کے ساتھ ایک دن مقرر کر کے شہر بھر کی تین چار سو بدنصیب کسبیوں کو پکڑ لیا گیا۔ بعض کی حالت اسقدر خستہ اور روی تھی کہ ان کے تن پر چیتھڑا تک نہ تھا۔ پھر ان کی باجہ کے ساتھ کئی دن تک بازاروں میں تشہیر کی گئی۔ اور محتاج خانہ (Work House) کو لیجایا گیا۔ لیکن محتاج خانے والے بوجوہ چندر چندان کو داخل کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ الغرض یہ چند روز تک یونہی خانہ خراب پھرتی رہیں۔ پھر مجبور ہو کر ان کو گھر جانے کی اجازت دیدی گئی۔

اسی قسم کی بہت سی کوششیں امریکہ میں بھی کی گئیں ۱۸۹۱ء میں ریاست پنسلوینیا کے مقام پٹسبرگ میں کسبیوں کے مکانات بند کر دیئے گئے ان کو بازاروں میں نکال دیا گیا۔ اور کسی فرد بشر نے ان کو نہ رہنے کو جگہ دی نہ کھانے کو ٹکڑا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ حالت دیکھکر تمام ملک میں رحم و کرم کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ اور ارباب حل و عقد کو پگڑی سنبھالنا دشوار ہو گیا حال ہی میں نیو یارک کے اندر بھی ایسا ہی واقعہ گذرا اور اسکے نتائج بھی ایسے ہی افسوسناک نکلے۔

## تجگی کے متعلق قواعد و ضوابط

جب تدابیر انسداد میں کسی طرح

کامیابی نہ ہوئی تو ارباب حل وعقد کا میلان خاطر اس طرف ہوا کہ قحبگی کے متعلق قواعد وضوابط وضع کرکے اسکو قاعدہ کے اندر لے آیا جائے اور حکومت کی نگرانی میں لے لیا جائے تاکہ اس فعل سے جو نتائج قبیحہ پیدا ہوتے ہیں ان کی روک تھام ڈاکٹروں اور پولیس افسروں کے ذریعہ سے ہوسکے اس غرض سے جدید قحبہ خانے قائم ہوئے جو قرون وسطیٰ کے قحبہ خانوں یا چکلوں سے بعض صورتوں میں مختلف تھے۔ دو باتیں انکے متعلق خاص تھیں۔ ایک یہ کہ انکا طبی معائنہ کیا جاتا۔ اور دوسرے یہ کہ بغیر لائسنس کسی کو یہ پیشہ اختیار نہ کرنے دیا جاتا۔

اس طریقہ کا سب سے بڑا حامی برنارڈ مینڈیوائل (Bernard Mandeville) تھا۔ ۱۷۲۴ء میں اس نے ایک کتاب لکھی جسکا نام "سرکاری قحبہ خانوں کی سنجیدہ حمایت" (Modest Defence of Publick Stews) تھا، اس کتاب میں اس نے یہ بحث کی کہ "اگر پبلک قحبگی کی حمایت اور حوصلہ افزائی کی گئی تو اس سے اس گناہ کی نہ صرف بدترین مضرتیں کم ہوجائینگی بلکہ عام حرامکاریوں میں بھی کمی ہوجائیگی۔ اور قحبگی کے حدود تنگ ہوجائینگے"۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر بذریعہ قانون پارلیمنٹ کو بیبیوں کو خاص حقوق عطا کردیئے گئے اور ان کے ساتھ خاص رعائتیں کی گئیں تو اس سے خانگی فحاشیوں میں کمی ہوجائے گی۔ اس نے یہ طریق عمل تجویز کیا کہ شہر کے کسی خاص محلہ میں سو قحبہ خانے تعمیر کئے جائیں جن میں دو ہزار کسبیاں رہ سکیں۔ ان سب کو ایک سو تجربہ کار اور قابل عورتوں کے انتظام اور نگرانی میں دیدیا جائے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر۔ اور سرکاری کمشنر بھی ان کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے رہیں

لیکن لوگوں نے اس تجویز کو دیوانگی سمجھا اور کوئی توجہ نہ کی گئی۔ لیکن یہ کام اسّی برس بعد نپولین اعظم کے ہاتھوں انجام پذیر ہونا مقدر ہو چکا تھا، جس نے گذشتہ صدی میں موجودہ یورپین تہذیب پر بھیانک اثر ڈالا

مگر اب کسبیوں کو درج رجسٹر کرنا۔ ان کی نگرانی، ان کے متعلق قواعد وضوابط کا انضباط اور انکا طبی معائنہ ایک افسانۂ ماضی ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ پر بڑے بڑے جھگڑے ہوئے، جن میں سب سے زیادہ وہ ہے جو انگلستان میں در بارۂ "قوانین امراض متعدی" برسوں تک ہوتا رہا۔ اسکی کل روئداد ایک منتخب کمیٹی کی رپورٹ میں درج ہے جو ان قوانین کے متعلق بنائی گئی تھی اور جو ۱۸۸۲ء میں شایع ہوئی اکثر ارکان کمیٹی نے خواتین کے موافق رائے دی تھی۔ لیکن یہ قوانین ۱۸۸۶ء میں منسوخ کر دئے گئے۔ پھر اسکے بعد انگلستان میں ان قواعد وضوابط کے نفاذ پر کوئی زور نہیں دیا گیا۔ اسوقت بھی اگرچہ یورپ کے مختلف ممالک میں پرانے قواعد وضوابط باقی ہیں مگر محض برائے نام ہیں اور علمائے نفسیات اور ماہرین علم معاشرت نے بھی یہ فتویٰ دیا ہے کہ کسبیوں کو ستانا قطعی وحشت و بربریت ہے

لیکن جو تکالیف ومصائب عالم انسانی پر آتشک دسوزاک کے ذریعہ سے نازل ہوتے ہیں جو بالواسطہ فحبگی کے نتائج ہیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے یہ خیال ضرور گذرتا ہے کہ ممکن ہے کوئی شخص کسی زمانہ میں ان کے انسداد کے لئے کوئی نیا طریقہ سوچے فرانس میں کسبیوں کی رجسٹری اور تجدید خانوں کی نگرانی کا سلسلہ ۱۸۰۲ء سے شروع ہوا تھا۔ اور ۱۸۴۳ء سے ڈاکٹری معائنہ کا کام بھی جاری کر دیا گیا تھا، جو اب تک چلا آرہا ہے۔ لیکن فرانس کے بڑے بڑے

اہل الرائے ان مستبدانہ طریقوں کے قطعی خلاف ہیں۔ جرمنی میں بھی قحبہ خانوں پر سختی اور ان کی سرکاری نگرانی اور نگہداشت کے خلاف ایک بڑی جماعت پیدا ہوگئی تھی جسکی قیادت بلاسچکو (Blaschko)، ساکن برلن نے کی جرمنی میں قحبہ خانوں کا سرکاری انتظام اور نگرانی ابھی تک جاری ہے۔ جسکے نتائج خود جرمنیوں کے نزدیک بھی افسوسناک ہیں۔ مثلاً جرمن قانون کی رو سے اگر کوئی شخص اپنے مکان میں مرد و زن کے ناجائز تعلقات ہونے دیگا تو وہ مستوجب سزا ہوگا۔ اس حکم کا اصلی مقصد یہ ہے کہ بغیر لائسنس کی قحبگی کا انسداد کیا جائے۔ مگر درحقیقت اسکا نتیجہ اُلٹا نکلتا ہے۔ یعنی امریکہ اور یورپ کے بعض ممالک میں اگرچہ جوان لڑکے اور لڑکی کا شادی سے قبل تعلقات رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن جرمنی میں اس خیال سے اس تعلق کو بُرا نہیں خیال کرتے کہ ممکن ہے اسکے بعد دونوں میں باقاعدہ شادی ہوجائے عملاً یہ حال ہے کہ جرمنی کی پولیس ایسے لڑکے اور لڑکی کو سخت پریشان کرتی ہے۔ اور ان کے ایسے پرائیوٹ تعلقات کو بغیر لائسنس کی قحبگی قرار دیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ پولیس کی ایذا برداشت کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ باقاعدہ قحبہ بنجائیں۔ اور خود کو پولیس کی پناہ میں دیدیں جرمن قانون دراصل ان لوگوں کے خلاف ہے جو قحبگی کی آمدنی پر بسر اوقات کرنا چاہتے یا کرتے ہیں۔ لیکن اسکے عملی نتائج اچھے نہیں نکلتے

اٹلی میں اس مسئلہ پر بہت کچھ اختلافات آرا ہے۔ وہاں کئی بار قواعد و ضوابط جاری ہوئے اور پھر منسوخ کر دیئے گئے۔ سوئٹزرلینڈ میں مختلف

اضلاع کے اندر مختلف قواعد و ضوابط جاری کر کے تجربہ کیا جا رہا ہے بعض علاقوں میں سوائے خاص حالات کے کسبیوں سے کوئی تعارض نہیں کیا جاتا۔ لیکن بعض علاقوں میں معمولی نخاشی بھی قابل سزا ہے۔ خاص شہر جنیوا میں صرف ان عورتوں کو پیشہ کرنے دیا جاتا ہے۔ جو وہیں کی رہنے والی ہوں۔ لیکن زیورچ (Zurich) میں ہر قسم کی قحبگی ممنوع ہے۔ سوئزرلینڈ میں بھی باوجود تمام قواعد و ضوابط اور رعایتوں کے لوگوں کی عام اخلاقی حالت وہی ہے جو دیگر حصص یورپ میں پائی جاتی ہے۔ اور یہی حالت لندن کی بھی ہے۔ اسی طرح جب ڈنمارک میں دیکھا گیا کہ تحریک انسداد قحبگی کا کوئی عمدہ نتیجہ نہیں نکلتا تو وہاں ۱۹۰۶ء سے یہ تحریک بالکل بند کر دی گئی۔

جو لوگ اس بات کے لئے بیحد شور و غل مچاتے تھے کہ کسبیوں کو دیجسٹر کیا جائے اب وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ تہذیب و تمدن اس قسم کی قید و بند کی منافی ہے۔ کیونکہ جن ممالک میں رجسٹری کا طریقہ جاری ہے وہاں بغیر لائسنس کی کسبیاں رجسٹری شدہ کسبیوں سے زیادہ ہوتی جاری ہیں۔ اب فرانس میں بھی جہاں سب سے پہلے قحبہ خانوں کو باقاعدہ نگرانی میں لیا گیا تھا۔ چکلوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ اسلئے نہیں کہ قحبگی کم ہوتی جاتی ہے بلکہ اسلئے کہ اب ادنیٰ درجہ کے بوزہ خانے۔ قہوہ خانے اور ہوٹل جو بغیر لائسنس کے قحبہ خانے ہیں باقاعدہ چکلوں کی جگہ لیتے جاتے ہیں۔

**ناکامی** الغرض اب متمدن ممالک میں اس خیال کے لوگ بہت کم

رہ گئے ہیں جو قحبگی اور قحبہ خانوں کو سرکاری نگرانی اور سخت قواعد وضوابط کی بندشوں میں کسنا چاہتے ہیں۔ اب صرف یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ موقعہ محل اور مقامی حالات کو دیکھکر کوئی ضابطہ مقرر کیا جائے ورنہ کسی عام قانون اور ضابطہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو لوگ قحبہ خانوں کو پولیس کی نگرانی میں رکھنے کے حامی تھے اب وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ایسا کرنا محال ہے۔ کیونکہ بہت سی لڑکیاں چھوٹی عمر سے اس مذموم فعل میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اسلئے کسبیوں کو بہت چھوٹی عمر سے درج رجسٹر ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ کام عملاً ناممکن ہے۔ اور یہی وہ بات ہے جو لوگوں کو عام طور سے ناگوار گذرتی ہے۔ پیرس میں سولہ سال سے کم عمر کی لڑکی کو بطور قحبہ درج رجسٹر نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ اکثر لڑکیاں اس پیشہ میں بہت کم سنی سے پڑ جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جب کوئی رجسٹری شدہ کسبی اپنے پیشہ سے گھبرا جاتی ہے یا کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو وہ پولیس کی نگرانی سے چپ چاپ نکلجاتی ہے اور کسی اور جگہ جاکر خفیہ طور پر پیشہ کرنے لگتی ہے۔ جس سے بیماریاں اور زیادہ بڑھتی ہیں۔ علاوہ ازیں کسبیوں کے شبہہ میں پولیس والے اکثر معزز عورتوں پر بھی زیادتی کر بیٹھتے ہیں جسکے باعث ان کے خلاف عام جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔

الغرض معلوم یہ ہوتا ہے کہ کسبیوں کا مسئلہ جس طرح اب سے تین ہزار برس پہلے لاینحل تھا اسی طرح اب بھی ہے۔ اسکو معقول طریقہ سے سمجھنے کے لئے نہ صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم قحبگی کی ابتداء وارتقاء پر غور کریں۔ بلکہ اس کے

اسباب وعلل اور موجودہ سوسائٹی سے اسکے تعلقات پر بھی کافی غور کرنیکی ضرورت ہے۔ چنانچہ آیندہ صفحات میں ہم اسی بات پر بحث کرینگے کہ قحبگی کے اسباب وعلل کیا ہیں۔ اور پیشہ ور عورتوں کا عام سوسائٹی سے کیا تعلق ہے۔

## قحبگی کے اسباب وعلل

قحبگی کی ابتدا و ارتقاء کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ تو معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ ہمارے نظام ازدواج کا کوئی اتفاقی شاخسانہ نہیں ہے۔ بلکہ اسکا ایک جزو لازم ہے۔ جب کنبہ کا نظام رفتہ رفتہ اہانتی سے بطریقی بنگیا اور اسکی بنیاد زیادہ تر وحدت ازدواج پر قائم ہونے لگی تو عورتوں کا اپنے آپ کو کسی ایک کو سپرد کردینا روز بروز مشکل ہوتا گیا۔ قبیلہ کے بطریقی نظام پر خوب غور کرکے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں لڑکی اپنے باپ کا مال ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ خود اپنے نامزد کے لئے لڑکی کی حفاظت اسوقت تک نہایت احتیاط سے کرتا تھا۔ جب تک کوئی بر پیدا ہو اور اس لڑکی کو خرید نہ لے۔ لڑکی کی قدر و قیمت سے اسکی دوشیزگی کا خیال زیادہ وابستہ ہوتا گیا۔ اور اگرچہ پہلے زمانہ میں "دوشیزہ" وہ عورت سمجھی جاتی تھی جو اپنے نفس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینے میں آزاد ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا جب اسکے معنی اس عورت کے ہوگئے جسکو کسی مرد نے نہ چھوا ہو۔ جب لڑکی اپنے باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہوئی تو سسرال میں بھی اسکی اسی طرح نگرانی ہوتی رہی۔ گویا باپ اور شوہر دونوں کے نزدیک یہی بات مفید تھی کہ وہ اس عورت کی مردوں سے حفاظت کریں۔ اس طریقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سوسائٹی میں ایسے

نوجوان مرد و زن کی ایک جماعت کثیر پیدا ہوگئی جو محروم الازدواج تھے۔ کیونکہ بعض مردوں میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ وہ بیوی کا خرچ اٹھا سکیں اور بعض عورتیں ایسی تھیں جنکو کسی مرد نے بغرض ازدواج منتخب نہ کیا تھا۔ ان میں بہت عورتیں ایسی بھی تھیں جو اپنی زندگی میں شادی سے مایوس ہوگئی تھیں۔ الغرض جب سوسائٹی اس حالت کو پہونچی تو فحاشی کا ہونا لازم تھا۔ اس طرح گویا بعض نوجوان عورتوں نے جو بلحاظ حسن و جمال و شائستگی اپنی کچھ قدر و قیمت سمجھتی تھیں۔ اپنے نفس کی قیمت لگا دی اور وہ آزادی کے ساتھ ناکتخدا مردوں کی خواہشات نفسانی عارضی طور پر پوری کرنے لگیں۔ اس طرح گویا قحبگی کی ابتداء ہوئی۔

موجودہ نظام معاشرت میں قحبگی کی حالت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارہ کا پوری طرح تجزیہ کر کے قحبگی کے خاص خاص اسباب و علل معلوم کئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے ہمکو اقتصادی، اخلاقی، تمدنی اور حیاتی پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے۔

ہیولاک ایلس کو ایک تجربہ کار شخص نے مندرجۂ ذیل بیان لکھ کر بھیجا تھا جسے ہم اسکی کتاب "تعلقات نفسانی اور معاشرت" سے اقتباساً درج کرتے ہیں۔

"مجھے پیشہ ور عورتوں کا مختلف طریقوں سے تجربہ ہو چکا ہے۔ اور میں بلا لیس و پیش کہہ سکتا ہوں کہ ایسی عورتوں میں ایک فیصدی بھی ایسی نہیں ہوتیں جنھیں تعلیم یافتہ کہا جا سکے۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عورتیں عموماً ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور انکی روز افزوں تعداد سے

ظاہر ہوتا ہے کہ ان عورتوں میں جذبات شرم وحیا کا اوائل عمر ہی میں فقدان ہو جاتا ہے۔ اور سن بلوغ تک پہونچنے سے پہلے ہی یہ لڑکیاں تعلقات زناشوئی سے واقف ہو جاتی ہیں۔ جب یہ لڑکیاں سن بلوغ کو پہونچ جاتی ہیں تو جن لڑکوں یا جوانوں سے ان کی آشنائی ہوتی ہے، وہ ان کو بیحیائی کی آخری حد تک پہونچا دیتے ہیں۔ اسکے بعد وہ لڑکیاں کارخانوں اور دوکانوں میں کام کرنے کے لئے جانے لگتی ہیں۔ اور اگر وہ خوبصورت یا قبول صورت ہوتی ہیں تو کارخانوں کے مہتمم ان سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی زمانہ میں ان لڑکیوں کو خوبصورت چیزوں اور سامان آرائش وزیبائش کا شوق ہو جاتا ہے۔ اور وہ کسی صاحب مقدور مرد کیساتھ بحیثیت "مدخولہ" رہنے لگتی ہیں ان عورتوں کے متعلق ایک بات اور قابل ذکر ہے۔ یعنی انھیں اپنے چاہنے والے مرد کیساتھ اختلاط کرنے میں چنداں لطف حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے ہی جیسے مزاج اور طبیعت والے شخص کے اختلاط سے زیادہ خوش ہوتی ہیں۔ میں ایسی بہت عورتوں کو جانتا ہوں جنھیں کسی بدمعاش نے سبز باغ دکھا کر دام میں پھانسا۔ آبرو ریزی کی اور چھوڑ کر بھاگ گیا بیخانوں کی ساقنوں سے قحبگی میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ خصوصاً اسوجہ سے کہ وہ شرابخوار ہوتی ہیں۔ اور شرابخواری عورت کے لئے سم قاتل ہے۔ اس شوق میں مبتلا ہو کر عورت شرم وحیا کو بالکل بالائے طاق رکھ دیتی ہے دوسرا سبب لڑکیوں کے خراب ہونیکا یہ ہے کہ وہ دیدہ زیب اور نظر فریب چیزوں کو پسند کرنے لگتی ہیں، اور یہ شوق ان میں ایسی عورتوں کی دیکھا دیکھی

پیدا ہو جاتا ہے جو اس پیشہ میں داخل ہو چکی ہیں۔ مثلاً ایک جوان لڑکی صبح سے شام تک مزدوری کرتی ہے۔ اور وہ دیکھتی ہے کہ اس کے ہمسایہ میں کوئی عورت عمدہ لباس پہنتی ہے تو اسکو دیکھ کر یہ غریب لڑکی بھی گمراہ ہو جاتی ہے۔ یعنی جب وہ اس سے دریافت کرتی ہے کہ ایسی عمدہ چیزیں اور ایسا نفیس لباس کہاں سے آیا تو وہ اسے اپنے ساتھ لیجا کر مرد سے مانوس کرا دیتی ہے۔ اور اس جماعت میں ایک فرد کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔"

سب سے زیادہ دلچسپ اسباب و علل وہ ہیں جو خود انھیں عورتوں کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض ممالک میں قحبگی کے اسباب و علل کا ان لوگوں نے بھی اندازہ لگایا ہے جنھیں سرکاری یا دیگر حیثیت میں ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور بعض ممالک میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب کوئی عورت پیشہ اختیار کرتی ہے تو اسے نام درج رجسٹر کراتے وقت یہ پیشہ اختیار کرنیکا سبب بھی بتانا پڑتا ہے۔

پیرنٹ دوشاتلے (parent-Duchatelet) نے جن کی کتاب قحبگی کے متعلق پیرس میں اب بھی مستند مانی جاتی ہے۔ ہر قسم کی کسبیوں کا حسب ذیل تخمینہ لگایا ہے۔

| کل تعداد جسپر تخمینہ قائم کیا گیا | تعداد | اسباب |
|---|---|---|
| [illegible] | ۱۴۴۱ | مفلسی و ناداری |
| | ۱۴۲۵ | چاہنے والے کا آبروریزی کرکے بھاگ جانا |
| | ۱۴۲۵ | وازرین کا سایہ اٹھ جانا |

مندرجہ بالا نقشہ سے صرف اسقدر ظاہر ہوتا ہے کہ قحبگی کے اسباب و علل صرف اقتصادی ہیں۔ بلجیم کے دارالحکومت وبروسیلز (Brussels) میں قحبگی کے اسباب و علل کا اندازہ بیس برس یعنی ۱۸۶۵ء لغایتہ ۱۸۸۴ء کے اعداد و شمار سے لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ قحبگی کے اسباب و علل نقشہ مندرجہ بالا سے قطعی مختلف ہیں۔

| تعداد کل | تعداد | اسباب و علل |
|---|---|---|
| | ۱۵۲۳ | انتہائی مفلسی و ناداری |
| | ۲ | خاوندوں کا خرچی کمانے پر مجبور کرنا |
| | ۱۱۱۸ | خواہشات نفسانی کی شدت |
| | ۴۲۰ | صحبت بد کا اثر |
| | ۳۱۶ | ایماندارانہ کام سے نفرت |
| ۳۵۰۵ | ۱ | والدین کا قحبگی اختیار کرنے پر مجبور کرنا |
| | ۱۰۱ | عاشقوں کی بیوفائی |
| | ۱۰ | والدین سے جھگڑا |
| | ۴ | سرپرستوں سے ناموافقت |
| | ۳ | گھر کے جھگڑے |
| | ۷ | شوہروں کا چھوڑ دینا |

جس وقت لندن میں مسٹر میرک (Merrick) بحیثیت پادری ینک جیل میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے ہزارہا کسبیوں سے قحبگی کے

اسباب دریافت کئے تھے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نقشہ سے ان کی تحقیقات ظاہر ہوتی ہے

| کل تعداد | تعداد | اسباب و علل |
|---|---|---|
| ۱۶۰۲۳ | ۵۰۶۱ | خواہش نفسانی کے پیچھے خود بخود گھر چھوڑنا |
| | ۳۳۶۳ | افلاس و ناداری |
| | ۳۱۵۴ | عاشقوں کا خراب کر کے چھوڑ دینا |
| | ۱۶۳۱ | عشاق اور رشتہ داروں کا شادی کا وعدہ کر کے دغا کرنا |

مسٹر میرک تحریر کرتے ہیں کہ ان میں ۴۷۹۰ عورتیں یعنی ایک ثلث کے قریب ایسی ہیں جنکا چال چلن مردوں نے خراب کیا۔ اور ۱۱۲۳۲ ایسی ہیں جو دیگر اسباب و علل کے باعث کسبیاں بنیں۔ مصنف موصوف نے بھی ظاہر کیا ہے جو کسبیاں اپنے پیشہ کا سبب مفلسی و ناداری بتاتی ہیں وہ درحقیقت سست اور کاہل عورتیں تھیں۔ جو محنت مزدوری سے جان چراتی تھیں۔

مسٹر لوگان (Logan) ایک انگریز پادری نے جو شہر میں کام کیا کرتے تھے۔ ان کی حسب ذیل تقسیم کی ہے۔ (۱) ایک چوتھائی ایسی ہیں جو میخانوں اور بوزہ خانوں میں کام کیا کرتی تھیں اور اس طرح خراب ہو کر کسبی بنگئیں (۲) ایک چوتھائی وہ عورتیں ہیں جو دکانوں اور کارخانوں وغیرہ میں کام کیا کرتی تھیں اور وہاں خراب ہو کر کسبی ہوئیں (۳) ایک چوتھائی کے قریب ایسی لڑکیاں ہیں جنہیں کتیاں دیہات اور قصبات وغیرہ سے بہکا کر

لائیں۔ (۴) بقیہ تعداد ایسی عورتوں کی ہے جن سے بوجہ سستی و کاہلی ایماندارانہ کام نہ کیا گیا۔ یا بدمزاجی کے باعث کہیں نوکر نہ رہ سکیں یا جن سے مردوں نے شادی کے جھوٹے وعدہ کر کے خراب و گمراہ کیا۔

امریکہ کے شہر نیویارک میں مسٹر سینگر (Sanger) نے ان علل و اسباب کی تحقیقات کی جن کے باعث عورتوں نے پیشہ اختیار کیا۔ نتائج مندرجہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہے:۔

| کل تعداد | تعداد بمدار | اسباب و علل |
|---|---|---|
| دو ہزار ۲۰۰۰ | ۵۲۵ | مفلسی و ناداری |
| | ۵۱۳ | شوق |
| | ۲۵۸ | عشاق کا خراب کر کے چھوڑ دینا |
| | ۱۸۱ | علت شرابخواری |
| | ۱۶۴ | والدین، عزیزوں یا شوہروں کا برا برتاؤ |
| | ۱۴۴ | تن آسانی و عیش پسندی |
| | ۸۴ | صحبت بد |
| | ۷۱ | اغوا |
| | ۴۹ | سستی و کاہلی۔ کام سے جی چرانا |
| | ۴۷ | زنا بالجبر |
| | ۱۶ | جہاز پر آتے ہوئے مردوں کا خراب کرنا |
| | ۸ | بورڈنگ میں مردوں کا بہکا کر خراب کرنا |

۱۳۲

حال ہی میں امریکہ کے پروفیسر وڈس ہچنسن (Woods Hutchinson) نے دنیا کے تین بڑے بڑے عالمگیر شہروں کے نمایندوں سے فحاشی کے اسباب و علل کے متعلق چند سوالات دریافت کئے اور جوابات موصول شدہ پر حسب ذیل نقشہ مرتب کیا گیا۔

| اسباب و علل | تعداد فیصدی |
|---|---|
| شوق نمائش، تعیش و کاہلی | ۴۲ ۱/۲ |
| گھر کا خراب ماحول | ۲۳ ۱/۸ |
| عشاق کا خراب کرنا | ۱۱ ۱/۳ |
| بیکاری | ۹ ۱/۴ |
| خاندانی پیشہ | ۷ ۱/۸ |
| جذبۂ شہوانی | ۶ ۱/۵ |

سنہ ۱۸۸۰ء میں اطالیہ کی رجسٹرشدہ کسبیوں سے جن کی عمریں سترہ سال سے زیادہ تھیں دریافت کر کے فیریانی نے حسب ذیل نقشہ مرتب کیا:۔

| کل تعداد | تعداد | اسباب و علل |
|---|---|---|
| ۱۰۰۰۰ | ۲۷۵۲ | شوق گناہ و ابتذال |
| | ۲۱۳۹ | والدین یا شوہر وغیرہ کی وفات |
| | ۱۶۵۳ | چاہنے والوں کا بہکا کر خراب کر دینا |
| | ۹۲۷ | نوکری کے سلسلہ میں خراب ہونا |
| | ۷۹۴ | والدین یا شوہر وغیرہ کا چھوڑ دینا |

| | | |
|---|---|---|
| | ۶۹۸ | عیش پسندی |
| | ۶۶۶ | عاشق یا گھر سے باہر کسی مرد کا بہکانا |
| | ۴۰۰ | والدین یا شوہر کا بہکا کر اس پیشہ کیلئے مجبور کرنا |
| | ۳۹۳ | والدین یا بچوں کی پرورش |

فیڈیرود (Fedorov) نے ۱۹۰۱ء میں روس کی کسبیوں کے متعلق حسب ذیل نقشہ مرتب کیا تھا:-

| اسباب و علل | تعداد فیصدی |
|---|---|
| ناکافی مزدوری | ۳۸٫۵ |
| شوق تفریح | ۲۱٫۰ |
| نوکری چھوٹ جانا | ۱۴٫۰ |
| دیگر عورتوں کا بہکانا | ۹٫۵ |
| جوش انتقام | ۵٫۵ |
| شرابخواری | ۵٫ |

## فحبگی کے اقتصادی اسباب

فحبگی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر مصنفین و محققین نے لکھا ہے کہ اس مذموم پیشہ کی بنیاد اقتصادیات پر قائم ہے۔ یعنی عورتیں عموماً مفلسی و ناداری کی وجہ سے یہ پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ حالانکہ جب خود ان سے دریافت کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تر یہ بتاتی ہیں کہ دیگر ذرائع سے وجہ معاش حاصل کرنا ان کے لئے مشکل تھا اسلئے وہ یہ پیشہ کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

ایک صدی سے زیادہ زمانہ گذرا کہ پیرنٹ دوشاتلے نے لکھا تھا کہ: "پیرس میں خصوصاً اور دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں عموماً قحبگی کے اسباب دعلل میں اس سے زیادہ موثر سبب اور کوئی نہیں کہ عورت کے پاس حصول مایحتاج کے لئے کوئی کام نہ ہو۔ یا اگر کام ہو تو اس کی اجرت اور مزدوری ضروریات زندگی کے لئے کافی نہ ہو" انگلستان کے متعلق شیرویل (Sharwell) نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا یعنی یہاں "اخلاق عامہ کے حسن وقبح کا انحصار روزگار کے عروج وزوال پر ہے" یہی خیال امریکہ کے بارے میں بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور یہی سبب برلن میں پیش کیا جاتا ہے کہ جب روزگار یا کاروبار خراب ہوتا ہے تو کسبیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جاپان میں بھی ان کی کثرت کا باعث "مفلسی ناداری" بتایا جاتا ہے۔

الغرض تقریباً ہر جگہ کے محققین نے یہی بتایا کہ قحبگی میں کمی زیادتی کے اسباب اقتصادی ہیں یعنی مفلسی وناداری یعنی روزگار یا کاروبار کی خرابی کہ جب آمدنی یا مزدوری کم ہو جاتی ہے تو عورتیں بغرض حصول مایحتاج کسبی بننے پر مجبور ہو جاتی ہیں

**افلاس اور قحبگی** ایک جب اس بیان کی جانچ اُن نتائج کی روشنی میں کیجاتی ہے جو مختلف محققین نے فرداً فرداً اخذ کئے ہیں تو اسکی تردید ہوتی ہے۔ مثلاً اسٹراہمبرگ (Strahmberg) نے جب ۶۲ کسبیوں کے حالات کی نہایت غور کیساتھ تفتیش کی تو ان میں صرف ایک عورت ایسی نکلی جس نے اپنی قحبگی کا سبب مفلسی وناداری بیان کیا۔ اور جب مزید تحقیقات

کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس ایک عورت نے بھی جھوٹ بولا تھا۔

اسی طرح ہیمر (Hammer) نے جرمنی کی ۹۹ رجسٹری شدہ کسبیوں کے حالات کی تفتیش کر کے معلوم کیا کہ ان میں ایک عورت بھی ایسی نہ تھی جس نے مفلسی و ناداری سے مجبور ہو کر یا کسی بچہ کی پرورش کے لئے قحبگی پیشہ اختیار کیا ہو۔ بلکہ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جو مالدار ہونے کے باوجود بدکار ہو گئی تھیں اور بعض تو ایسی بھی تھیں جو کوئی معاوضہ طلب نہ کرتی تھیں۔

پادری بشمان جنکا تعلق برلن کے ٹلٹاؤ میگڈلینی ہوم (کسبیوں کے نجات خانے) سے ہے فرماتے ہیں کہ عورتیں حاجتمندی کی وجہ سے قحبگی پیشہ اختیار نہیں کرتیں بلکہ عام اصول اخلاق کی طرف سے بے پروا ہو کر وہ ایسا کرتی ہیں۔ ایک امر اور بھی غور طلب ہے۔ یعنی برلن میں یہ عام دستور ہے کہ جب کوئی عورت بحیثیت کسبی اپنا نام درج رجسٹر کراتی ہے تو اسے ہمیشہ یہ موقعہ دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی "نجات خانہ" میں جا کر ایماندارانہ کام کرے۔ لیکن دس برس کے تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگرچہ اس دوران میں ہزارہا کسبیاں رجسٹر ہوئیں لیکن ان میں صرف دو ایسی نکلیں جنھوں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا۔ انگلستان کی بھی یہی حالت ہے۔ اور یورپ کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں بھی یہی کیفیت دیکھی گئی ہے بلکہ ان بدقسمت عورتوں کو حرامکاری کا کچھ ایسا چسکا پڑ جاتا ہے کہ وہ "نجات خانوں" (Rescue Home) سے نکلکر پھر قحبگی پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مثلاً میڈرڈ کی نسبت برنالڈو ڈی کو ٹروس اور لاناس ایگوئلانیڈو نے بیان کیا ہے کہ کسبیاں "نجات خانوں"

میں داخل ہوجاتی ہیں وہ باوجود اس امر کے کہ وہاں کی راہبہ عورتیں ان کی بجید خاطر مدارات کرتی ہیں، موقعہ پاکر نکل جاتی ہیں۔ ان جملہ واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگرچہ اسباب قحبگی میں اقتصادی مشکلات ضرور داخل ہیں لیکن اسقدر نہیں جتناکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

## یوروپین کسبیوں کی کثرت

یوروپ میں فاحشہ عورتیں تجارت وحرفت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہیں۔ ان کی تعداد میں جن لڑکیوں یا عورتوں سے عموماً اضافہ ہوتا ہے وہ کارخانوں، دکانوں ہوٹلوں میں کام کرنے والی ہوتی ہیں۔ جسکا باعث یہ ہے کہ ان مقامات میں عورتوں کو مستقل کام نہیں ملتا۔ چار دن کام سے لگی رہتی ہیں تو چار دن بیکار بیٹھی رہتی ہیں۔ الغرض اسی وجہ سے بہت سی زنانہ ٹوپیاں بنانے اور پوشاک پر ساز ٹانکنے والیاں وغیرہ فصل ختم ہونے کے بعد کسبیاں بنجاتی ہیں۔ اور پھر جب فصل شروع ہوتی ہے تو اپنا کام کرنے لگتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورتیں دن بھر محنت کرتی ہیں لیکن شام کو اتنی اجرت نہیں ملتی جو ضروریات زندگی کے لئے کفایت کرسکے۔ اسلئے وہ مجبوراً رات کے وقت گلی کوچوں اور بازاروں میں ادھر اُدھر پھر کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں

کلبرگ (Kullberg) نے ملک سوئڈن کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں تیرہ سے سترہ سال عمر کی لڑکیاں جو اپنے والدین کے گھروں میں نہایت عیش وآرام کے ساتھ رہتی ہیں۔ اکثر بازاروں میں اگر شوقیہ طور پر مبتلائے فحش ہوتی ہیں۔

ڈبلیو ایکٹن (W. Acton) نے اپنی کتاب "فحبگی" (Prostitution) مطبوعہ ۱۸۵۷ء میں جو ایک نہایت پر از معلومات کتاب ہے لندن میں فحبگی اور حرامکاری کے متعلق لکھا ہے کہ "حرامکاری زندگی کا ایک ایسا عارضی وقفہ ہے جس سے برطانیہ کی بیشمار عورتیں گذرتی ہیں"۔ لیکن تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف انگلستان بلکہ دیگر ممالک میں بھی زیادہ تعداد ایسی ہی عورتوں کی ہے۔ اسکے متعلق ہم فرانس کے زبردست اور مستند محقق پیرنٹ دوشاتلے کی سند پیش کرتے ہیں جس نے لکھا ہے کہ "اکثر عورتوں کے لئے فحبگی اور حرامکاری کا ایک عارضی زمانہ ہوتا ہے۔ بعض عورتیں عموماً پہلے ہی سال تائب ہو جاتی ہیں۔ اور زندگی بھر تو شاذ و نادر ہی کوئی عورت حرامکار رہتی ہو"۔

اسی سلسلہ میں بعض دیگر اقوال و بیانات بھی قابل ذکر ہیں مثلاً پوٹن نے فرانس کے شہر لائنس (Lyons) کی نسبت لکھا ہے کہ یہاں منجملہ ۳۸۸۴ فاحشہ عورتوں کے ۳۱۹۴ نے یہ شغل بالکل ترک کر دیا تھا۔ پیرس میں بھی کسبیوں کی بہت بڑی تعداد نے یہ پیشہ ترک کر کے دیگر باعزت پیشے اختیار کر لئے تھے۔ سلوجیٹ (Sloggett) نے شہر ڈیون پورٹ کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں منجملہ ۱۷۷۵ کسبیوں کے ۲۵۰ نے نکاح کر لیا تھا۔ اور یہ امر مسلمہ ہے کہ کسبی جب کسی سے نکاح کرتی ہے تو دیکھ بھال کر ایسے شخص کیساتھ کرتی ہے جہاں وہ عیش و راحت اور عزت و وقعت کیساتھ زندگی بسر کر سکے بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ملازمت کر لیتی ہیں یا کوئی اور پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔

اگر کسی نے جوانی میں کچھ اندوختہ پیدا کرلیا ہے تو وہ حمام، یا ہوٹل وغیرہ کھول لیتی ہے لیکن رجسٹری شدہ کسبیوں میں ایسی عورتوں کی تعداد دو فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اس خیال کی تردید کہ عورتیں مفلسی و ناداری کی وجہ سے کسبیاں بنجاتی ہیں اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ان میں زیادہ تعداد ایسی عورتوں کی ہوتی ہے جو شریف اور امیر گھروں میں کام کاج کیا کرتی ہیں۔ پھر گھر والوں کو اقتصادی مشکلات پیش آئیں یا نہ آئیں لیکن پیشہ خدمتوں اور ماماؤں کو کبھی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ نہ انھیں کھانے کی فکر ہوتی ہے نہ مکان کی۔ بلکہ وہ بعض اوقات اپنی آقاؤں کی طرح رہتی ہیں۔ اور اپنی آقاؤں کی طرح انھیں بھی روپیہ پیسہ کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں وہ بیکار بھی کبھی نہیں رہتیں کیونکہ ان کی ہر جگہ مانگ ہے۔ لیکن باینہمہ کسبیوں میں ایسی ہی عورتیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اقتصادی اسباب کی ہی بنا پر عورتیں کسبیاں نہیں بنجاتیں بلکہ اسکے اسباب کچھ اور بھی ہیں۔

آرتھر شیرویل ( A. Sherwell ) نے اپنی کتاب "مغربی لندن کی زندگی" (Life in West London) میں لکھا ہے کہ ویسٹ اینڈ لندن کے گلی کوچوں میں جسقدر بدکار عورتیں نظر آتی ہیں ان میں اکثریت (اور بقول سالوشین آرمی ۸۰ فیصدی) ایسی عورتوں کی ہوتی ہے جو گھروں میں کام دھندا کرتی ہیں۔

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل غور ہے کہ خادمائیں اپنے طرز زندگی اور

طریق معاشرت میں بمقابلہ اور عورتوں کے کسبیوں سے زیادہ ملتی جلتی ہیں۔ اور کسبیوں کی طرح ان عورتوں کی امت بھی جداگانہ ہے۔ یہ عورتیں اس خاطر و مدارات اور احترام و اکرام کی مستحق نہیں سمجھی جاتیں جو اور عورتوں کے متعلق مدنظر رکھا جاتا ہے۔ بعض ممالک میں ایسی خادمائیں بھی کسبیوں کی طرح رجسٹری شدہ ہوتی ہیں۔ اس قسم کی عورتیں متمول اور شریف عورتوں کے پاس رہکر زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کی شوقین ہو جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ رائج الوقت فیشن کا پورا خرچ نہیں اٹھا سکتیں اسلئے کسبی بنجاتی ہیں۔ ان میں عموماً شوق نمائش کوتاہ نظری اور تقلید کا شوق ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہی باتیں عام کسبیوں میں پائی جاتی ہیں۔ ڈی راگیری (De Rygkere) نے ایسی عورتوں کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ بداخلاق نہیں ہوتیں بلکہ ان میں کسی قسم کا اخلاق ہی نہیں پایا جاتا"

پیرس کی کسبیوں کی نسبت پیرنٹ دوشاتلے کا قول ہے کہ ان میں سب سے زیادہ تعداد اُن عورتوں کی ہے جو پہلے گھروں میں نوکریاں کرتی تھیں اور کمنجہ (Commenja) نے لکھا ہے کہ پیرس کی ان عورتوں میں جو بغیر لائسنس حرامکاری کرتی ہیں چالیس فیصدی تعداد اُن عورتوں کی ہے جو پہلے گھروں میں ملازم تھیں۔ فرانس کے شہر بورڈو (Bordeaux) کی نسبت جینل (Jeannel) نے لکھا ہے کہ ۱۸۶۰ء میں انکے اندر ۴۰ فیصدی تعداد اُن عورتوں کی تھی جو پہلے گھروں میں نوکریاں کرتی تھیں۔ ان کے بعد غیر ورزنوں کا تھا (۳۷ فیصدی)

انیسویں صدی کے وسط سے پہلے لیپرٹ (Lippert) نے جرمنی اور گروس ہافنجر (G. Hoffinger) نے آسٹریا کے متعلق لکھا تھا کہ یہاں کسبیوں میں سب سے زیادہ تعداد اُن عورتوں کی ہے جو پہلے معزز گھرانوں میں مامائیں تھیں اور ۱۸۹۸ء میں بلاشکو (Blashko) نے لکھا تھا کہ برلن کی کسبیوں میں پیش خدمتوں کی تعداد اکیاون فیصدی ہے۔ اور وائنا میں ایسی عورتوں کی تعداد ۴۸ فیصدی ہے۔

انگلستان میں دارالامراء کی ایک منتخب کمیٹی نے قانون تحفظ بچگاں کے متعلق جو رپورٹ مرتب کی تھی اس میں لکھا تھا کہ کسبیوں میں ساٹھ فیصدی عورتیں ایسی ہیں جو پہلے گھروں میں مامائیں تھیں۔ اور ایف۔ ریمو (F. Remo) نے ان کی تعداد اسّی فیصدی لکھی ہے۔ اور مغربی لندن میں تو غالباً ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہوگی۔

تمام لندن کے متعلق میریک (Merrick) نے جو اعداد و شمار فراہم کئے تھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ منجملہ ۱۴۷۹۰ کسبیوں کے ۵۸۲۳ عورتیں سابق خادمہ کی حیثیت سے کام کر چکی تھیں دھوبنوں کا نمبر دوسرا اور درزنوں کا نمبر تیسرا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس طبقہ میں ماماؤں کی تعداد ۵۳ فیصدی سے زیادہ ہے۔

امریکہ کے متعلق ڈاکٹر سینگر (Sanger) نے لکھا ہے کہ یہاں کی کسبیوں میں پیش خدمتوں کی تعداد ۴۳ فیصدی ہے۔ اسکے بعد درزنوں کا نمبر آتا ہے۔ اور گڈ چائلڈ (Good Child) نے شہر فلاڈلفیا کی نسبت لکھا ہے کہ یہاں کی کسبیوں میں مامائیں نسبتاً سب سے زیادہ ہیں۔ یہی حالت قریب قریب ہر ملک کی ہے۔

| نام ملک | نام محقق | تعداد | کیفیت |
|---|---|---|---|
| اطالیہ | نامیوز (Jammes) | ۲۸ فیصدی | مائیں |
| " | " | ۱۷ " | ورثمیں وغیرہ |
| سارڈینیا | اے مانٹی گیزا (Anantegaza) | اکثریت | دیہاتی خادمائیں |
| روس | فیاڈ (Feaux) | ۴۵ فیصدی | مائیں |
| سپین | ایسلافا (Enlava) | ۲۷ " | خادمائیں |
| سوئیڈن | ویلانڈ (Welander) | ۶۲ " | خادمائیں |

## قحبگی علم الحیوٰۃ کے نقطۂ نظر سے

فصل اول میں ہم قحبگی کے اقتصادی اسباب و علل پر کافی بحث ہو چکی ہے لیکن ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے جو محققین کے سامنے عرصۂ دراز سے زیر بحث ہے۔ اور وہ یہ کہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے کسبیاں کس حد تک اپنے مذموم پیشہ کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ یا بالفاظ دیگر کیا بعض عورتیں ماں کے پیٹ سے کوئی ایسی خصوصیت لیکر آتی ہیں جس سے وہ آئندہ زندگی میں کسبی بنجاتی ہیں؟ یہ امر تو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اقتصادی اور دیگر اسباب عورتوں کے چال چلن پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن معلوم یہ کرنا ہے کہ ایسی کتنی عورتیں ہیں جو غیر معمولی پیدائشی خصوصیات کے باعث قحبگی پیشہ اختیار کر لیتی ہیں؟۔

## قحبگی میں عنصر حیاتیہ

بعض ماہرین فن اور محققین کا یہ خیال ہے کہ جس طرح بعض مردوں میں جرائم پیشگی کی طرف

۱۴۲

پیدائشی رغبت ہوتی ہے اسی طرح بعض عورتوں میں بھی فحاشی کی طرف فطری میلان ہوتا ہے۔ مثلاً جن خاندانوں میں مرد فطری میلان کے باعث جرائم پیشگی اختیار کر لیتی ہیں ان خاندانوں کی عورتیں بھی پیدائشی بدکار ہوتی ہیں۔ لیکن بعض محققین نے اس خیال کی تردید کی ہے۔

اس نظریہ کی حمایت سب سے زیادہ لومبروزو (Lombroso) نے کی ہے کہ "عورتوں میں مجرمیت کی قائمقام فحاشی ہوتی ہے"۔ اپنے اس قول کی تائید اس نے ڈوگڈیل (Dugdale) کے ان نتائج سے کی ہے جو انھوں نے خاندان جوکس (Jukes) کے افراد کا غائر مطالعہ کرکے اخذ کئے تھے اس خاندان کے متعلق انھوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ "اس خاندان میں بھائی تو عادی جرائم پیشہ ہیں اور بہنیں تمام بدکار"۔ اس خاندان کے حالات دیکھکر لومبروزو اور فریرو (Ferrero) نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ "ایک پیدائشی مجرم اور پیدائشی فاحشہ بلحاظ نفسیات اور بلحاظ تشریح الاعضاء اخلاقی پاگل ہیں دونوں میں وہی احساس اخلاق کا فقدان، وہی سنگدلی، وہی میلان بدکاری، وہی تلون مزاجی، وہی تن آسانی اور وہی عارضی اور سطحی مسرتوں کا شوق، اور وہی خود بینی و خود نمائی ہے۔ گویا فحاشی نسوانی پہلو ہے مجرمیت کا۔ اور نفسیاتی لحاظ سے ایک زن قحبہ، جرائم پیشہ مخلوق ہے۔ اگر وہ کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتی تو یہ اسکے جسمانی ضعف و ناتوانی کا باعث ہے یا اسکی عقلی کمزوری کا سبب، جو وہ اپنی مطلوبہ چیز زیادہ سہل طریقوں سے حاصل کر لیتی ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ وہ جرم کا ارتکاب نہیں کرنے پاتی۔ اور یہی وہ امور ہیں

جن کی بنا پر ایک بدکار عورت کو "نسوانی مجسمۂ مجرمیت کہا جا سکتا ہے"۔

ڈبلو فشر (W. Fisher) نے اپنی کتاب "Die prostitution" میں لکھا ہے کہ قحبگی عین "مجرمیت" ہے۔ یہی بات فیرے (Fere) نے اپنی دلچسپ کتاب "Degeneresce (Criminalité)" میں لکھی ہے کہ "قحبگی اور مجرمیت دونوں ایک ہیں۔ کسی فاحشہ عورت یا کسی مجرم سے نہ دین کا فائدہ ہے نہ دنیا کا۔ لہذا دونوں دشمنان معاشرت ہیں"۔

لیکن بعض محققین کا خیال اسکے قطعی خلاف ہے۔ ان کے نزدیک کسبی چور نہیں ہوتی بلکہ وہ چوروں سے نفرت کرتی ہے۔ وہ اپنے طور پر محنت کرتی ہے لیکن چور حرامخور ہوتا ہے۔ بامگارٹن (Baumgartin) نے آٹھ ہزار کسبیوں کی نسبت تحقیقات کی مگر ان میں بہت ہی کم تعداد مجرموں کی پائی۔

## کسبیوں میں خواہشات نفسانی

محققین کے نزدیک یہ مسئلہ بھی عرصۂ دراز سے بحث طلب ہے کہ کیا کسبیوں میں خواہشات نفسانی زیادہ ہوتی ہیں جو اسقدر ابتذال کی طرف مائل ہو جاتی ہیں؟ اس مسئلہ کا جواب مختلف طریقوں سے دیا جاتا ہے موراشو (Morasso) اور دیگر محققین کا قول یہ ہے کہ ان میں خواہشات نفسانی کی شدت ہوتی ہے۔ اور اسی لئے اس ذلیل پیشہ کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ لیکن بعض محققین یہ کہتے ہیں کہ ان میں عموماً خواہش مواصلت قریب قریب مفقود ہوتی ہے۔ لومبروزو کا یہی قول ہے کہ خواہشات نفسانی کے لحاظ سے یہ سرد ہوتی ہیں اور اسکی تائید میریک (Merrick) کے بیان سے بھی ہوتی ہے جنھوں نے لندن کی

تقریباً سولہ ہزار کسبیوں کا مطالعہ کرکے لکھا ہے کہ انھوں نے صرف چند کسبیاں ایسی پائیں جو خواہش شہوانی کی شدت سے مائل بہ فحبگی ہوئی ہوں۔

راسی بورسکی (Raesi Boreski) نے پیرس کی کسبیوں کے بارہ میں بھی یہی بیان کیا ہے کہ "ان میں ایسی تعداد بہت کم ہے جو محض شدت خواہش کے باعث فحبہ بنی ہوں"۔ اسی طرح کو منجہ (Commenge) نے جنھیں پیرس کی کسبیوں کا بیحد تجربہ ہے یہ بیان کیا ہے کہ فحبگی کے اسباب وعلل میں خواہشات نفس کی شدت چنداں اہمیت نہیں رکھتی وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے ہزاروں سے دریافت کیا لیکن ایسی بہت ہی کم نکلیں جنھوں نے مجھ سے یہ اقرار کیا کہ انھوں نے خواہشات نفسانی کی تسکین کے لئے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ اگرچہ ایسے معاملات میں عورتیں بہت کم صاف گوئی سے کام لیا کرتی ہیں مگر میرے خیال میں انھوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا"۔

لیکن جانتک غور کیا گیا ہے ان لوگوں کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اقوال ایسی عورتوں کے بیانات پر مبنی ہیں جنکی عمریں اسی کام میں گذر گئی ہیں۔ اور اب بوجہ کثرت کار و سن رسیدگی ان کی خواہشات نفسانی سرد ہوگئی ہیں۔ اور محض مشین کی طرح سے روپیہ کماتی ہیں۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ صحیح جذبات اور خواہشات کی بنا پر اسکو بہت کم رغبت ہوتی ہے۔ جسکا ایک سبب تو یہ ہے کہ انکے تعلقات پیشہ کے لحاظ سے بہت سطحی ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ اس حرکت کو بہت کمسنی کے عالم میں شروع کر دیتی ہیں جب اعضاء میں پوری طرح پختگی بھی پیدا ہونے نہیں پاتی۔ اس پیشہ کی عورتوں میں عام طور پر دماغی لحاظ سے بہت

سطحیت پائی جاتی ہے اور یہی باعث ہے کہ ان میں جذبات نفسانی بھی ضعیف ہوتے ہیں لیکن یہ کلیہ نہیں ہے کیونکہ برعکس اس کے بعض کسبیوں میں یہ جذبہ بہت قوی ہوتا ہے علی الخصوص وہ جنکی صحت اچھی، اعضا صحیح و تندرست اور نشو و نما مکمل ہوتا ہے۔

یہ بات بھی عام طور پر دیکھی گئی ہے کہ ان میں سے اکثر جسمانی لحاظ سے مضبوط و توانا ہوتی ہیں۔ اور یہی باعث ہے کہ وہ اپنے پیشہ کے جملہ خطرات کو بلا تامل برداشت کر لیتی ہیں۔ اور اگرچہ کثرت فحش کے باعث ان کی طبیعتیں سیر اور ان کے نازک اعضا سخت ہو جاتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ان کی خواہش شہوانی قطعی غائب ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بلحاظ پیشہ انکو ہر شخص سے کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ اور اسی لئے وہ اپنی لطف صحبت کے لئے کسی ایک کو مخصوص کر لیتی ہیں۔ اور اس سے وہ اسی طرح سچی محبت کرتی ہیں جیسے کوئی شریف بیوی اپنے شوہر سے کرتی ہے۔

ایک جرمن کسبی سے ایک مرتبہ اسی بارہ میں دریافت کیا گیا تو اس نے صاف صاف بیان کیا کہ "پیشہ اور چیز ہے اور محبت و شوق اور بات ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے جو فعل کرنا پڑتا ہے اس سے دل خوش نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم دوسری عورتوں کی طرح خود بھی کوئی "شوہر" نہ رکھیں۔ آخر ہم لوگ بھی تو دل اور دل میں جذبات رکھتے ہیں۔ ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ کسی خاص شخص سے محبت کریں۔

ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب "تعلقات شہوانی اور سوسائٹی" میں اپنے ایک نامہ نگار کا مراسلہ درج کیا ہے جسکو نہ صرف انگلستان بلکہ جرمنی، بلجیم، ہالینڈ اور فرانس کی کسبیوں کا بھی بہت کافی تجربہ حاصل ہے۔ مراسلہ مذکور سے ظاہر ہوتا ہے

کہ بمقابلہ اور ممالک کے انگلستان کی پیشہ ور عورتیں خواہشات نفسانی کا اظہار طبعی طور پر بہت کچھ کرتی ہیں۔ نامہ نگار مذکور لکھتا ہے کہ: "کسبیوں میں کسی قسم کی خواہش نفسانی ظاہر نہیں ہوتی۔ میں نے کسی غیر ملک کی کوئی کسبی ایسی نہیں پائی جو دل کھول کر ملتی ہو۔ لیکن انگلستان میں ضرور یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص محبت اور شفقت سے پیش آئے اور یہ بھی ظاہر کرے کہ اسے محبت کی ضرورت ہے تو پوری بے تکلفی سے ملتی ہیں اور پیشوں کی طرح اس پیشہ میں بھی باہمی لاگ ڈانٹ ہوتی ہے۔ اور ہر کسبی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دل خوش کر کے دوسری کسبی کے آدمی کو توڑ لے یا اپنے آدمی کو کسی اور کے پاس نہ جانے دے۔ لیکن تجربہ کار آدمی اصلی اور نقلی محبت میں بہ آسانی تمیز کر سکتا ہے۔"

بہر حال امور مندرجہ بالا سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اوائل عمر میں کسبیوں کے اندر خواہشات نفسانی ہوں یا نہ ہوں یا آگے چلکر بعض میں باقی رہیں یا نہ رہیں لیکن ان میں خواہش نفسانی کم و بیش ہوتی ضرور ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ ان خواہشات کی طرف سے بے پروا ہو جائیں

## نفسیاتی خصوصیات

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا نفسیاتی یا جسمانی ساخت کے لحاظ سے ان کی دنیا الگ ہے؟ اس مسئلہ پر بھی محققین میں باہم سخت اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی دنیا ہی نرالی ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ بھی عام عورتوں کی طرح ہوتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ نفسیاتی اور ساخت جسمانی کے لحاظ سے حد درجہ کری ہوئی اور مبتذل ہوتی ہیں لیکن بعض کا قول ہے کہ ان میں صرف حسن معاشرت اور اخلاق کی کمی ہے ورنہ ان میں

اور دوسری عورتوں میں کوئی فرق نہیں۔

محققین نے نہایت غور و خوض کے ساتھ بہت سی کسبیوں کی دیکھ بھال کر کے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں بُری بھلی دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً دیپائن (Deopine) نے فرانس کی کسبیوں کا بغور مطالعہ کرنیکے بعد انکے عیوب اور محاسن دونوں شمار کئے ہیں لکھا ہے کہ انمیں حسب ذیل عیوب ہوتے ہیں:۔ (۱) حرص و آز۔ (۲) شوق بیخواری۔ (۳) دروغگوئی۔ (۴) غیظ و غضب۔ (۵) فقدان ترتیب و سلیقہ۔ (۶) تلون مزاجی۔ (۷) فقدان تحریک (۸) رجحان باحتظاظ بالمثل یا بالنفس۔

اسکے ساتھ ہی ان میں بعض اوصاف حمیدہ بھی پائے جاتے ہیں یعنی۔ (۱) ماں باپ کی محبت۔ (۲) ایک دوسرے سے حسن سلوک۔ (۳) باہمی فیاضی اور دریا دلی۔ (۴) ایک دوسرے کی تنقیص سے پرہیز۔ (۵) دینداری۔ (۶) خوداری و سنجیدگی (۷) اور عام دیانت داری۔

لومبروزو (Lombroso) کا قول ہے کہ تجگی کی بنیاد "اخلاقی حماقت" پر ہے۔ اگر اس "اخلاقی حماقت" (Moral Idiocy) کا تعلق زیادہ تر "دیوانگی" سے ہے تو ہم اس قول کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ تجگی اور دیوانگی میں کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا اور تامیو (Tamneo) نے اپنی کتاب (La Prostitution) میں دکھایا ہے کہ تجگی اور دیوانگی میں نسبت معکوس ہے۔ یعنی جب لوگوں میں دیوانگی کی کثرت ہوتی ہے تو کسبیوں کی تعداد میں کمی ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر "اخلاقی

کے معنی "اخلاقی کمزوری" کے ہیں یعنی قواعد وضوابط تہذیب وتمدن سے بے پروائی۔ اور شرم وحیا کی طرف سے بے حسی تو یہ قول کسی حد تک سچ ہے کیونکہ یہ کمزوری کم وبیش اکثر کسبیوں میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو عورت اپنی عصمت حقیر فائدہ کے عوض نذر کرے وہ ضرور پاگل ہے۔ اگر وہ ایسی حرکت محض محبت کے باعث کرے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے بیوقوفی یا غلطی کی۔ کیونکہ ایسی حرکتیں نوجوان اور ناتجربہ کاروں سے اکثر سرزد ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی عورت دیدہ ودانستہ اور قلیل منفعت کے لئے یا بغیر کسی منفعت کے ایسا کرے تو وہ ضرور پاگل ہے۔ اس بارہ میں موسیو کومنجہ (Commenjes) نے فرانس کے متعلق جو تجربات لکھی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ موسیو مذکور لکھتے ہیں کہ:۔ "بہت سی لڑکیوں کے نزدیک شرم وحیا اور اخلاق کوئی چیز ہی نہیں۔ انھیں بعض اوقات اپنا جسم ننگا دکھانے میں بھی کسی قسم کی حیا نہیں آتی۔ اور بعض اوقات وہ اسقدر بیحیا اور بداخلاق ہو جاتی ہیں کہ وہ خود کو ذرا سے لالچ میں غیروں کے حوالہ کر دیتی ہیں۔ ان لڑکیوں کے نزدیک عصمت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اور بعض اوقات وہ بغیر فائدہ یا بغیر کسی جذبہ کے مرد کے آغوش میں پہونچ جاتی ہیں۔ وہ بعض اوقات اس کام میں حیوانوں کو بھی مات کر دیتی ہیں"

ایک لڑکی پندرہ سال عمر کی آرام وراحت سے اپنے والدین کیساتھ رہا کرتی تھی، اتفاقاً ایک اجنبی سے ملی جس نے اسے صرف دو فرانک دکھا کر اپنے ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔ وہ لڑکی بلا پس وپیش فوراً اجنبی کیساتھ چلی گئی کا قول ہے کہ ایسی خراب ہوئی کہ خود مردوں کے پیچھے پھرنے لگی۔ اسی طرح ایک

چہاردہ سالہ لڑکی نے جو اپنے والدین کے ساتھ بآرام و راحت رہتی تھی اپنی موتی سی آبرو کھوئی وہ ایک میلہ میں گئی تھی جہاں اسے ایک مرد نے بیر شراب کا صرف ایک جام پیش کیا تھا۔ اسکے بعد وہ لڑکی کسبیوں سے میل جول رکھنے لگی۔ اسی عمر کی ایک اور لڑکی مقامی میلہ دیکھنے گئی۔ وہاں اسکا ہنڈولہ میں جھولنے کو دل چاہا۔ اس نے ہنڈولہ والے کو محض جھلانے کے عوض میں اپنی عصمت پیش کردی ایسا ہی ایک دوسری پندرہ سالہ لڑکی نے کیا۔

امریکہ کے ڈاکٹر ڈبلو ٹریولیس جب (W. Travis Gibb) نے ۱۹۰۷ء میں "میڈیکل ریکارڈ" (Medical Record) بابتہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۷ء میں تحریر کیا ہے کہ چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ "زنا بالجبر" کے جتنے واقعات ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن میں لڑکی کی رضامندی حاصل کرلی جاتی ہے

## جسمانی خصوصیات

سب سے زیادہ ظاہر اور جاذب نظر چیز انسان کا چہرہ ہے۔ فرانس میں تقریباً ایک ہزار کسبیوں کو پانچ جماعتوں میں درجہ وار تقسیم کرکے ان کے چہروں پر غور کیا گیا۔ ان میں صرف چودہ فیصدی کسبیاں درجہ اول میں داخل ہوسکیں۔ لیکن ان میں بھی کوئی ایسی نہ تھی جسکی نسبت یہ کہا جاسکے کہ وہ مست شباب یا صاحب حسن و جمال ہے۔ اسی طرح ووڈس ہچنسن (Hutchinson) نے لندن۔ پیرس۔ وائنا۔ نیویارک۔ فلاڈلفیا اور شکاگو کی بیشمار کسبیوں کو بغور دیکھا۔ لیکن وہاں بھی اس نتیجہ پر پہونچے کہ واقعی کسبیوں میں خوبصورت یا کم از کم نظر فریب چہرہ شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ ان میں عام معیار حسن و جمال اور عورتوں سے بدرجہا پست ہے۔

علاوہ اسکے اگر ان کے دیگر اعضاء جسمانی کا بغور معائنہ کیا جائے تو بہت سی اور خامیاں بھی دکھائی دینگی۔ چنانچہ ڈاکٹر پالائن تارنووسکی (P. Tarnowsky) نے روس میں ڈاکٹر بونہوفر (Bonhoeffer) نے جرمنی میں۔ فورناساری (Fornasari) آردو (Ardu) جیوفریدا روگیری (Giufridaruggi) و آسکریلا (Ascorilla) نے اطالیہ میں و ڈاکٹر پیریٹ الگزینڈر، ڈاکٹر ای۔ ایس۔ ٹلباف و ڈاکٹر جے۔ جی کیرنان نے امریکہ میں بہت سی کسبیوں کا معائنہ کیا تو حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

(۱) برابر قد و قامت کی عورتوں سے ان میں وزن زیادہ ہوتا ہے۔ (۲) ہاتھ بڑے بڑے ہوتے ہیں لیکن بازو چھوٹے۔ (۳) ٹخنے چھوٹے پنڈلیاں بڑی اور رانیں نسبتاً ان سے بھی بڑی ہوتی ہیں۔ (۴) کھوپڑی کا قطر و محیط کم ہوتا ہے۔ نہ صرف بمقابلہ معزز عورتوں کے بلکہ عادی چوروں کے مقابلہ میں بھی کم ہوتا ہے۔ (۵) جبڑے کی ہڈی نمایاں ہوتی ہے (۶) معزز عورتوں کے مقابلہ میں بال زیادہ سیاہ ہوتے ہیں (۷) نہ صرف سر پر بلکہ پیڑو پر بھی بال زیادہ ہوتے ہیں۔ (۸) آنکھیں بمقابلہ معزز عورتوں بلکہ عادی جرائم پیشہ لوگوں کے بھی زیادہ سیاہ ہوتی ہیں۔

## قحبگی کا اخلاقی پہلو

دنیا میں ہمیشہ ایسے معلمین اخلاق رہے ہیں اور رہینگے جن کی رائے نہایت صائب تصور کی جاتی ہے۔ اور ادارۂ قحبگی کے متعلق جو خیالات انھوں نے ظاہر کئے ہیں وہ اس قابل ضرور ہیں کہ ان پر غور و خوض کیا جائے۔ ان لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اگر حفظان صحت کے متعلق ضروری انتظامات موجود ہوں تو کسبیوں کا مسئلہ زیادہ سخت نہیں رہتا

ان لوگوں کے نزدیک ان کا وجود ایک "معصیت ناگزیر" ہے۔ ایک مفید ادارہ ہے معزز گھرانوں کی عصمت وعفت کا پشتیبان ہے۔ اور وحدت ازدواج سے جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں انکی اصلاح ایک زبردست مصنف نے انکی شاعرانہ تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "کسبی اخلاق عامہ کی بداخلاق نگران کار ہے" ایک دوسرے مصنف کا قول ہے کہ "یہ ایک مجلسی ومعاشرتی مقصد کو پورا کرتی ہے۔ وہ اور لڑکیوں کی عصمت وعفت کی محافظ ہے" اسی طرح بلزاک (Balzac) نے اپنی کتاب "Physiologie du mariage" میں انکی نسبت لکھا ہے کہ "وہ خود کو جمہوریت پر قربان کر دیتی ہیں۔ اور اپنے جسموں کو معزز خاندانوں کا پشتیبان بنا دیتی ہیں"

اسی طرح شوپنہارد (Schopenhauer) نے لکھا ہے کہ "یہ وحدت ازدواج کی قربانگاہ پر انسانی قربانیاں ہیں" اسی طرح لیکی (Lecky) نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ اخلاق یورپ" میں لکھا ہے کہ وہ ہرچند بدترین قسم کا گناہ ہے لیکن پاکدامنی اور نیکوکاری کا بڑا محافظ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو بیشمار شاد کام خاندانوں کی عصمت وعفت میں داغ لگ جاتا۔ اور جو لوگ اپنی پارسائی و پاکدامنی کے غرور میں کسبیوں کو بنگاہ نفرت وحقارت دیکھتے ہیں انھیں خجالت کا منھ دیکھنا پڑتا۔

قدیم یونانیوں میں اداراتِ فحش موجود تھے۔ لیکن انھوں نے ان ادارات کو کبھی مضرت رساں صورت اختیار نہ کرنے دی۔ اسی باعث انکے ہاں قحبگی کے ادارات سرکاری طور پر قائم تھے۔ لیکن رومی جو یونانیوں کے شاگرد تھے مگر بسیقدر

زاہد خشک واقع ہوئے تھے، ادارات فحش کو بلا پس وپیش قبول کرنے کیلئے ہرگز تیار نہ تھے تاوقتیکہ ان ادارات کے اخلاقاً جواز کا انھیں قائل نہ کر دیا جائے۔ بعد ازاں یہی رومی تھے جنکا مشہور مدبر و سیاست داں، صاحب السیف والقلم، اور مفتی و پرہیزگار فلسفی کیٹو محتسب نے ایک شخص کو قحبہ خانہ سے نکلتے دیکھکر اظہار امتنان و تشکر کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ اگر قحبہ خانہ نہ ہوتا تو یہ شخص اپنے ہمسایہ کی بیوی کے ساتھ سوتا۔ الغرض معاشرتی لحاظ سے قحبگی کے جواز کی حجت بہت قدیم حجت ہے۔

جب دین مسیحی کا دور دورہ ہوا تو چونکہ اس میں جوشیلے عیسائیوں کو نفس کشی اور ایذا رسانی میں بے حد غلو تھا اسلئے لازمی طور پر قحبگی کے اثرات اخلاقی پر نہایت توجہ ہونے لگی۔ اب یہاں ایک خاص بات پیدا ہوئی یعنی عوام کا رجحان طبع دیکھکر یہ ناممکن پایا گیا کہ اخلاقی لحاظ سے کسبیوں کے خلاف فتویٰ صادر کیا جاسکے اور ضرورت اسی کی تھی اسلئے معتدایان دین مسیحی میں دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک وہ جو نفس کشی اور تجرد کے حامی تھے۔ دوسرے وہ جن کے شانوں پر اقتدار دین کے علاوہ تدبر و سیاست کا بار گراں بھی رکھا گیا تھا۔ موخر الذکر طبقہ نے اخلاقاً جواز کا پہلو ناخواستہ قائل ہوگیا۔ اس کی بہترین مثال ہمیں مشہور و معروف مسیحی سان آگسٹین (Augustine) کی ہستی میں ملتی ہے جو پولوس کے بعد تعمیر کلیسا کے لئے سب سے بڑا ذمہ دار شخص تھا۔ اسنے اپنی ایک کتاب میں جو ۳۸۶ء کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ "جسطرح ایک بلا دخواہ اس کا پیشہ کتنا ہی قابل نفرت و حقارت ہو، سوسائٹی کے لئے ناگزیر ہے اسی طرح کسبیاں جنکا پیشہ خواہ کتنا ہی ذلیل اور نفرت انگیز ہو نظام معاشرت کے لئے ضروری ہے۔

آج تم کسبیوں کو دور کردو۔ کل ہی تمام دنیا شہوات نفسانی سے پُر ہو جائیگی"
مشہور مفکر سان ایکوناس (Aquinas) کی بھی یہی رائے
تھی جو سان آگسٹین کی تھی۔ اس شخص کا قول یہ تھا کہ اگرچہ بدکاری گناہ کبیرہ
ہے لیکن کسبیوں کا وجود اصلاح معاشرت کے لئے ناگزیر ہے۔
لگوری بھی (Gregory) جو زمانۂ حال کا سب سے زیادہ
بااثر عالم دینیات تھا، یہی رائے رکھتا تھا۔
الغرض بعض لوگ قحبگی کے خلاف تھے اور بعض اسے "معصیت ناگزیر"
خیال کرتے تھے۔ ایک تیسرا طبقہ بھی تھا جسکا قول یہ تھا کہ بڑے بڑے شہروں
میں اگر کسبیاں ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن شہروں سے باہر نہ رہنی چاہئیں
کسبیوں کے ساتھ تو خیر کلیسائے مسیحی بعض مراعات مدنظر رکھتا تھا۔ لیکن
وہ قرمساقوں اور مشاطہ عورتوں کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ الویرہ کی مسیحی مجلس
نے فتویٰ دیا کہ اگر کوئی کسبی نکاح کرلے تو اسے بغیر کفارۂ مسیحی برادری میں
شامل کیا جاسکتا ہے لیکن قرمساقوں کو مرتے دم تک یہ سعادت نصیب نہیں ہوسکتی۔
دنیا میں مقتدایان مذہب کا شعار ہمیشہ یہی رہا کہ انکی پبلک زندگی سے
انکی پرائیویٹ زندگی مختلف رہی ہے چنانچہ کیتھولک پادریوں کا بھی یہی حال
تھا وہ فحاشی کے خلاف تو فتویٰ دیتے تھے لیکن خود اسکے مرتکب ہوتے تھے۔ چنانچہ
عہد "اصلاح مذہب" (Reformation) کے ایک صدی بعد
انگلستان میں ایک شخص برٹن (Burton) نے انگلستان میں پادریوں
کے خلاف قلم اٹھایا اور انھیں خوب ذلیل کیا۔ اسکے ایک صدی بعد انگلستان

میں برنارڈ مینڈیوائل (Bernard Mandeville) نے کسبیوں کی حمایت میں پھر قلم اٹھایا۔ اور اسکے بعد سے تمام پروٹسٹنٹ ممالک میں قحبگی کے ادارے ہوگئے۔

وڈس ہچنسن (Woods Hutchinson) نے کسبیوں کی نسبت لکھا ہے کہ "طبی اور اقتصادی" نقطۂ نظر سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہیئت اجتماعی کے لئے انکے خدمات نہایت قابل قدر ہیں۔ یہ گویا ادارۂ ازدواج کے حق میں ایک "سیفٹی والو" (Safety Valve) کا کام دیتی ہیں۔"

## فحاشی کا اثر تمدن پر

اخلاقی لحاظ سے تو خیر جواز قحبگی کا فتویٰ دیا ہی جاتا ہے لیکن ایک دوسری صورت بھی ہے جو مفکرین نے اسکے جواز کے لئے سوچی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شب و روز زندگی کی یکسانیت سے انسان کا جی اکتا جاتا ہے۔ اسلئے اس میں کچھ اختلاف پیدا کرنے اور اسکو خوشگوار و پر لطف بنانے کے لئے ضرورت ہے کہ کوئی ایسی نئی بات پیدا کی جائے جو زندگی کو خوشگوار بنائے۔

چونکہ شہری زندگی میں کاروباری مقابلہ اور کسب معاش زندگی کو کسیقدر بدمزہ بنا دیتے ہیں۔ اور صبح سے شام تک مردوں کو یکساں کام کرنا ان کے قویٰ کو مضمحل کر دیتا ہے۔ اسلئے یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسیقدر تفریح کا سامان بھی بہم پہونچے۔ اور کسبیوں کیوجہ سے مجلسی ربط ضبط کے مواقع بہت زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ علاوہ اسکے چونکہ شادی کے اسباب آسانی سے فراہم نہیں

ہوسکتے اور شہری زندگی میں نکاح زیادہ عرصہ تک ملتوی رکھا جاتا ہے۔ اسلئے تقاضا فطرت پورا کرنیکے ذرایع تلاش کرنا اور زیادہ ناگزیر ہوجاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ "ذرائع" سوائے کسبیوں کے اور کیا ہوسکتے ہیں ؟۔

**تفریح کا شوق** اس میں شک نہیں کہ ہمارے تمدن کی پیچیدگی کی وجہ سے انسانی نشوونما کو بہت نامکمل مواقع حاصل ہیں اور یہی سبب ہے کہ عورتیں عارضی یا مستقل طور پر فحاشی کی زندگی اختیار کرلیتی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قحبگی کے اسباب وعلل میں اقتصادیات کا حصہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ اور نہ یہ خیال کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ عورت شدت خواہش کی بنا پر ایسا کرتی ہے مگر بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی لامعلوم اور اندرونی تحریک کے باعث جسکی وہ توجیہ یا توضیح نہیں کرسکتیں لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد قحبگی پیشہ اختیار کرلیتی ہے۔

میریک (Mearick) نے لندن کی پانچہزار کسبیوں کی تحقیقات کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ تقریباً ایک ثلث عورتوں نے خود بخود اپنا گھر "عیش کی زندگی" بسر کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔

امریکہ میں ڈاکٹر سینجر (Sanger) نے یہ معلوم کیا کہ جو عورتیں "طبعی رجحان" کے باعث کسبیاں بنیں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ اور وہ ڈس ہچنسن کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکا بڑا سبب شوق نمائش، عیش پسندی اور تن آسانی ہے۔ بلجیم میں جب بوقت اندراج رجسٹر عورتیں قحبگی اختیار کرنے کا سبب بتاتی ہیں تو وہ زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ انھیں "کام سے نفرت" ہے یہی حال اطالیہ کا ہے۔ روس میں جب اسکے اسباب وعلل کی تحقیقات کی گئی تو دوسرا نمبر اُن عورتوں کا تھا جنھوں

نے "شوق تفریح" میں یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔

لندن کے ایک بہت بڑے محقق نے نہایت غور وخوض کیساتھ ان کے حالات اور زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اسباب تجملی میں چہل پہل اور تفریح دلچسپی کی خواہش کو بڑا دخل ہے کیونکہ عورت کا دل عام مشاغل وافکار سے گھبرا جاتا ہے۔ اور اسکی طبیعت زندگی کے جھگڑوں سے بیزار ہوکر لطف وتفریح کی متمنی ہوتی ہے، چنانچہ بقول ایف شیلر (F. Schiller) یہی سبب ہے کہ نشو ونمائے تمدن کیساتھ کسبیوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھتی جارہی ہے جسکا ثبوت یہ ہے کہ برلن میں چند سال کے اندر اگر عام آبادی کی تعداد دوگنی ہوئی تو ان کی تعداد چوگنی ہوگئی۔

چارلس بوتھ (Charles Booth) نے لکھا ہے کہ ایک کسبی سے کہا گیا کہ "کمبخت تو یہ ذلیل پیشہ کیوں نہیں چھوڑ دیتی؟" تو اس نے نہایت صاف جواب دیا کہ "سنئے جناب میرا چاہنے والا روز مجھے کہیں نہ کہیں ڈنر میں لیجاتا ہے۔ اور پھر ڈنر سے فارغ ہوکر کسی تماشہ گاہ میں جاکر تفریح کرتے ہیں پھر فرمائیے میری کیا شامت آئی ہے جو میں ایسی پرلطف زندگی سے دستبردار ہوجاؤں"

## خادمائیں کیوں اکثر پیشہ ور بنجاتی ہیں

ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں کہ کسبیوں میں زیادہ تر اضافہ ان عورتوں سے ہوتا ہے جو شریف اور متمول گھرانوں میں پیشخدمت یا ماما کا کام کرچکی ہیں۔ یہی وہ واقعہ ہے جس میں اس امر کا صریح ثبوت ملتا ہے کہ وہ ایسی کون سی

خفیہ تحریک ہے جو ایسی عورتوں کو قحبگی پیشہ اختیار کرنے پر مائل کر دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کہنے کو تو ہماری سوسائٹی ہر قسم کی مساوات کا دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن دراصل عملاً وہ عورتیں جو شریف گھروں میں کام کرتی ہیں انھیں تنخواہ دار مزدور سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا۔ وہ گویا گھر کا کام کاج کرنے والی مشینیں ہیں اور جو زندگی آقا بسر کرتے ہیں اس میں انکو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔ سچ پوچھئے تو گھروں کی نوکری چاکری بھی غلامی ہے۔ ہر خادمہ یا ماما علی الصباح اپنے کام پر پہنچتی ہے رات گئے مالک کے گھر سے چھٹکارا ہوتا ہے۔ اور نیچے آتے جاتے ادھر ادھر پھرتے ہوئے ٹانگیں درد کر جاتی ہیں۔ اسپر بھی مالک یا مالکہ اس بات کو اپنا ہنر یا گھڑپن سمجھتے ہیں کہ اس "گھریلو مشین" سے جسقدر کام لیا جائے اسیقدر کم ہے۔ علاوہ ازیں مالکہ اور دیگر نوجوان عورتوں کی بدمزاجی برداشت کرنا اور ملاحیاں سننا بھی خدمتگاروں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ الغرض انھی باتوں کو محسوس کر کے یہ عورتیں تنگ آجاتی ہیں اور ایسی ذلیل چاکری پر موت کو ترجیح دیتی ہیں۔ بیوی جہاں چاہیں آئیں جائیں لیکن غریب خادمہ اپنے عزیزوں سے بھی نہیں ملسکتی۔ اور پھر اسپر بھی یہ ستم ہے کہ منھ سے اُف تک نہ نکالے۔ اور نہ کوئی اپنی فطری خواہش ظاہر کرے۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ وہ دوزخ اور جنت کے درمیانی طبقہ یعنی اعراف میں رہتی ہے۔ یعنی وہ اپنے چاروں طرف عیش و آرام اور ہر قسم کا سامان تعیش دیکھتی ہے لیکن اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔ آخر وہ بھی انسان ہے۔ وہ بھی پہلو اور پہلو میں ایک حساس دل رکھتی ہے۔ اسکا دل بھی عیش و آرام اور تفریح کا متمنی ہے۔ مگر

بانیہہ اس غریب کو کولھو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک بلکہ کچھ رات گئے تک لگاتار غلامی کرنی پڑتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ وہ روزانہ زندگی کی بے لطفی اور یکسانیت سے اُکتا کر وہ پیشہ اختیار کر لیتی ہے جس میں اسکی تفریح بھی ہوتی ہے اور زندگی بھی عیش و آرام سے گذرتی ہے۔

## عورتوں کی تخریب میں مردوں کا ہاتھ

بعض اوقات یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کسبیوں میں سابق خادماؤں اور پیشہ مستوں کی کثرت ہونیکا باعث یہ بھی ہے کہ ایسی لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جنھیں اول اول انکے آقاؤں یا خاندان کے دیگر نوجوانوں نے خراب کیا۔ اور اس طرح وہ کسبی بننے پر مجبور ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسمیں مردوں کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ان عورتوں کے کسبی بننے کا خاص سبب یہی ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ آقا اور خادمہ کے تعلقات ایسے ہونا ضروری بھی نہیں پھر تجربہ یہ کہتا ہے کہ گھروں میں مامائیں کو گھر کے نوجوان خراب نہیں کرتے بلکہ وہ خود انھیں برائی کی طرف مائل کرتی ہیں۔

ناجائز بچوں کے متعلق جو اعداد و شمار سرکاری طور پر رکھے جاتے ہیں ان سے بھی اس معاملہ پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً برلن میں ایک سو اسی عورتوں نے ناجائز بچے جنے جن میں ایک ثابت تعداد خادماؤں اور پیشہ مستوں کی تھی اور بقیہ میں زیادہ تر وہ لڑکیاں تھیں جو کسی کارخانہ یا دکان میں کام کیا کرتی تھیں ایک سو بتیس صورتوں میں ان بچوں کے باپوں کے حالات بھی محقق ہو سکے۔ ان میں سب سے بڑی تعداد یعنی تینتیس کاریگروں کی تھی۔ ان کے بعد بائیس

کاروباری لوگوں کا نمبر تھا۔ صرف بیس پچیس آدمی ایسے تھے جنھیں "جنٹلمین" کہا جاسکتا تھا۔ انیس صورتیں ایسی تھیں جن میں بچوں کے باپ شادی شدہ تھے۔

مفتشین و محققین کا یہ قول ہے کہ اکثر ممالک میں لڑکیاں عموماً پندرہ اور بیس سال کی عمر کے درمیان کسبیاں بنجاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انکی عصمت و عفت کا خاتمہ اس عمر سے بھی بہت قبل ہوچکا ہوگا۔ اور آبروریزی میں زیادہ تر انہی لڑکیوں کے ہم مرتبہ ہم طبقہ مردوں نے حصہ لیا ہوگا۔ عام لڑکیوں کو عموماً عام آدمی ہی خراب کرتے ہیں۔ یعنی مزدور عورتوں کو کاریگر جو انکے ہم مرتبہ اور ہم طبقہ ہوتے ہیں سبز باغ دکھاکر گمراہ کرتے ہیں۔

## تمدن عمرانی کی کشش

فرانس کے شہر بورڈو میں ڈاکٹر جینل (Jeanel) نے کسبیوں کی بہت کافی تحقیقات کرنیکے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ یہ امر باور کرنیکے کافی وجوہ ہیں کہ دیہات کی لڑکیاں عموماً اسوجہ سے شہر میں نوکری کرنے جاتی ہیں کہ وہاں پہلے ہی خراب ہوچکی ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں دیہات میں جو لڑکیاں سست اور کم عقل لڑکیاں ہوتی ہیں وہ عموماً شہروں میں نوکری کرنے بھیجی جاتی ہیں

اڈنبرا میں ڈبلیو ٹیٹ (W. Tait) نے معلوم کیا کہ مردوں کے دیگر طبقات سے زیادہ فوجی سپاہی خصوصاً "گھاگ رائفل مین" (Highlanders) کے جوان عورتوں کو بھگاکر خراب کرتے ہیں۔ اور یہی حالت دیگر ممالک کے سپاہیوں کی ہے۔ مثلاً جرمنی میں مسلسل تحقیقات کرکے دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی بسلسلہ چاندماری یا نقلی جنگ دیہاتی علاقوں میں فوجیوں کا اجتماع ہوجاتا ہے۔

توحرامکاری کی بھی کثرت ہوجاتی ہے۔ یہی حال آسٹریلیا کا ہے جہاں کی نسبت ڈاکٹر گروس ہافنجر (Gross Hoffinger) نے لکھا ہے کہ اس ملک میں جتنے ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں کم از کم ایک ثلث کے وجود کے ذمہ دار فوجی سپاہی ہوتے ہیں۔

اطالیہ میں ماروزو (Marozo) نے بائیس کسبیوں کے متعلق تحقیقات کرکے لکھا ہے کہ ان میں سے دس لڑکیوں نے مردوں کے چھیڑتے ہی فوراً خود کو حوالہ کردیا تھا۔ اور دس ایسی تھیں جن سے شروع میں کسی مکار اور بیوفا عاشق نے شادی کرلینے کا جھوٹا وعدہ کیا اور عصمت دری کی۔ بقیہ دو لڑکیاں ایسی تھیں جنکی آبروریزی کی گئی تھی۔ ان نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ ازالۂ دوشیزگی کے بعد ہی لڑکی کی طبیعت میلان جنسی اختیار کرلیتی ہے۔ جسکے پورا ہونے کی صرف تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یعنی شادی جسکا انجام پانا دقت طلب ہے۔ دوم استلذاذ بالنفس یا بالمثل۔ سوم قحبگی۔ موخرالذکر صورت چونکہ زیادہ دلفریب اور خوش آیند ہے لہذا زیادہ لڑکیاں اسی طرف مائل ہوجاتی ہیں۔

جزیرۂ سارڈینیا میں لے مانٹیگزیا اور سیوفو (Mantegazza & Ciuffo) نے کسبیوں کی تحقیقات کرکے معلوم کیا کہ یہاں زیادہ تعداد ایسی لڑکیوں کی ہے جو دیہات کی رہنے والیاں ہیں اور جنھیں شروع میں انکے ہم طبقہ مردوں نے خراب کردیا تھا۔

الغرض معاشرت عمرانی کی دلفریبی و دلکشی۔ عیش رانی اور تن آسانی کی طرف رغبت۔ ہیجان تفریحی کا ذوق یہ سب ملکر دیہاتی لڑکیوں کو اپنی طرف

مائل کرتے ہیں اور یہی باعث ہے کہ دیہات کی لڑکیاں جنھیں اپنی سادہ زندگی میں یہ باتیں حاصل نہیں ہوتیں۔ ان دلچسپیوں کا زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ اور کچھ دنوں ادھر اُدھر خراب ہو کر بالآخر کسبیاں بنجاتی ہیں

شہر کی لڑکیاں چونکہ اسی ماحول میں پیدا ہوتی اور پرورش پاتی ہیں، اسلئے شہری تمدن سے ان کا دل سیر ہوتا ہے۔ وہ شہر کی دلچسپیوں اور تفریحات سے مسحور نہیں ہوتیں۔ علاوہ ازیں وہ اسقدر ہوشیار ہوتی ہیں کہ بمقابلہ دیہاتی لڑکیوں کے وہ ان دلفریبیوں کی کشش سے محفوظ رہتی ہیں۔ اور وہ کسبیوں کی زندگی کے اصلی واقعات سے بھی اسقدر واقف ہو جاتی ہیں کہ تاوقتیکہ کوئی خارجی اثر نہ ہو ان کی طبیعت تجگی پیشہ کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ الغرض شہر کی لڑکی تجگی کے زہریلے اثر سے زیادہ محفوظ رہتی ہے۔

عموماً تمام بڑے بڑے شہروں میں دیکھا گیا ہے کہ اگر اکثریت نہیں تو آبادی کی بہت بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے جو شہر سے باہر پیدا ہوئی تھی۔ پھر کون سی تعجب کی بات ہے کہ شہر کی کسبیوں کی بھی تعداد زیادہ تر باہر والیوں کی ہو الغرض ہر جگہ یہی حال ہے۔ اسی سلسلہ میں میریک (Merrick) نے نل بینک جیل میں چودہ ہزار کسبیوں کی تحقیقات کر کے معلوم کیا کہ سب سے زیادہ تعداد ان عورتوں کی تھی جو اضلاع میں پیدا ہوئی تھیں۔ اسی طرح لندن میں سات ہزار عورتیں ایسی تھیں جو نواحی اضلاع میں پیدا ہوئی تھیں علاوہ ازیں کول چسٹر (Colchester) جیسے لشکری مقامات اور پورٹسمتھ جیسے بندرگاہوں سے بھی لندن میں بہت پہونچ جاتی ہیں۔

ڈاکٹر سینجر نے تحقیقات کرکے معلوم کیا کہ نیویارک کی دو ہزار پیشہ ور عورتوں میں ۱۲۳۸ باہر کی ہیں ۷۶۲۔ ایسی ہیں جو ریاست نیویارک میں پیدا ہوئیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تعداد شمالی ملکوں سے آتی ہے جہاں کی آب و ہوا خراب نامنوشگوار ہوتی ہے۔ اور جہاں کے لوگ کارخانوں میں میکانیکی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ریوس ( Reeves ) کا بیان ہے کہ "پیرس کی تقریباً تمام پیشہ ور عورتیں باہر کی ہیں" بورو کی ایک ہزار عورتوں میں صرف ۱۴۶ ایسی تھیں جو شہر کی رہنے والی تھیں۔ اور بقول ڈاکٹر پوٹن ( Potton ) شہر لائیس ( Lyons ) کی تقریباً چار ہزار ایسی عورتوں میں صرف ۳۷۶ شہر کی رہنے والیاں ہیں۔ اسی طرح ۱۸۹۳ء میں ڈاکٹر شرمیک ( Shramek ) نے تحقیقات کرکے بیان کیا تھا کہ شہر وائنا کی ڈیڑھ ہزار پیشہ ور عورتوں میں سے صرف ۶۱۵ شہر میں پیدا ہوئی تھیں۔

واقعات بالا سے یہ امر ثابت ہے کہ یہ تمدن و شائستگی کے دلفریب مناظر ہیں جو عورتوں کو تجرد کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور مرد کچھ ان سے بڑی حد تک متاثر ہوتے ہیں۔ عام اور جاہل لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پیشہ ور عورتوں کا وجود محض اسلئے ہے کہ وہ نوجوان ناتجربہ کار مردوں اور ان مردوں کے لئے جنکی بیویاں نہ ہوں سکون کا باعث ہوں۔ مگر عقلاء کے نزدیک یہ خیال بالکل اصل ہے کیونکہ اگر اس اندیشہ سے تمام نوجوان مردوں کی شادیاں صغر سنی میں کر دی جایا کریں تو یہ علاج اصلی بیماری سے زیادہ مضر و نقصان ثابت ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ جن مردوں کی بیویاں موجود ہیں وہ کیوں فحاشی اختیار

کرتے ہیں۔ اسکا جواب اس واقعہ سے دیا جاسکتا ہے جو یورپ کی ایک پیشہ ور عورت ہڈویگ ہارڈ (Hedwig Hard) نے اپنی "آپ بیتی" میں بیان کیا ہے۔

جس شہر میں وہ رہتی تھی، وہیں ایک اعلیٰ طبقہ کا شخص بھی تھا۔ جو ایک مرتبہ اُسکے یہاں کسی سابق شناسا کے ساتھ آیا۔ اور پھر اسے بار بار آنے کا شوق ہوگیا۔ محبت کے پینگ بڑھے اور دونوں میں نہایت گہرے تعلقات ہوگئے۔ اس مرد کے بیوی تھی اور دو خوبصورت بچے بھی تھے۔ بیوی اسقدر حسین و جمیل تھی کہ مقامی مجمعوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ علاوہ ازیں دونوں میاں بیوی میں اسقدر الفت تھی کہ لوگ دیکھکر متعجب ہوتے تھے۔ مرد بھی زبردست صاحب علم و فضل شخص تھا۔ ایک دن اس عورت نے دریافت کیا کہ: "مجھے سخت حیرت ہے کہ باوجودیکہ تمھارے گھر میں اسقدر حسین و جمیل بیوی موجود ہے۔ دو پیارے پیارے بچے آگے کھیلتے ہیں۔ پھر تم کو میرے پاس آنیکا کیونکر حوصلہ ہوتا ہے؟"

یہ بات سُنکر وہ مرد مسکرا دیا۔ بولا:۔ "یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس بیوی کے حُسن و جمال سے میرے دل کو تسکین نہیں ہوتی، کیونکہ اسکا دل میرے دل کے برعکس ہے۔ علاوہ ازیں وہ سخت زبان، دراز اور بدمزاج ہے۔ ماں باپ نے ناز و نعمت میں پالکر اسکی عادتیں خراب کردی ہیں اور وہ دنیا میں صرف اپنے لئے جیتی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ مردوں کی بیراہ روی کی ذمہ داری بڑی حد تک بیویوں پر عاید ہوتی ہے، جو مردوں کے مزاج و ذوق کا خیال نہ کرکے اپنی طرف سے

انھیں بیزار کردیتی ہیں۔ اگر شروع سے لڑکیوں کی فطرت میں اتنی لچک پیدا کردیجائے کہ وہ ماحول کے مطابق اپنے عادات وخصائل میں تبدیلی پیدا کرسکیں تو مرد بڑی حد تک فحاشی سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

## مردوں کی عجیب سائیکالوجی

مرد جب ایک بار سیدھے راستہ سے ہٹکر غلط راہ اختیار کرلیتا ہے تو یہی اسکی گمراہیاں عجیب وغریب ہوتی ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ وہ دفعۃً انسان سے حیوان کیونکر بن گیا۔

مغرب کی ایک پیشہ ور عورت نے اپنی "زندگی کا کچا چٹھا" لکھا تھا۔ اس میں سے مندرجہ ذیل اقتباس غالباً باعث دلچسپی ہوگا، وہ کہتی ہے۔ کہ "میں دیہات کی رہنے والی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں کبھی کبھی ایک بوڑھا دولتمند آیا کرتا تھا۔ جو بالکل خوش غلاف ہوکر کھڑا ہوجاتا تھا۔ اسوقت میری عمر تیرہ سال کی تھی بالآخر یہ شخص گرفتار ہوکر قید ہوا۔ بعد کو میں نے مردوں میں عجیب وغریب شوق دیکھے۔ مثلاً میرے یہاں ایک جوان کھیل کے لباس میں آتا۔ اور اپنے ساتھ ایک ٹوکری میں بند کبوتروں کا ایک جوڑا بھی لاتا۔ اس جوان کے آنیکے بعد ہم دونوں بحالت عریانی ایک ایک کبوتر ہاتھ میں لے لیتے اور ان کی گردنیں مروڑ کر زمین پر ڈال دیتے۔ وہ جوان ان کبوتروں کو تڑپتا دیکھا کرتا صرف اسی سے اسکے ذوق کو تسکین ہوجایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ مجھے بازار میں ایک مرد ملا اور بولا کہ اگر آپ پسند کریں تو میرے ساتھ اس ہوٹل میں چلیں۔ وہاں میں آپ کے بوٹ چاٹنا چاہتا ہوں۔ معاملہ طے ہوگیا ہم دونوں ایک ہوٹل میں گئے نصف پونڈ

۱۶۵

میں ایک کمرہ لیا۔ میں میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ مرد میز کے نیچے گھس گیا اور اس نے میرے بوٹ جو کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اپنی زبان سے خوب چاٹے اور چلا گیا۔ ایک صاحب کا شوق صرف اس طرح پورا ہو جاتا تھا کہ وہ منھ میں بول کرا لیا کرتے تھے۔ ایک صاحب کو یہ شوق تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں ایک قینچی لاتے اور میری ساتھی عورت کو خوب پیٹتے حتیٰ کہ بیچاری کے خون تک نکل آتا۔ عورت کی یہ حالت دیکھکر ان حضرت کو انتہائی لطف آتا۔

# استلذاذ بالمثل

**استلذاذ کی مختلف صورتیں** حکماء کا قول ہے کہ جب انسان نشو و نما پاکر جوان ہوتا ہے تو اسکے قوائے جنسی میں تین اہم خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں (۱) استلذاذ بالنفس (۲) استلذاذ بالمثل (۳) استلذاذ بالضد۔

استلذاذ بالنفس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کا رجحان جنسی خود اپنی ہی ذات کی طرف مائل ہو۔ اور یہ کیفیت وحشی اقوام میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے

استلذاذ بالمثل سے مراد یہ ہے کہ مرد و عورت کا رجحان خود اپنی ہی جنس کی طرف ہو، جو زیادہ تر مکسی میں پایا جاتا ہے۔ اور استلذاذ بالضد سے وہ فطری تعلق جنسی ہے جس سے ہر شخص واقف ہے

چھوٹی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو عموماً دوسری جنس سے رغبت نہیں ہوتی بلکہ نفرت سی ہوتی ہے اور اسکا نتیجہ استلذاذ بالنفس کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جسے مساحقہ اور استمناء بالید وغیرہ کہتے ہیں، پھر جب نشو و نما میں پختگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو استلذاذ بالمثل کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور جب پوری طرح پختگی ہو جاتی ہے تو استلذاذ بالضد کی منزل آتی ہے۔

بعض شخص ایسے ہوتے ہیں جو دو جنسین ہوتے ہیں یعنی ان میں دونوں جنسوں کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔

## جنسیات اور استلذاذ بالمثل

افسوس ہے کہ دیگر فحاشیوں کی طرح اس نوع کی فحاشی نے بھی آغوشِ مذہب میں نشو و نما پائی۔ یونان قدیم کی خرافیات میں لکھا ہے کہ "سب سے پہلی آفرودیتہ دیوی (Aphrodite) بغیر ماں کے پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ یورینوس دیوتا نے اختلاط کے لئے اپنی ہی جنس کا ایک فرد پسند کیا تھا[1]۔ اس دیوتا کا جذبۂ عشق و محبت مردانہ تھا۔ جس شخص کے دل میں یہ "دیوتائی جذبہ" پیدا ہوتا ہے وہ استلذاذ بالمثل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔"

مشہور و معروف یونانی مورخ و سیاح ہیرو ڈوٹس نے سیتھین (Scythians) قوم کا حال لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ان لوگوں میں استلذاذ بالمثل کی نمایاں خصوصیات موجود تھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ اس قوم کے بعض مردوں میں نسائیت کا مادہ اس قدر پایا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کا لباس پہنتے ہیں اور عورتوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مورخ مذکور نے اس کی عجیب و غریب توجیہہ کی ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے بمقام عسقلان وینس دیوی (Venus) (زہرہ) کا مندر لوٹ لیا تھا اس لئے ان پر دیوی کا قہر نازل ہوا اور اس نے ان کو مرد سے عورت بنا دیا۔"

بقراط (Hippocrates) چونکہ مافوق الفطرۃ باتوں کا معتقد نہیں تھا اس لئے اس نے قوم سیتھین کی اس علت کا سبب ضعف رجولیت بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ قوم ضرورت سے زیادہ شہسواری کرنے کی وجہ سے ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے جس کا علاج کانوں کے پیچھے کی رگوں میں فصد کھلا کر

---

[1] افلاطون کی کتاب "ضیافت" Banquet باب ۸ و ۹

خون نکال دیتا ہے۔ اور اس خون کے نکل جانے کا نتیجہ ضعف رجولیت ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ افراد جو اس طرح اپنی قوت کھو بیٹھتے ہیں مایوس العلاج ہو کر عورتوں کا لباس پہن لیتے ہیں۔

بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ قدیم یونانیوں میں اسکا شوق اسوجہ سے پیدا ہوا کہ ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھتی جاتی تھی۔ اور اس کی روک تھام کے لئے وہ لوگ عورتوں سے بچنے لگے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں یونان کے اندر ریاستہائے بلدیہ کا رواج تھا۔ اور ایک شہر کے وسائل پیداوار چونکہ محدود آبادی کے لئے کفایت کر سکتے تھے اسلئے ان لوگوں کو یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ آبادی کی تعداد بڑھنے نہ دیجائے۔ یہی باعث تھا کہ حکیم ارسطو جیسے شخص نے بھی لوگوں کو یہی مشورہ دیا تھا کہ اپنی بیویوں کو چھوڑ دیں اور استلذاذ بالمثل اختیار کریں۔ لطف یہ ہے کہ ارسطو سے پیشتر حکیم سقراط بھی اس حرکت کو فعل مستحسن قرار دے چکا تھا۔

دیوتیما نے حکیم سقراط کو عشق و محبت کا ایک روحانی اصول بتایا تھا جو استلذاذ بالمثل کے ذریعہ سے ایک اور اعلیٰ منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور بذریعہ عشق خدا سے ملا دیتا ہے۔ چنانچہ دیوتیما کہتا ہے کہ :- "جو مرد خواہشات نفسانی کے بندے ہوتے ہیں وہ عورتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں لیکن وہ مرد جو اپنی روح کے وسیلہ سے عشق و محبت کرتا ہے اور جسکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ نکوکاری اور فرہنگ و دانش کے ذریعہ سے ایک صاحب عظمت اور خوبصورت روح حاصل کرے اس کو چاہئے کہ پوری طرح اسکا تابع ہو جائے۔" بظاہر تو یہ تعلیم نہایت پاک اور معصومانہ نظر آتی ہے لیکن یہ خیال کر لینا چاہئے کہ قدیم یونانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خوبصورت روح صرف

مرد ہی کے اندر ملسکتی ہے۔ اب غالباً اس تعلیم کا اصلی مفہوم واضح ہو گیا ہو گا۔ یہی قول ڈاکٹر ہیڈرالس ایم نیکل کا بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "صاحب عظمت اور خوبصورت روح" صرف مردانہ صورت میں ملسکتی ہے۔ عورتیں طبقۂ حیوان۔ مطلق سے متعلق ہیں اور وہ مرد کی صرف خواہشات نفسانی پوری کر سکتی ہیں"۔

جب قدیم یونانیوں نے عورتوں کی طرف سے غفلت کرنی شروع کر دی تو عورتوں میں بھی استلذاذ بالمثل کا رواج شروع ہو گیا۔ چنانچہ جزیرہ لیسبوس ایسی عورتوں کے لئے خاص طور پر مشہور ہو گیا تھا۔ اور اسی تاریخی واقعہ سے انگریزی کی اصطلاح (Lesbian Love) "عشق لسبانی" نکلی ہے۔ سیفو (Sapphe) جو بلبل لیسبوس کے نام سے مشہور تھی اور جو کہ زمانہ ۶۰۰ ق م کے قریب گذرا ہے وہ اس فن کی بہت بڑی استاد تھی۔ چنانچہ انگریزی میں لفظ "Sapphic" کا مفہوم ہی عورتوں کا استلذاذ بالمثل ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے "جذبات خصوصی" کا اظہار اپنے اس قصیدہ میں کیا ہے جو وینس دیوی کی شان میں لکھا تھا:—

"اے وہ جو پھولوں کے اورنگ عظمت و جلال پر متمکن ہو کر حکومت کر رہی ہے اے وہ جسکی پیدائش کف دریا سے ہوئی۔ او عیارہ! او بنت ذیوس، میری فریاد سن! او دیوی! تو مجھے سخت غم و الم اور درد دروں سے ہلاک نہ ہونے دے"۔

یونانیوں کے نزدیک معیار حسن و جمال درحقیقت حسن مردانہ تھا۔ اور اس حسن میں مادۂ ذو جنسیت (Bisexuality) گویا سونے میں سہاگہ تھا۔ یونان قدیم کے بتوں میں بھی یہی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اپالو اور دیونسوس کے بتوں میں زنانہ و مردانہ دونوں خصوصیات موجود ہوتی تھیں۔ زنانہ بتوں

میں بھی مردانہ حُسنِ صورت اور مردانہ تناسب اعضاء کا خیال رکھا جاتا تھا۔

دنیائے قدیم میں غیب دانی اور کہانت کا سب سے بڑا مرکز ڈیلفائی کا مندر تھا۔ اس میں سب سے بڑا بت اپالو تھا۔ اس بت کے حسن و جمال، تناسب اعضاء اور خدوخال میں زنانہ اور مردانہ دونوں خصوصیات موجود تھیں یہ بت فن موسیقی اور استلذاذ بالمثل کا خاص دیوتا تھا۔ کیونکہ دراصل یہ ڈورین (Dorian) قوم کا سب سے بڑا بت تھا۔ اور یہی وہ قوم تھی جو خطہ یونان میں استلذاذ بالمثل کی وبالائی تھی۔ اپالو کی نسبت یہ بھی روایت کیجاتی ہے کہ اس نے ایک اژدہے کو قتل کیا تھا جسکا خون جسم پر پڑنے سے وہ ناپاک ہوگیا تھا۔ یہ ناپاکی دور کرنے کی غرض سے وہ ایڈمیٹس (Admetus) شاہ پھیرائی (Pherae) کا نو برس تک معشوق بنا رہا۔

میولر (Muller) نے ڈورین قوم کے ایک مذہبی تہوار کا حال بیان کیا ہے جس میں ایک خوبصورت لڑکا اپالو کا روپ بھرتا تھا۔ اور ان باتوں کی نقل اُتارتا تھا "جب اپالو دیوتا نے آلسستیس (Alcestis) کا غلام اور معشوق بنکر اس کی نہایت "ذلیل خدمت" انجام دی تھی"۔

ڈاکٹر بلاخ (Bloch) کا خیال یہ ہے کہ چونکہ استلذاذ بالمثل قدیم زمانہ کی اقوام و ملل کے نزدیک ایک عجیب اور ناقابل فہم بات تھی اسلئے عجوبہ پرست لوگوں نے اس فعل مذموم کو بھی ایک قسم کا کراماتی فعل قرار دیدیا۔ اور یہی باعث تھا کہ جو عورت یا مرد اس کا شوقین ہوتا تھا اسکو وہ لوگ بہت بڑا صاحب کرامات یا مافوق الفطرۃ طاقتوں کا مالک سمجھتے تھے۔ اور اسکی بیحد عزت کا صرف

ایک جرمن فاضل ایڈولف باسچین Adolf Bastian کا نظریہ یہ ہے کہ قدیم اقوام و ملل کے پجاری جو قدرت کے قوائے ذوجنسیئن کے نمایندے تھے اپنے مندروں اور عبادتگاہوں میں استذاذ بالمثل کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے مرد فطرت کی قوت فاعلہ کی پوجا کرتے تھے اور عورتیں تخلیہ یا علحدگی میں فطرت کے قوائے نسائیہ کی تقدیس و تمجید کیا کرتی تھیں۔ اور چونکہ پجاریوں کو مرد و زن دونوں کی تالیف قلوب کرنی پڑتی تھی۔ اسلئے انھوں نے کمال وزوال جرم قمر سے تغیرات جنسی کا خیال حاصل کیا۔ اور یہ ڈھنگ اختیار کرلیا کہ جب وہ دیویوں کی خدمت کرتے تھے تو زنانہ لباس پہن لیتے تھے اور جب دیوتاؤں کی خدمت کا وقت آتا تھا تو مردانہ لباس میں کام کرتے تھے ستم ظریفی یہ کہ انھوں نے زہرہ کا بت مع داڑھی کے بنالیا اور ہرقلیس دیوتا کے ہاتھ میں چرخہ دیدیا۔ الغرض تقریباً تمام دیوتاؤں کو خصوصیات ذو جنسیت دیدی گئی تھیں۔ وینس اور آفرودیتہ کی پوجا بھی دونوں صورتوں میں کیجاتی تھی۔

فریزر نے اپنی کتاب "ایڈونیس" میں لکھا ہے کہ جزیرہ قبرص میں وینس کا ایک بت تھا جسکی وضع قطع تو ایک باریش و بردت مرد کی تھی مگر اسے لباس زنانہ پہنایا گیا تھا۔ مرد زنانہ لباس میں اور عورتیں مردانہ بھیس میں اس بت کی پوجا کرتی تھیں۔ اگرچہ باریش و بردت دیویوں کی پوجا خاص طور پر ملک شام اور جزیرہ قبرص میں ہوتی تھی لیکن قدیم مصریوں نے بھی آئسیز (ISIS) دیبی کا ایک ایسا ہی بت بنا رکھا تھا جس کی گود میں ایک بچہ ہورس بھی تھا۔ قدیم یونانیوں کا صنم اکبر ذیوس تھا۔ اسکی شان میں جو بھجن گائے جاتے

تھے ان میں بھی اس بت کی زنانہ اور مردانہ خصوصیات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ مثلاً

"ذیوس! ہوالاول! ہوالاخر۔ چمکتی ہوئی بجلیوں کا مالک۔ وہی سر ہے، وہی کمر ہے، اور اسی کے اندر سے تمام مخلوقات عالم وجود میں آئی۔ ذیوس ہی مرد ہے اور پھر ذیوس ہی عورت ہے۔ یعنی دوشیزۂ ازلی"

ایک دوسرے بھجن میں ایڈونیس کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے۔

"او بہت سے ناموں والے دیوتا، جو سب معبودوں میں بہترین ہے۔ میری سن! اپنے پرستار کی سن! اے خوبصورت بال والے ایڈونیس! جو ایک جوان رعنا اور دوشیزۂ طناز دونوں ہے"

علما و فضلا کا خیال یہ ہے کہ یونان میں امرد پرستی کا شوق ڈورین قوم نے جاری کیا تھا کیونکہ زمانۂ قبل تاریخ (مثلاً ہومر کے زمانہ میں) اسکا ذوق وہاں نہ پایا جاتا تھا۔

یونان میں امرد پرستی کا شوق خاص خاص لوگوں تک محدود تھا یعنی صرف آزاد شہریوں اور بانکے شہسواروں کو اسکی اجازت تھی۔ غلام طبقہ اسکی جرات نہ کرسکتا تھا اور اگر کوئی فرد اس طبقہ کا ایسا کرتا تو اسکے لئے سزائے موت مقرر تھی بڑھتے بڑھتے جب یہ شوق عام ہوگیا تو ایک معاشرتی ادارہ بنگیا اور حکومت نے بھی اسکی سرپرستی اختیار کر کے مختلف آئین و قوانین وضع کئے۔

اسپارٹا میں ایسے لوگوں سے سخت باز پرس کی جاتی تھی۔ اور اگر کسی لڑکے سے کوئی قابل شرم حرکت سرزد ہوجاتی تو اُسے تو کچھ نہ کہا جاتا تھا لیکن اسکو اغوا کرنے والے کو سخت سزا دی جاتی تھی۔

جزیرہ کرٹیا میں اس شوق نے اسقدر ترقی کی تھی کہ امارد سے "شادیاں" کی جاتی تھیں۔ اگر کوئی مرد کسی امرد پر مائل ہو جاتا تو اسکے والدین یا اعزہ کو آگاہ کر دیتا تھا۔ پھر اگر اسکے خاندان والے اس "رشتہ" یا تعلق کو پسند نہیں کرتے تھے تو وہ اس کی حفاظت کرتے تھے ورنہ پھر اس تعلق کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی۔ ایک امرد کا عاشق جسقدر اعلیٰ مرتبہ کا ہوتا تھا اسی قدر لڑکے کے خاندان والے فخر و ناز کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ معہ تحائف کے اپنے گھر بھیجدیا جاتا تھا۔

قدیم یونان کے طرز معاشرت میں امرد پرستی کا رواج اسقدر عام ہو گیا تھا کہ اگر کسی امرد کو کوئی چاہنے والا بانکا شہسوار نہیں ملتا تھا تو باعث شرم و ذلت سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر کسی کے چاہنے والوں کی تعداد درجنوں تک پہونچ جاتی تھی تو باعث فخر سمجھا جاتا تھا اور کرٹیا، تھیبا اور تھیرہ میں تو لڑکوں کے ساتھ شادی کرنے کی رسم کو مذہبًا منظور کر لیا گیا تھا۔ شہر تھیبا سے قریب سمندر کے کنارہ اپالو کے مندر سے تقریبًا ۷۰۰ گز کے فاصلہ پر وہ مقام ہے جو خداوند ذیوس کے نام سے معنون ہے۔ یہاں حسب ذیل کتبہ پتھر پر منقوش ہے:—

"اس مقدس و متبرک مقام پر زیر سایہ خداوند ذیوس بادشاہ کریون نے باقلیس کے بیٹے سے شادی کی۔ اور اس نے اپنی حرکت کا دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ اعلان کر کے اسکی یادگار میں یہ کبھی نہ محو ہونیوالا کتبہ قائم کیا۔ اسکے ساتھ بہت سے اہل تھیبے نے اور اسکے بعد بھی بہت سے لوگوں نے اسی مقدس مقام پر لڑکوں سے شادیاں کیں۔"

روم کے دور ملوکیت میں فحاشی اسقدر بڑھ گئی تھی کہ ان کو دیکھکر خیال گذرتا

تھا کہ شاید یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ اسی زمانہ کا حال قلمبند کرتے ہوئے بیبل (Baba) نے لکھا ہے کہ "مرد و زن فحاشی میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے۔ قحبہ خانوں کی تعداد بیحد بڑھ گئی تھی اور امرد پرستی کا ذوق اسدرجہ عام ہو گیا تھا کہ شہر روما میں عصمت فروش لڑکوں کی تعداد کسبیوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی لیکن اسکے بعد ایک زمانہ وہ بھی آیا جب امرد پرستی کیخلاف جہاد ہونے لگا اور شہنشاہ قسطنطین اور تھیوڈوسیس نے اتنی سخت سزائیں تجویز کیں کہ مرتکبین جرم کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔

## استلذاذ بالمثل اقوام و ملل قدیمہ میں

ڈاکٹر ڈبلیو۔ اے ہیمنڈ (Hammond) نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ امریکہ کی ریاست "نیو میکسکو" میں علاقہ "پیوبلوز" (Pueblos) کے قدیم امریکن قبائل میں یہ رواج ہے کہ انکا ہر قبیلہ اپنے ہاں ایک آدمی تیار کرتا ہے جسے انکی اصطلاح میں مجیرادو (Amujerado) کہتے ہیں۔ یہ شخص فصل بہار کی مذہبی رسوم اور تہواروں میں نہایت اہم حصہ لیتا ہے۔ ان تہواروں میں خوب رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں اور امرد پرستی کا بازار گرم ہوتا ہے۔

یہ شخص یعنی "مجیرادو" اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ قبیلہ میں سے کوئی تندرست مرد چن لیا جاتا ہے۔ اس شخص کو گھوڑے کی سواری خوب کرائی جاتی ہے اور کثرت کیساتھ استمنا بالید کی ترغیب دیجاتی ہے۔ یہانتک کہ وہ بانکل بیکار ہو جاتا ہے۔ اسکی داڑھی مونچھ کے بال گرنے لگتے ہیں، آواز کا مردانہ پن زائل ہو جاتا ہے اور مزاج میں نسائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسکے بعد "مجیرادو" کی جگہ مردوں میں نہیں رہتی۔

۱۷۵

وہ عورتوں کے اوضاع واطوار اختیار کرلیتا ہے اور پوری طرح عورتوں میں شامل ہوجاتا ہے لیکن بایں ہمہ رسوم اور تہواروں میں اسکی بڑی عزت کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ہینڈ کی چونکہ یہ قبائل بیحد عزت و توقیر کرتے تھے۔ اسلئے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو دو "مجیرادو" دیکھنے کا موقعہ دیا۔ ان میں ایک کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔ اور سات سال قبل اسکی قلب ماہیت ہوچکی تھی۔ پہلے وہ بڑا طاقتور مرد تھا۔ جبوقت ڈاکٹر صاحب نے اس شخص کو دیکھا تھا تو وہ عورتوں میں شامل ہوچکا تھا اور اسمیں اور عورتوں کے اطوار میں مطلق فرق نہ تھا۔ قدرت کا قاعدہ ہے کہ جب انسان کی کسی خاص قوت میں ضعف پیدا ہوتا ہے تو وہ دوسری طرف ظاہر ہونے لگتی ہے مثلاً اندھوں کا حافظہ قوی ہوجاتا ہے، انکی قوت لامسہ اور خوش گلوئی میں ترقی ہوجاتی ہے۔ اسی طرح جب اس شخص کی قوت مردی زائل ہوئی تو سینہ پر چھاتیاں بھی ابھر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا نئی بچوں کی "ماں" ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ کئی بچوں کو جن کی مائیں فوت ہوگئی تھیں اس نے اپنا دودھ پلاکر پالا۔ دوسرے "مجیرادو" کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ اسپر دس برس ہوئے نسائیت طاری ہوئی تھی۔ لیکن اسکی چھاتیاں زیادہ نہ ابھری تھیں۔ آواز میں نسائیت اور جسم میں گداز ضرور پیدا تھا۔

کثرت کیساتھ گھوڑے کی سواری کرنا اعضا مردمی کے لئے سخت مضر ہے۔ اور اس امر کی تائید بڑے بڑے ماہرین فن نے کی ہے۔ آپاچے اور نواجو قومیں اپنی عمر کا زیادہ حصہ گھوڑے کی پشت پر گذارتی ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ان کے اعضا مردی بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ عموماً ضعیف الباہ

اور سست ہوتے ہیں۔ کراپروتھ (Kraproth) اور چوٹومسکی (Cholomski) نے لکھا ہے کہ فی زماننا تاتاریوں میں نامردی کی علت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ جسکا باعث یہی ہے کہ وہ لوگ کثرت کے ساتھ گھوڑوں کی سواری کرتے ہیں۔

ویسٹر مارک[1] نے اپنی مشہور و یادگار کتاب "ابتداء و ارتقاء تخیلات اخلاقیہ" میں قوم کوریاس کا حال تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔ کراشے نینی کاف (Krashinenikoff) نے "قی ایف" (Ki-Veu) لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو مردوں کے پاس بطور حرم کے رہتے ہیں۔ موسیو موصوف بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ علاقۂ بحرین (Behring Strait) کی قوم قمچاولہ (Kamchdale) کے ان لوگوں کے مانند ہیں جنھیں ان کی اصطلاح میں کوئی قوق (Koe-Keue) کہتے ہیں یعنی وہ مرد جنھیں عورت بنالیا گیا کوئی قوق کو فن سحر و ساحری اور تعبیر خواب کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ زنانہ لباس پہنتے ہیں عورتوں کے کام کرتے ہیں اور مردوں کے ساتھ عورت کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔"

ایک اور جگہ شمالی امریکہ کے باشندوں کے متعلق ویسٹر مارک تحریر کرتے ہیں:۔

"شمالی امریکہ کے اصلی باشندے ان لوگوں سے کسی قسم کی نفرت نہیں کرتے جو استلذاذ بالمثل کے عادی ہیں یا جنھوں نے زنانہ لباس اور زنانہ اوضاع و اطوار

(1) Westermarck's Origin and developement of the moral ideas.

اختیار کر لئے ہیں ۔ بلکہ کاویاک میں ایسے افراد پر فخر و ناز کرتے ہیں ۔ اور ان کو محبت و قعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے "

کپتان جیمس ولن نے ۱۷۹۶ء لغایتہ ۱۷۹۸ء میں جزائر بحر جنوبی کی سیر و سیاحت کی تھی ۔ اور وہاں انھوں نے ایسے مرد دیکھے جو زنانہ لباس پہنتے تھے اور لوگ انکی عزت بھی کرتے تھے ۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ مجھے یہ بات دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ یہاں کی عورتیں بھی ان لوگوں سے نفرت و حقارت نہیں کرتیں بلکہ دوستانہ تعلقات رکھتی ہیں ۔

ایک دوسرے سیاح اور مبلغ جنھوں نے جزائر بحر جنوبی کی سیر کی تھی ولیم ایلس ( William Ellis ) ہیں ۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان جزائر کے باشندوں کو استلذاذ بالمثل کی اجازت نہ صرف پوجاریوں کی طرف سے ہے بلکہ وہ بعض اوقات اپنے دیوتاؤں کا سچا نمونہ بنجاتے ہیں ۔

چین و جاپان نیز ملایا میں بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ مقتدایان مذہب جنھیں بونزہ یا بونجہ ( Bonzes ) کہتے ہیں ان کے پاس لڑکے ہوتے ہیں جنکا تعلق مندر کی خدمت سے ہوتا ہے ۔ ہر پروہت یا پجاری کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ایک چیلا رکھے ۔ اسے تعلیم دے اور مذہبی رسوم ادا کرنا سکھائے ۔ اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ گرو اور چیلے دونوں میں بہت گہری محبت ہوتی ہے فرانسیس زیویئر جنھوں نے ۱۵۴۹ء میں جاپان کی سیاحت کی تھی ، انھوں نے بھی یہی حال بیان کیا ہے ۔ اور لکھا ہے کہ بونجہ لوگ خود اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ چیلوں سے انکے تعلقات شہوانی ہوتے ہیں ۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ فعل

کوئی گناہ نہیں ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ امارد سے تعلق تو انکے نزدیک کوئی گناہ نہیں مگر عورت سے تعلق رکھنا گناہ کبیرہ ہے جسکی سزا قتل ہے۔

ایک روسی سیاح موسیو داویداؤد Dawydow نے ۱۸۰۰ء کے قریب اپنا سفرنامہ لکھا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ شمالی امریکہ کے جزیرہ نمائے الاسکا (Alaska) کے متعلق کادیاک (Kadiak) نامی ایک جزیرہ ہے۔ جس میں کونیاگا قوم رہتی ہے۔ اس قوم میں بعض مرد پائے جاتے ہیں جن کی ٹھوڑیاں گودی ہوئی ہیں جو زنانہ لباس پہنتے ہیں۔ اور عورتوں کی طرح ان کے شوہر بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض کے تو بجائے ایک کے دو خاوند ہوتے ہیں ان کو وہاں کی زبان میں اخوتشیق (Achnuckuk) کہتے ہیں قوم میں ان لوگوں کی سب سے زیادہ عزت و توقیر کی جاتی ہے۔ اور لوگ عام طور پر انھیں جادوگر سمجھتے ہیں۔ جو مرد بجائے عورت کے اپنے گھر میں بطور بیوی یا حرم کے کسی "اخوتشیق" کو رکھتا ہے وہ قابل رشک خیال کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں جب کوئی بچہ صورت شکل میں زنانہ پیدا ہوتا ہے یا اسکے اوضاع و اطوار زنانہ ہوتے ہیں تو اس لڑکے کو "اخوتشیق" بنا دیا جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر والدین کو لڑکی کی خواہش ہے اور بجائے لڑکی کے پیدا ہو گیا لڑکا تو اس لڑکے کو "اخوتشیق" بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فریزر (Frazer) نے اپنی کتاب الموسومہ بہ ایڈونیس۔ آتیس واوسی ریز (Adonis Attis Osiris) میں جزیرہ پیلو (Pelew) کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ یہاں کے لوگ جو زنانہ لباس

پہنتے تھے اسکا باعث یہ بتایا جاتا تھا کہ دیوی جی عورت کو نہیں بلکہ اپنا پجاری اور بھگت مرد کو بنانا پسند کرتی ہیں۔ جب ایسا ہوتا تھا تو منظور نظر پجاری زنانہ لباس پہن لیتا تھا اور اسی روز سے اسے عورت سمجھا جاتا اور اسکے ساتھ عورتوں جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اکثر وحشی قبائل میں جو زنانے پائے جاتے ہیں اسکا باعث غالباً یہی عقیدہ ہے۔ ایسے لوگ عام طور پر بہت بڑے جادوگر اور طبیب خیال کیا جاتے ہیں۔ اس قسم کے زنانے پجاری اور جادوگر بورنیو کی قوم دیاک (Dyaks) جنوبی سیلی بیز کی قوم برجی (Bugis) جنوبی امریکہ کے پاٹاگونیل (Patagonia) اور جزیرہ مڈگاسکر میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ زنانہ لباس پہنتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ دیوتاؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ افریقہ کی سلطنت کانگو (Congo) میں ایک بڑا پجاری تھا جو عموماً زنانہ لباس پہنتا تھا اور جب لوگ اسے "نانی اماں" کہتے تھے تو وہ بہت خوش ہوتا تھا۔

ممالک مشرق کی قدیم ترین کتابوں میں اگر استلذاذ بالمثل کا ذکر کہیں آیا ہے تو بائبل میں آیا ہے۔ ملاحظہ ہو توریت صحیفہ پیدائش باب ۱۹۔ آیتہ ۴ لغایتہ ۸:۔

"اور اس سے پہلے کہ وہ لیٹے شہر کے مردوں یعنی سدوم کے مردوں نے جوان سے لیکے بوڑھے تک سب لوگوں نے ہر طرف سے اسکے گھر کو گھیر لیا اور انھوں نے لوط کو پکار کے کہا کہ وہ مرد جو آج کی رات تیرے یہاں آئے کہاں ہیں؟ انھیں ہمارے پاس باہر لا تاکہ ہم ان سے صحبت کریں۔ تب لوط دروازہ سے ان کے پاس باہر گیا اور کواڑ اپنے پیچھے بند کر لیا اور کہا کہ اے بھائیو ایسا برا کام نہ کرو اب دیکھو میری دو بیٹیاں ہیں جو مرد سے واقف نہیں مرضی ہو تو انکو تمھارے

پاس نکال لاؤں اور جو تمھاری نظر میں پسند ہو ان سے کرو مگر ان مردوں سے کچھ کام نہ رکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اقتباس مندرجۂ بالا سے دو باتیں معلوم ہوئیں جو حسب ذیل ہیں :-

(۱) اُس زمانہ میں شہر سڈوم (Sodom) استلذاذ کا زبردست مرکز تھا اسی لفظ سڈوم سے انگریزی لفظ سوڈومی (Sodomy) نکلا ہے جسکے معنی استلذاذ بالمثل کے ہیں ۔

(۲) لوط کے زمانہ میں امرد پرستی کا بیحد چرچا تھا ۔ اسی لفظ لوط سے الفاظ لوطی اور لواطت نکلے ہیں ۔ جو آجتک رائج ہیں ۔

ابتداء تاریخ سے اسوقت تک یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں اس کا شوق موجود رہا ہے ۔ اور اب بھی ہے ۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً بانیان مذہب اور مصلحین ملت اس فعل مذموم کو دین اور معاشرت کے خلاف جرم قرار دیتے رہے ۔ وادی فرات و دجلہ میں خط میخی (Cuneiform) کے جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں ۔ ان میں شہنشاہ آشوریہ حمورابی کے آئین و قوانین بھی درج ہیں ۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت ملک آشوریہ میں بھی یہ شوق موجود تھا ۔

ملک مصر کے علاقہ فیوم سے فلنڈرس پیٹری (Flinders Petrie) کو ایک قدیم مخطوطہ دستیاب ہوا تھا جس کا ترجمہ گریفتھ نے کیا تھا ۔ اسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چار ہزار برس سے زیادہ گذرے کہ اُسوقت بھی یہ فعل بکثرت رائج تھا اور لوگ اسے اسقدر اچھا سمجھتے تھے کہ انھوں نے اسکو اپنے دو مشہور معبود دیوتاؤں ہورس (Horus) اور سیت (Set) کی طرف منسوب

کر دیا تھا۔ قدیم مصریوں کے نزدیک یہ فعل کوئی جرم یا گناہ نہ تھا بلکہ وہ لوگ حسن مرقہ ہی کو معیار حسن و جمال سمجھتے تھے۔ اور ہرشفیلڈ (Hirschfeld) کا قول ہے کہ قدیم مصری عورتوں میں بھی استلذاذ بالمثل کا شوق موجود تھا[1]

حکیم ارسطو نے بیان کیا ہے کہ جزیرۂ کریٹا میں کثرت آبادی کم کرنے کی غرض سے یہ مشغلہ قانوناً جائز قرار دیا گیا تھا۔ اور پروفیسر ہیڈن کا قول ہے کہ شمالی آسٹریلیا اور نیوگنی کے جنوبی سواحل پر جو قومیں بستی ہیں ان میں بھی آبادی کی روک تھام کے لئے اسکی تائید و حمایت کیجاتی ہے۔ لیکن اسبات کی شہادتیں بہت کم ہیں۔

یہ مشغلہ زیادہ تر سپاہیوں اور جنگجو اقوام میں پایا جاتا ہے کیونکہ جنگ کے زمانہ میں فطری ذرایع حاصل نہ ہونے کی وجہ سے سپاہی استلذاذ بالمثل کی طرف راغب ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اہل قرطاجنہ، نارمنوں، ڈوریون (Dorians)، سیتھیون (Scythians)، تاتاریوں اور قلطیوں (Celts) میں اسکا بکثرت رواج تھا اور ... نیوکالیڈونیہ کے فوجیوں میں تو اسکی ضرورت سرکاری طور پر تسلیم کی جاتی تھی۔ اور اسکے متعلق قواعد و ضوابط بھی وضع کئے جاتے تھے۔

ڈاکٹر ہان (Hahn) لکھتے ہیں کہ اہل البانیہ میں اسکا شوق بکثرت پایا جاتا ہے[2]۔ اس ملک میں یہ شوق اگرچہ مسلمانوں میں زیادہ پایا جاتا تھا لیکن البانوی عیسائی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ بلکہ عیسائیوں میں تو یہ

---

[1] ملاحظہ ہو ہرشفیلڈ کی کتاب (Die Homosexualität) صفحہ ۳۹۰

(2) Albanische Studien, 1854 p. 166.

حالت تھی کہ پادری صاحب گرجا کے اندر اس رابطۂ غیر فطری کو برکت دیتے تھے[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل البانیہ اور قوم ڈورین دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ یونان میں اگرچہ اسکا شوق پہلے سے موجود تھا لیکن جب ڈورین قوم نے یونان فتح کیا تو انھوں نے اس فعل مکروہ کو اپنی معاشرت میں باقاعدہ طور پر داخل کرلیا۔ یہ قوم یونان کی شمالی مغربی سمت یعنی البانیہ سے آئی تھی۔ اور یونان فتح کرتے ہی وہ تمام گرد و نواح کے جزائر اور سواحل ایشیائے کوچک پر پھیل گئی۔ ڈاکٹر بیتھے (Bethe) نے ڈورین قوم پر ایک گرانقدر کتاب تصنیف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ قوم غیر فطری شادی کرنا جائز سمجھتی تھی۔ اور اس قسم کی "شادیوں" کے سلسلہ میں "مذہبی رسوم" بھی باقاعدہ ادا کیجاتی تھیں اور متقدایان دین "میاں بیوی" کی طرح انکو برکت دیتے تھے۔

جزیرہ کریٹ میں تو یہ حالت تھی کہ اگر کسی امرد کی طرف اس طرح کا میلان کرنیوالا نہ ہوتا تھا تو اسکی ذلت سمجھی جاتی تھی۔ ایشیا کے انتہائے مشرق میں اقوام (Tchak) (Tsches) اور (Kamschatdals) وغیرہ میں مردوں کے درمیان باقاعدہ شادیاں ہوتی تھیں۔ اور کبھی کبھی اس قسم کا "ازدواج" باہر گر عورتوں میں بھی ہوتا تھا۔ یہ "شادیاں" پورے تزک و احتشام اور مذہبی رسوم کیساتھ ہوتی تھیں اور قوم کا ہر شخص ان کی باقاعدگی کو تسلیم کرتا تھا[2]

---

[1] Näcks Jahrbuch für sexuelle Zwischens-
-tufen Vol. IX, 1908 p. 327.

ڈاکٹر نیک (Nacke) کا بیان ہے کہ قسطنطنیہ میں بھی اسکا رواج پایا جاتا ہے۔ اس طرح کے لڑکے وہاں کے حماموں میں اکثر پائے جاتے ہیں جو رات بھر کھلے رہتے ہیں۔ لیکن اب جدید ترکیہ میں یہ رواج تقریباً مفقود ہو گیا ہے[1]۔

چین میں بھی ایسے لوگوں کے خاص مکانات ہوتے ہیں اور جب کوئی دولتمند اپنے احباب کو مدعو کرتا ہے تو وہ عورتوں اور لڑکوں دونوں کے طائفے طلب کرتا ہے لڑکے خوب ناچتے ہیں اور اپنی بذلہ سنجیوں اور حاضر جوابیوں سے مہمانوں کا دل خوش کرتے ہیں۔ اور عورتیں کھانے کے وقت فن موسیقی کے کمالات دکھا کر غذائے روحانی بہم پہونچاتی ہیں۔ ان لڑکوں کو اس فن میں خاص طور پر تربیت دیجاتی ہے۔ جلسہ کے بعد یہ لڑکے معقول رقم لیکر چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مورانشے (Moranche) ان عصمت فروش چینی لڑکوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ ان لڑکوں کے والدین ان کو چار پانچ برس کی عمر میں فروخت کر دیتے ہیں۔ اور پھر ان کو خوب تعلیم و تربیت دیجاتی ہے اور گانا بجانا، نقالی، بذلہ سنجی، شعر گوئی و شعر خوانی سکھائی جاتی ہے۔ چینی قہوہ خانوں کے خدمتگار ان لڑکوں کے اڈوں سے خوب واقف ہیں۔ اور جو شخص انھیں طلب کرتا ہے تو یہ خدمتگار لا دیتے ہیں۔ جس طرح کسبیوں کیساتھ ہوتا ہے ایک نائکہ ہوتی ہے اسی طرح ان کے ساتھ بھی انکا "سرپرست" آتا ہے۔ ان کی صورت شکل اور اوضاع و اطوار سب زنانہ ہوتے ہیں۔ شوخ رنگ اور مکلف لباس پہنتے ہیں اور عطریات میں بسے رہتے ہیں۔ جب کسی جلسہ

---

[1] Russian Anthropological Journal (quoted in "Sexual Problem") for January 1913 – p. 41.

میں جاتے ہیں تو پیدل کبھی نہیں جاتے[1]

شمالی چین اور خصوصاً ترکستان میں ایک جماعت عصمت فروش لڑکوں کی ہوتی ہے جو تعلیم یافتہ اور ماہر موسیقی ہوتے ہیں۔ اس ملعون ادارہ کے قیام کا باعث یہ بتایا جاتا ہے کہ ان ممالک میں صنف نازک کی قلت ہے۔ علاوہ ازیں کثرت ازدواج کے باعث عام مردوں کو عورتیں نہیں ملتیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں عموماً جاہل بدسلیقہ اور بدمزاج ہوتی ہیں۔ مگر یہ لڑکے نہایت شائستہ اور "نستعلیق" ہوتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان ممالک میں یہ ادارۂ مکروہ ایران سے آیا تھا[2]۔

افغانستان، بلوچستان، سندھ اور دیگر ہمسایہ ممالک میں یہ بلا ضرور ایران سے پہونچی تھی۔ کیونکہ ہندوؤں میں تو اس شوق کا مطلق پتہ نہ تھا۔ لیکن برٹن (Burton) نے اپنے ترجمۂ "الف لیلہ" کے اختتامی مضمون میں لکھا ہے کہ جب ۱۸۴۵ء میں سر چارلس نیپیر (Napier) نے ملک سندھ فتح کیا تو معلوم ہوا کہ چھوٹے سے شہر کراچی میں زنانہ قحبہ خانوں کے علاوہ تین اڈے ایسے تھے جن میں ہیجڑے لڑکے عصمت فروشی کیا کرتے تھے۔ افغانستان میں بھی اسکا شوق عام ہے۔ چنانچہ برٹن صاحب نے لکھا ہے کہ "ہر قافلہ جو افغانستان سے آتا ہے

---

1) Morache, article "Chine", Dictionnaire Encyclopedique des sciences medicales. (2) Herman, "Die päderastie bei den Sarten" Sexual probleme, June 1911;

اس میں چند لڑکے ایسے ضرور ہوتے ہیں۔ جن کی آنکھوں میں سرمہ، رخساروں پر غازہ، ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی اور سر میں خوشبودار تیل اور زلفیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں ان کا لباس زنانہ ہوتا ہے اور وہ آرام کیساتھ اونٹوں کے شغدفوں میں بیٹھکر آتے ہیں۔"

لینگسڈارف (Langsdorff) نے شمالی امریکہ کے ملک الاسکا (Alaska) کا حال لکھا ہے اور اپنے سفرنامہ[1] میں تحریر کیا ہے کہ "علاقہ اُنولاشکا کی ایک قوم ایلیوٹ (Aleut) میں عجیب دستور ہے۔ یعنی اگر ان میں کوئی خوبصورت لڑکا ہوتا ہے تو اکثر اسکی تربیت لڑکیوں کی طرح کرتے ہیں۔ اور یہ اپنے ہاتھ اور پاؤں میں زیور پہنتے ہیں۔ سبزہ آغاز ہوتے ہی تمام بال موچنے سے نوچکر صاف کر دیتے ہیں اور انکی ٹھوڑی پر گودنا گودا جاتا ہے۔ انکے بال عورتوں کی طرح سنوار کر جوڑے اور چوٹیاں باندھی جاتی ہیں۔ یہاں کی اصطلاح میں انکا نام سخوپان (Schoopans) ہے ان کی وضع قطع، لباس سنگار اور طور و طریق اسقدر نسوانی ہوتے ہیں کہ کوئی اجنبی شخص یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ یہ عورتیں ہیں یا لڑکے۔ ڈاکٹر لیسیانسکی[2] (Lisiansky) تحریر کرتے ہیں کہ جن مکانوں میں کوئی سخوپان رہتا ہے اسکو بہت مبارک مقام خیال کیا جاتا ہے

(2) A. Lisiansky, Voyage, &c. London 1814, p. 189.

(1) Langsdorff's Voyages and Travels, 1814, part II p. 47.

سیاح موصوف نے اس ملک میں ایک سخوپان کے دو خاوند دیکھے تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر ہولمبرگ[1] (Holmberg) نے لکھا ہے کہ ان سے ویویڈاف (Davydoff) سیاح نے بیان کیا کہ سخوپان بنائے نہیں جاتے بلکہ ہمیشہ ایسے لڑکوں کو اس کام کے لئے چنا جاتا ہے جو ماں کے پیٹ سے نسائیت لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انگلمان، کا بیان ہے کہ انھوں نے ملک الاسکا کی اس ایسکیمو (Eskimo) قوم میں جو اس بیرو (Point-Barrow) کے آس پاس آباد ہے۔ چھوٹی چھوٹی بستیوں کے اندر بھی پانچ پانچ سخوپان دیکھے ہیں ممالک لوئسیانہ۔ فلوریڈا، یوکاتان (Yucatan) وغیرہ میں بھی اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ملک برازیل میں جن لڑکوں کو اس کے لئے تیار کیا جاتا ہے انھیں قودینا (Cudinas) یعنی "خصی" کہتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تمام شمالی مغربی علاقوں میں اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ مونتانا (Mountana) قوم میں انھیں بوٹے (Bote) کہتے ہیں۔ یعنی "نامرد نہ عورت" علاقہ واشنگٹن کی امریکانی اقوام میں ان کا نام برداش (Berdash) ہے۔ یعنی "نیم مرد نیم عورت"[2]

جزیرہ تاہیٹی (Tahiti) کے دیسی باشندوں میں بھی ایسا ہی ایک طبقہ پایا جاتا ہے۔ جو کھلم کھلا اپنے مکروہ پیشہ میں مصروف رہتے ہیں۔ زنانہ لباس پہنتے ہیں۔ یہاں کی اصطلاح میں ان لوگوں کو ماہو (Mahoo) کہتے ہیں۔

(1) Ethnographische Notizen, 1855, p. 121.

(2) New York Medical Journal, Dec. 7, 1877.

یہ لوگ عموماً عورتوں ہی کیساتھ رہتے اور سینے پرونے، کپڑا اور چٹائیاں بننے کا کام کرتے ہیں مگر اس ملک میں یہ مکروہ فعل صرف قبائلی سرداروں تک محدود ہے[1]

جزیرہ مڈگاسکر کی سقلاوی قوم (Sakalaves) میں بھی ایک خاص طبقہ پایا جاتا ہے جنھیں سقاترہ (Sakatra) کہتے ہیں۔ ان کے اطوار عورتوں جیسے ہوتے ہیں اور بلحاظ صورت و شکل زنجباری "زنانوں" سے ملتے جلتے ہیں یہ لوگ پیدائشی مخنث ہوتے ہیں۔ اسلئے زیادہ ذلیل نہیں سمجھے جاتے لیکن جو لڑکے طبعی حالت میں پیدا ہو کر یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں ان کو ذلیل سمجھا جاتا ہے[2]

افریقہ کے ممالک یوگنڈا و انیامویزی میں بھی ایسے امرد پائے جاتے ہیں۔ اور بالائی کانگو میں بھی یہ فعل عام ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ لوگ اپنے گھروں سے دور ہوں[3]

جزیرۂ نیوگنی کی پاپوا قوم میں بھی یہ شوق عام طور پر پایا جاتا ہے اور خلاف قانون نہیں سمجھا جاتا۔ اسکا سبب غالباً یہ ہے کہ ان لوگوں میں نکاح دیر سے ہوتا ہے اور تمام

(1) J. Turnbull, "A voyage round the world in the year 1800" ETC. (2) Annales d'Hygiène et de médicine Coloniale, 1899, p. 494.

(3) Oskar Baumann, "Contrare Sexual Erscheinungen hie die Neger Bevölkerung Zanzibars.

Digitized by commisionedwriting.com for the IdeaMines collective.

لڑکے اور نا محرم مرد ایک ساتھ پنچایت خانوں میں رہتے ہیں[1]۔ اسی طرح مغربی آسٹریلیا کے علاقہ کمبرلے میں جو قدیم اقوام بستی ہیں ان میں یہ دستور ہے کہ اگر کسی شخص کو بیوی میسر نہیں آتی تو وہ استلذاذ بالمثل کے لئے آزاد ہوتا ہے۔

اسپنسر اور گلن کا بیان ہے کہ آسٹریلیا کے شمال مغربی سواحل پر جو قومیں آباد ہیں ان میں بھی اسکا رواج ہے۔ یہ لوگ تو اسقدر وحشی ہیں کہ میرزوانثین کے درمیانی حصۂ جسم میں شگاف دیدیتے ہیں۔ ڈاکٹر کلاش ( Klaatsch ) کو بمقام نیول نیول ( Niol Niol ) وہاں کے پادریوں نے یہ حال بتایا تھا۔ علاوہ ازیں ۱۹۰۶ء میں روتھ ( Roth ) نے بھی بمقام بولیا ( Boolia ) بتایا تھا کہ یہاں لڑکوں پر اسی قسم کا عمل جراحی کیا جاتا ہے۔

انگلستان اور اسکاٹلینڈ کے مزدوری پیشہ اور کاریگر طبقوں میں اسکا رواج بہت پایا جاتا ہے۔ بہت سے آوارہ دن کو محنت مزدوری سے اور رات کو اس مشغلہ سے روپیہ کماتے ہیں۔ انگلستان کی طرح فرانس اور جرمنی کی فوجوں میں بھی اسکا رواج عام ہے۔ فرانسیسی سپاہیوں میں یہ علت الجزائر ( Algeria ) جاکر پیدا ہوئی۔ اور اب کوئی رجمنٹ فرانسیسی فوج کی ایسی باقی نہیں رہی جس میں یہ علت کردہ نہ پھیل گئی ہو۔ فرانسیسی لجنۃ الاجنبیہ ( Foreign Legion ) کی نسبت جب تحقیقات کی گئی تو ایک سپاہی نے جو جرمن تھا بیان کیا کہ فوج میں فرانسیسی،

[1] Maskowski, ( Zeitschrift für Ethnologie, 1911, 2 Heft 2. p 339.

ہسپانوی اور اطالوی نسلوں کے سپاہی تو عموماً "عاشق" ہوتے ہیں اور سوئس و جرمن سپاہی عموماً "معشوق" کا کام دیتے ہیں[1]۔

روس کا طبقۂ عوام اس حرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بقول ٹارنوسکی (Tarnowsky) عوام کا قول یہ ہے کہ یہ شوق امیروں کا ہے۔ سوئزرلینڈ کے کسانوں میں بھی شادی سے قبل جوانوں میں یہ شوق دیکھا گیا ہے۔

رومتہ الکبریٰ کے عہد ملوکیت میں بھی اسکا ذوق عام تھا۔ اور روم کے اکثر شہنشاہ اس مرض میں مبتلا تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جولیس قیصر۔ آغسطس تائبیریس۔ کالیگلا۔ کلاڈیوس۔ نیرو۔ گالبا۔ طیطس۔ ڈومیشین۔ نروا۔ تراجن ہیڈرین۔ قومودوس اور ہیلیوگابالوس۔ شہنشاہان روم اور بہت سے دیگر امراء کا نام لیا جاتا ہے[2]۔ جولیس قیصر کو تو لوگ طنزاً یہ کہا کرتے تھے کہ "یہ سب عورتوں کا شوہر اور سب مردوں کی جورو ہے"۔ اس شہنشاہ کو اپنے حسن و جمال پر بیحد ناز تھا۔

ہیڈرین کو اپنے غلام انطینوس (Atinous) سے اسقدر عشق تھا کہ یہ دونوں یوروپ میں محمود و ایاز کی طرح مشہور ہیں[3]۔ اور ہیلیوگابالوس تو عورتوں کا سا

---

(1) Memnon, p, 27 See also General Bro-ossiers report quoted by Burton in his Arabian Nights vol x p 251. (2) Shevalier L' inversion sexualle, pp, 85—106.

(3) J. A. Symonds wrote an interesting essay on this subject; see also Kiefer, Jahr-buch f. Sex. Zwischenstufen, Vol. viii, 1906.

ہی لباس پہنتا تھا اور جن مردوں سے اسے محبت ہوتی تھی ان کی خدمت بیویوں کی طرح کیا کرتا تھا۔[1]

قید خانوں اور جیلوں میں بھی عام طور پر یہ مرض پایا جاتا ہے۔ تادیب خانہ المیرا (Elmira Reformatory) واقع نیویارک میں ڈاکٹر وے (Way) عرصۂ دراز تک معالج رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا ہے کہ "قید خانوں میں سب سے زیادہ تکلیف دہ مسئلہ اس شوق کے انسداد کا ہے۔ جانتک میں خیال کرسکتا ہوں اسّی فیصدی آدمی اس علت مکروہ میں مبتلا ہیں۔ بہت سے قیدی ایسے ہیں جو خوبصورت اور نازکبدن ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس وضع کا قید خانہ میں آجاتا ہے تو گویا قیامت آجاتی ہے۔ نیویارک کے قید خانۂ سنگ سنگ میں بیس فیصدی قیدی "عامل" اور اسّی فیصدی "معمول" ہیں۔

قید خانوں کے علاوہ امریکہ اور یوروپ کے آوارہ گرد فقیروں میں بھی یہ علّت مکروہ بدرجۂ غائت رائج ہے۔ ایک شخص سمی "جوشیا فلنٹ" (Josiah Flynt) آوارہ گرد فقیروں کے طبقہ میں بیس پچیس برس تک شامل رہا تھا اس نے اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر ان لوگوں کے حالات میں لکھا ہے:-

"امریکہ میں دو قسم کے آوارہ گرد ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بوجہ بیکاری دریوزہ گری پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو پیشہ ور فقیر ہیں۔ موخرالذکر لوگوں کو وہاں کی اصطلاح میں "ہوبو" (Hoboes) کہتے ہیں اور ان میں ہر طبقہ کے

[1] L. Von Sheffler, "Elagabal," Jahrbuch, f. sex Zwischenstufen, Vol III, 1901,

بتذل آدمی شریک ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس مکروہ حرکت سے واقف نہ ہو۔ یہ لوگ اپنے شوق کے لئے امارد کو مختلف طریقوں سے قبضہ میں لاتے ہیں۔ عام طریقہ یہ ہے کہ وہ اثنا سفر میں جب کسی شہر یا قصبہ میں پہونچتے ہیں تو وہاں غریب طبقہ کے لڑکوں سے میل جول پیدا کر لیتے ہیں اور بالآخر جب کوئی لڑکا خوب ہل جاتا ہے تو اسے ساتھ لیکر غائب ہو جاتے ہیں۔ چند روز بعد اس غریب لڑکے کو اپنے مصرف کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ان آوارہ گردوں کی اصطلاح میں لڑکے کو "پروشن" (Prushun.) اور اسکے محافظ کو "جاکر" (Jacker. چابک سوار) کہتے ہیں۔ لڑکے کی عمر عموماً دس اور پندرہ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ اسکو بھی ہر بستی میں بھیک مانگنا پڑتی ہے اور اگر وہ کسی قسم کی سستی دکھاتا ہے تو سخت سزا دیجاتی ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں آٹھ دس آوارہ گردوں کی جماعت میں ریل کا سفر کر رہا تھا۔ کہ گاڑی ایک اسٹیشن پر ٹھہری۔ وہاں ایک حبشی لڑکا ٹرین کے اسی ڈبہ میں داخل ہوا جس میں ہماری جماعت تھی۔ جب اسٹیشن سے گاڑی چھوٹ گئی تو فوراً ان لوگوں نے اس حبشی بچہ کو دبوچ لیا۔ امریکہ میں اس قسم کے آوارہ گرد ساٹھ ہزار کے قریب ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ ساحل اسکاٹلینڈ کے ایک چھوٹے سے بندر میں ایک میلہ کے موقعہ پر ہم دس بارہ آدمی بیٹھے ہوئے مصروف جرعہ کشی تھے۔ رات کا وقت تھا اسی اثناء میں ایک بوڑھا اندھا سارنگی نواز بوزہ خانہ میں پہونچا۔ اسکے ساتھ سولہ سترہ برس کا ایک نہایت خوبصورت لڑکا تھا۔ جو اسکاٹلینڈ کی وضع کا تہمد باندھے ہوئے تھا۔

اسکے سنہرے بال لمبے لمبے اور شانوں پر پڑے ہوئے نہایت خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ سر پر عورتوں کی وضع کی پرانی ٹوپی تھی۔ اور جسم پر سیاہ مخمل کا زنانہ کوٹ تھا۔ یہ لڑکا صورت شکل میں اسقدر جاذب نظر تھا کہ ہر شخص اسکی طرف متوجہ ہوگیا۔ اور ہر شخص نے جام پیش کیا۔ اسی اثنار میں ایک شرابی نے فقرہ کسا کہ یہ لڑکی معلوم ہوتا ہے۔ لڑکے نے یہ سنتے ہی کہا کہ مین لڑکی نہیں لڑکا ہوں اور یہ کہتے ہی وہ بالکل عریاں ہوگیا۔ اسپر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ لوگوں نے اسے خوب شراب پلائی۔ اسکے بعد وہ اندھا اپنا بیلا بجانے لگا اور لڑکے نے ناز و ادا کیساتھ ناچنا شروع کیا۔ اسوقت مجمع کے ہیجان کی حد نہ رہی، اور آخر کار بے غیرتی اور بیحیائی کا یہ منظر ختم نہ ہوا تھا کہ مالک دوکان اُٹھکر آیا اور اس نے لیمپ گل کر دیا۔"

## استلذاذ بالمثل کے مختلف نظریے

کیمپف ( Kempf ) کا خیال ہے کہ بعض مردوں میں عورت کی طرف سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہوجاتی ہے اور اس نفرت کا سبب درحقیقت عورت کا رعب یا خوف ہوتا ہے اور مرد باور کرلیتا ہے کہ وہ اسپر قادر نہ ہوسکے گا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ استلذاذ بالمثل کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ علاوہ اسکے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ مردوں یا عورتوں کی کوئی جماعت عرصۂ دراز تک اس طرح رہنے پر مجبور ہوتی ہے کہ جنس مخالف سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تو ان میں یہ مذموم عادت پیدا ہوجاتی ہے چنانچہ فوجوں کے سپاہی اور جہازوں کے ملاح جنھیں عرصۂ دراز تک عورتوں سے جدا رہنا پڑتا ہے استلذاذ بالمثل کے عادی ہوجاتے ہیں۔

زمانۂ حال کے بہت سے ماہرین جنسیات اس امر پر غور کرتے ہیں کہ اس

۱۹۳

عادت کے اسباب و علل کیا ہیں۔ چنانچہ چند سال کے اندر اسکے متعلق کثیر مواد جمع ہوگیا۔
ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ (Krafft-Ebing) ایسا شخص ہے
جس کے اقوال کی بکثرت سند دیجاتی تھی اور اسکی تصنیفات کا اب بھی عوام پر بہت
اثر ہے۔ اس شخص کا قول یہ ہے۔ کہ اس فعل کی عادت آبائی ہے۔ یعنی بچہ کو
والدین سے وراثتاً ملتی ہے۔ لیکن مابعد کے مفتشین و محققین جن نتیجہ پر پہونچے ہیں
اس سے ڈاکٹر صاحب کے قول کی تائید نہیں ہوتی۔

کرافٹ ایبنگ کا قول یہ بھی ہے کہ بچپن میں جن بچوں کو استلذاذ بالنفس
یعنی استمناء وغیرہ کی عادت ہو جاتی ہے وہی بڑے ہوکر استلذاذ بالمثل میں مبتلا
ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ درست نہیں کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ملجائیں گے
جنھوں نے طفولیت کی غلط کاری کو جوان ہوکر بالکل چھوڑ دیا اور پھر کوئی غیر فطری
طریقہ حظ النفس کا اختیار نہیں کیا۔

کرافٹ ایبنگ کا بیان ہے کہ :۔ استلذاذ بالنفس سے زیادہ مذموم کوئی
عادت نہیں جو حسن و جمال کی تمام دلکشی و دلفریبی کو زائل کردیتی ہے۔ اور
جنس نازک کی طرف سے انسان کو متنفر کردیتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ کمزوری انسان
کے اخلاق، و مزاج پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

لیکن ڈاکٹر اسٹیکل (Stekel) نے اس خیال کی تردید
کی ہے۔ وہ اپنی کتاب "اختلاط ذوالجنسین" میں تحریر کرتے ہیں :۔
"(کرافٹ ایبنگ کی) یہ دلیل قطعی غلط ہے۔ جسقدر زبردست اصحاب فکر و ذہن
میں نے استلذاذ بالنفس کے شائقین میں دیکھے ہیں اتنے کسی دوسرے طبقہ میں

۱۹۴

نہیں دیکھے۔ میں نے نوجوان مصوروں، شعراء اور خصوصاً ماہرین موسیقی میں شدید رجحانات اسکو دیکھے ہیں اور یہ واقعہ اس مسئلہ نظریہ کے عین مطابق ہے کہ تمام مصور ذوجنسین ہوتے ہیں اس وضع کے نوجوان اکثر ایسے نازک طبع اور حساس ہوتے ہیں کہ وہ استلذاذ بالضد میں ایک قسم کی "بہیمانہ بیرحمی" محسوس کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی خواہشات نفسانی کو دنیا بھر سے چھپاتے ہیں۔ ان شائقین استلذاذ بالنفس میں بڑے بڑے علمبرداران حق وصداقت بڑے بڑے معلمین اخلاق اور بڑے بڑے ارباب فکر اور مصلحین شامل ہیں۔"

کرافٹ ایبنگ۔ ہرشفیلڈ اور بلاخ وغیرہ مشہور محققین اور مصنفین نے استلذاذ بالنفس کے متعلق نظریے تو بہت قائم کئے لیکن افسوس ہے انھوں نے ان نفسیاتی عناصر کو نظرانداز کر دیا جو اس فعل سے متعلق ہیں۔ ہر نوخیز بچہ غیر شعوری طور پر اپنے اوضاع واطوار کسی دوسرے شخص کے نمونہ پر تعمیر کرتا ہے۔ خصوصاً ان باتوں اور طریقوں کو جو صنف ثانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ شخص جسکی تقلید بچہ کرتا ہے اسی ماحول میں موجود ہوتا ہے۔ مثلاً جب کسی لڑکے کی پرورش اور تربیت اسطرح واقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوضاع واطوار کا نمونہ اور اپنی سیرت کا سانچہ اپنی ماں کو بنائے تو اس میں خود بخود نسائیت پیدا ہونے لگتی ہے وہ خود بخود بلا ارادہ نسوانی طور طریق کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ اور سرگرمی عمل کے تقریباً ہر میدان میں خواہ وہ شہوانی ہو یا کاروباری اسکا تمام رنگ ڈھنگ نسوانی ہو جاتا ہے اور چونکہ وہ اس طرح نفسیاتی لحاظ سے رفتہ رفتہ "عورت" بنجاتا ہے اور فطری یا طبعی طور پر عورتوں کو اپنی جنس کی طرف شہوانی رغبت نہیں ہوتی بلکہ مردوں سے ہوتی ہے اسلئے وہ لڑکا بھی مردوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور اگر ماں یا کسی دیگر سرپرست کے رجحانات طبع استلذاذ بالنفس کی طرف ہوتے ہیں تو وہ لڑکا بھی ویسا ہی کرنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر اسٹیکل کا بھی یہی نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی لڑکا نسوانی رنگ ڈھنگ اختیار کرلے تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ بات اسکے اندر فطری طور پر ہے بلکہ یہ خیال کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی سیرت اپنی ماں یا بہن یا کسی دوسری عزیز قریب عورت کے نمونہ پر تعمیر کر رہا ہے۔

ڈاکٹر سیڈگر (Seidger) نے مندرجہ ذیل اسباب علل بتائے ہیں:۔

(۱) استلذاذ بالمثل کا شوق "حب نفسی" (Self-love) سے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) ایسے شخص کے نصب العین میں نہ صرف سابق عورتوں اور مردوں کے اعمال و افعال شہوانی موجود ہوتے ہیں بلکہ وہ اس میں اپنی ذات کی طرف سے بھی کوئی پہلو شامل کرلیتا ہے۔

(۳) جب لڑکے کی پرورش اور تربیت ناقص نسوانی ماحول میں ہوتی ہے تو اس میں نسائیت پیدا ہو کر انفعالی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور عموماً دیکھا گیا ہے کہ اکلوتا بیٹا اکثر استلذاذ بالمثل کا شایق ہو کر بعد کو معمول بننا پسند کرتا ہے۔

(۴) ناقص تربیت سے بھی اس طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اکثر دیکھا گیا ہے کہ مائیں اپنے لڑکوں کو لڑکیوں میں کھیلنے نہیں دیتیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لڑکوں میں کھیلتا ہے۔ اور لڑکیوں کے بجائے اسے لڑکوں سے رغبت ہو جاتی ہے اور یہی استلذاذ بالمثل کی ابتدا ہے۔

الفریڈ ایڈلر (Alfred Adler) کا نظریہ بھی اسی اصول کے مطابق ہے۔ اس نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ تیسرے اٹھان کے وقت لڑکوں کے

پیش نہاد نسوانی نمونہ ہوتا ہے تو ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ "کامل عورت" بنجائیں۔ اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اپنی شخصیت کی طاقت کو بڑھائیں اور چونکہ وہ "پوری عورت" نہیں ہوتے اسلئے وہ اپنی ذلت کے خوف سے عورتوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ انھیں عورت سے ڈر لگتا ہے۔ اور خوف، نفرت، شرم اور حقارت وہ جذبات ہیں جن کے باعث ایسا شخص دوسری جنس سے الگ رہتا ہے۔

ہنوور (جرمنی) میں ایک پورا فاضل اور زبردست قانون داں گذرا ہے جسکا نام کارل ہنریچ یولریخ تھا۔ ان حضرت نے کئی برس تک استلذاذ بالمثل کی حمایت و تلقین کی۔ وہ خود بھی اس علت میں مبتلا تھے اور انھوں نے اس امر کی بیحد کوشش کی کہ جرمنی کے اندر ایسے لوگوں کی قانونی حیثیت میں تبدیلی واقع ہو جائے۔

جملہ محققین کے نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر اسٹیکل کا یہ نظریہ زیادہ صحیح اور معقول معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں تمام آدمیوں کے اندر ذو جنسیت (Bisexuality) موجود ہوتی ہے۔ اور یہ کیفیت سن بلوغ تک رہتی ہے۔ بعد ازاں بعض آدمی اپنے شوق استلذاذ بالمثل کو دبا لیتے ہیں اور طبعی طور پر جنس مخالف کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی طبیعت پر دوسرا شوق غالب رہتا ہے اور وہ صرف استلذاذ بالمثل سے رغبت رکھتے ہیں اور بعض میں دونوں شوق موجود رہتے ہیں۔

انسان درحقیقت حیوان مطلق کی ہی ترقی یافتہ صورت ہے۔ پہلے حشرات پیدا ہوئے، ان سے ترقی پاکر حیوانات ذوالعنصرین بنے جیسے مینڈک۔ مگر مچھ

کچھوا وغیرہ، اور انھیں آبی جانوروں میں سے قانون ارتقار نے پرندے بنا دیئے۔ چنانچہ اب تک اڑنیوالی اور درختوں پر چڑھنے والی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ پرندوں میں سے ترقی پاکر چوپائے پیدا ہوئے۔ چنانچہ آسٹریلیا میں ابھی تک ایک چوپایہ جانور ایسا پایا جاتا ہے جو دریا میں رہتا ہے۔ اسکا نام انگریزی زبان میں "ڈک بل" (Duck bills) ہے۔ یہ انڈے دیکر بچے نکالتا ہے لیکن انھیں دودھ پلاکر پالتا ہے۔ الغرض انسان جانوروں کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ یہی باعث ہے کہ بہت سی باتیں جو جانوروں میں پائی جاتی ہیں وہ حضرت انسان میں بھی موجود ہیں۔ یا یہ سمجھ لیجئے کہ انسان نے بہت سی باتیں حیوانات سے سیکھی ہیں۔ پھر کیونکہ بعض حیوانات اور چوپایوں میں استلذاذ بالمثل کا شوق دیکھا جاتا ہے۔ اسلئے بہت ممکن ہے کہ انسان نے بھی یہ فعل مکروہ جانوروں ہی سے سیکھا ہو یا ورثہ میں اسے ملا ہو۔

مشہور و معروف جرمن ماہر علم الحیوانات پروفیسر کارش (Carrish) کا قول ہے کہ پلے ہوئے یا مقید جانوروں میں استلذاذ بالمثل کا شوق پیدا ہو جاتا ہے جسکا باعث یہ ہے کہ جنس ثانی موجود نہیں ہوتی۔ قدیم زمانہ کے لوگوں کو اس بات کا علم تھا۔ چنانچہ قدیم مصریوں میں دو نر تیتروں کو استلذاذ بالمثل کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ارسطو نے بھی لکھا ہے کہ اگر نر موجود نہیں ہوتا تو مستی میں آکر دو کبوتریاں ایک دوسرے پر بیٹھنے لگتی ہیں۔ فرانس کے مشہور ماہر علم حیوانات کا وٹ ڈی بفون (Buffoon) نے اپنی کتاب میں جانوروں خصوصاً پرندوں کی بہت سی مثالیں استلذاذ بالمثل کی لکھی ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ اگر بہت سی قسم

کے صرف نر یا صرف مادہ پرند مثلاً تیتر۔ بٹیر۔ مرغے۔ مرغیاں۔ فاختہ وغیرہ ایک جگہ بند کر دیئے جائیں تو ان میں بہت جلد استلذاذ بالمثل کا شوق شروع ہو جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ بمقابلۂ مادہ کے نر میں یہ کیفیت جلد پیدا ہوتی ہے۔ اور فرانسیسی محقق سینٹ کلیر ڈی ویلی (Saint-Clair De Velli) نے لکھا ہے کہ اگر نیڈھوں بکروں، کتوں، سانڈ بیلوں وغیرہ کو الگ بند کر دیا جائے تو ان میں بھی یہی شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی مادہ ان کو ملجاتی ہے تو وہ پھر بحالت طبعی آجاتے ہیں۔ بومبارڈا (Bombarda) ساکن شہر لزبن کا قول ہے کہ ملک پرتگال میں ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ سانڈ بیلوں کے غول میں ہمیشہ ایک بیل ایسا رہتا ہے جو اپنے ساتھی بیلوں کے اس شوق کی تسکین کرتا رہتا ہے اور گائے بکری میں تو یہ حرکت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ استیناخ (Solinakh) کا مشاہدہ یہ ہے کہ سفید چوہوں میں یہ عادت ہے کہ جب ان کے پنجرے سے مادہ دور کر دی جاتی ہے تو وہ آپس میں یہ حرکت کرنے لگتے ہیں۔ مول (Moll) نے بندروں اور گدھوں کو بھی یہ حرکت کرتے دیکھا ہے۔

## استلذاذ بالمثل اور بعض مشہور افراد تاریخی

ایسے مشہور و معروف تاریخی آدمیوں کے سلسلہ میں ڈاکٹر رافالووچ (Raffalovich) نے اپنی کتاب یورانسم (Uranism) میں اسکندر اعظم۔ ایپامنن داس (Epaminondas) ورجل۔ کانڈے اعظم اور شہزادہ یوجین کو بھی شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر ہرشفیلڈ (Hirschfeld) نے اپنی مبسوط کتاب الموسوم بہ

مطبوعہ ۱۹۱۳ء میں صفحہ ۶۵۰ لغایتہ ۶۷۴ قدیم و جدید مشہور آدمیوں کی دو فہرستیں

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۸) ۱ اسکندر اعظم (۳۵۶ لغایتہ ۳۲۳ ق م) فیلقوس ( [illegible] ) شاہ مقدونیہ کا بیٹا تھا۔ ۳۳۶ ق م میں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اس بادشاہ میں اوائل ہی سے روح عسکریت نمایاں تھی۔ اسنے تمام یونان، ایشیائے کوچک۔ شام فینیقیہ فلسطین و مصر کو فتح کیا بعد ازاں ایران پر حملہ کرکے دارا شہنشاہ ایران کو قتل کیا اور تمام ملک فتح کرلیا۔ اسکی فتوحات ممالک باختر و ہندوستان تک پہونچی تھیں۔ ہندوستان سے وہ براہ سمندر واپس ہوا اور شہر بابل میں گیارہ روز بیمار رہکر فوت ہوا۔

۲ ایپامنندا س یونان کا ایک زبردست شاعر تھا۔ طبقہ مقتدایان دین سے تعلق رکھتا تھا۔ بلکہ اپنی عقل و دانش کے باعث بعض اوقات وہ یونان کے "سات رشیوں" میں بھی شمار ہوتا تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں جزیرۂ کریٹا میں پیدا ہوا۔ ایک روایت کے مطابق وہ ستاون ۵۷ برس تک سوتا رہا اور اسی خواب شیریں میں اسے دیوتاؤں کی طرف سے الہام ہوا۔ جسکے مطابق اس نے اپنی آیندہ زندگی بسر کی۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص ۲۹۹ برس کی عمر تک جیا

۳ ورجل (Virgil) ۷۰ لغایتہ ۱۹ ق م۔ روم کا مشہور آفاق شاعر تھا۔ شہر مانتوا میں پیدا ہوا۔ اول اول زراعت پیشگی کرتا تھا بعد میں دربار تک رسائی ہوگئی تو امیر کبیر ہوگیا منجملہ دیگر تصانیف کے اسکی نظم اینیڈ (Aeneid) بیحد مشہور ہے جسکے بارہ حصہ ہیں۔

۴ کاندے اعظم (Great Conde) ۱۶۲۱ء لغایتہ ۱۶۸۶ء۔ این ملکہ آسٹریا کا بہت بڑا جنرل تھا۔ لیکن بعد ازاں دربار ہسپانیہ میں ملازم ہوگیا۔ ۱۶۵۹ء میں دربار فرانس سے اسکی صلح ہوگئی اور وہ صوبہ برگنڈی کا گورنر بنا دیا گیا۔

۵ پرنس یوجین ۱۶۶۳ء لغایتہ ۱۷۳۶ء ملک آسٹریا بہت بڑا مدبر اور جنرل تھا جنگ ہسپانیہ میں اس نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔

درج کی ہیں جن میں تین سو آدمیوں کے نام ہیں - خاص خاص نام ملاحظہ ہوں:-
جولیس[1] قیصر - اگسٹس[2] - تائبیریس[3] - کالیگلا[4] - کلاڈیس[5] - نیرو[6] - ٹیٹوس[7]

---

[1] (Julius Caesar) ۱۰۰ء لغایتہ ۴۴ ق م اول اول بحیثیت ایک فاتح رومی جنرل کے شہرت حاصل کی بعد ازاں اپنی سحر بیانی اور خطابت کے ذریعہ سے رومیوں پر اپنا زبردست اثر قائم کیا۔ اپنی طاقت فوجی اور اثر کی بدولت شہنشاہ روم بنگیا۔ لیکن امراء کا طبقہ اس سے برافروختہ ہوگیا۔ ایک جماعت نے سازش کرکے تاجپوشی سے ایکماہ بعد سرعام قتل کرڈالا۔

[2] (Canis Octaviamis agustus) ۶۳ء لغایتہ ۱۴ ق م روم کا پہلا شہنشاہ ہوا۔ چون برس ۵۴ تک سلطنت کی۔ اس کا عہد امن و صلح اور فارغ البالی کیلئے مشہور ہے۔

[3] (Tiberius) روم کا دوسرا شہنشاہ تھا۔ ۴۳ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۷ء میں فوت ہوا۔ غیر معدود قابلیتوں کا آدمی تھا۔ لیکن خانگی امور میں سخت بدنام تھا۔

[4] (Caligula) روم کا تیسرا شہنشاہ تھا۔ ابتدا میں اچھی سلطنت کی لیکن بعد میں اسکی شہوت رانیوں اور بدمستیوں سے لوگوں نے عاجز آکر ۴۱ء میں قتل کردیا۔

[5] (Claudius) کالیگلا کے بعد شہنشاہ روم ہوا۔ لیکن اپنی عیش پرستیوں کے باعث وہ اپنے مصاحبوں کے پھندے میں ایسا پھنسا کہ اسکی بیوی اگریپینا (Agrippina) نے زہر دیکر قتل کردیا۔

[6] (Nero) ۳۷ء لغایتہ ۶۸ء روم کا سخت بدنام شہنشاہ تھا۔ بیحد عیش پرست اور بیحد سفاک شخص تھا بالآخر قتل کیا گیا۔

[7] (Titus) ۴۰ء لغایتہ ۸۱ء روم کا شہنشاہ تھا۔ اسی شخص نے سب سے پہلے یروشلم فتح کیا۔ جسکی یادگار میں ابتک "محراب ٹیٹوس" مشہور ہے۔ بیحد فحاش اور ظالم شخص تھا

ڈومیشین[۱] - نروا[۲] - ٹراجن[۳] - ہیڈرین[۴] - فریڈریک اعظم[۵] -

شعراء انگلستان میں مارلو - شیکسپیر - سونٹ - جان فلیچر - شیلے - بائرن اور ٹینی سن کی نسبت بھی لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انھیں اسکا شوق تھا - موخرالذکر کے محبوب کا نام آرتھر ہیلم (Arthur Hallam) تھا - ایڈورڈ کارپنٹر (Edward Carpenter) کا قول ہے کہ اس شوق کے مردوں کو جنگ وجدال سے نفرت ہوتی ہے - اور اسکی شایق عورتیں خانہ داری سے گھبراتی ہیں اسلئے ان کے قوائے ذہنی کا رجحان دیگر پر اس مشاغل خصوصاً علم وفضل کی طرف

---

۱ ، Domitian ، شہنشاہ روم - سفاکی اور بدکاری میں رسوائے عام تھا - ۹۶ء میں قتل کر دیا گیا -

۲ ، Nerva ، ۹۶ء سے ۹۸ء تک شہنشاہ روم رہا -

۳ ، Trajan ، اپنے باپ کی جگہ ۹۸ء میں روم کا شہنشاہ ہوا اور ۱۱۷ء تک سلطنت کی -

۴ ، Hadrian ، اپنے چچا ٹراجن کے بعد شہنشاہ روم ہوا اور ۱۳۸ء تک سلطنت کی - شہنشاہان روم میں سب سے بڑا شمار کیا جاتا ہے -

۵ ، Frederick II ، ۱۷۱۲ء لغایۃ ۱۷۸۶ء - جرمنی کی ریاست پروشیا کا بادشاہ تھا - ۱۷۴۰ء میں تخت نشین ہوا - اپنی قابلیت اور فوجی فتوحات سے اپنی ریاست کی شان کو چار چاند لگا دئے حتی کہ وہ یوروپ کی بہت بڑی طاقت بنگئی - یہ بادشاہ عالم فاضل وعلم دوست تھا - اسکی تصنیف کردہ کتب کی تعداد تیس سے زیادہ ہے

ہوجاتا ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ ان لوگوں میں اکثر صاحب کمال، موجد و مخترع، شاعر، کاریگر، جوتشی، رمال، کاہن، ساحر، ڈاکٹر اور مقتدایان دین پیدا ہوئے ہیں۔ یوروپ کے عہد نہضت پر غور کرکے دیکھا جاتا ہے تو اس زمانہ میں اس قسم کے بہت سے لوگ ملتے ہیں جو صاحب کمال تھے۔ مثلاً:—

میورے (Muret) عہد نہضت میں علم مجلسی۔ اخلاق و ادب کا زبردست ماہر تھا۔ اپنے زمانہ میں بوجہ علم و فضل اور فصاحت و بلاغت بہت شہرت حاصل کی تھی۔ علم اخلاق اور آداب مجلسی میں اسکا مدمقابل نہ تھا لیکن یہی شخص ۱۵۵۳ء میں استلذاذ بالمثل کے الزام میں قید ہوا بلکہ جان کے لالے پڑ گئے۔ کسی نہ کسی طرح اسکی رہائی ہوئی اور وہ شہر طولوز (Toulouse) میں رہنے لگا۔ لیکن دو سال بعد پھر وہ اس جرم میں متہم ہوکر فرانس سے فرار ہوا۔ اور شہر پیڈو میں رہنے لگا لیکن چار برس بعد یہاں پھر وہ اسی جرم میں ماخوذ ہوا۔

ایرازمس (Erasmus) جو بلحاظ علم و فضل میورے سے بھی بلند درجہ رکھتا تھا۔ شہر اسٹین (Stein) کی خانقاہ میں رہتا تھا وہاں وہ ایک دوسرے راہب پر عاشق ہوگیا۔ اور اسے عاشقانہ خطوط لکھے جو پکڑے گئے اور بھید کھل گیا۔

عہد نہضت میں جوں جوں علم و فضل کی ترقی ہوتی گئی لوگوں میں اس مشغلہ کا شوق زیادہ پیدا ہوتا گیا۔ چنانچہ پولیزیانو (Angelo Poliziano) پر فعل خلاف وضع فطری کا الزام لگایا گیا۔ آرٹیینو (Aretino) بھی اسکا شایق تھا۔

۲۰۳

اور یہی عیب پاپائے اعظم جولیس[1] دوم میں بھی بتایا جاتا ہے۔ حتی کہ اریوسٹو شاعر و ادیب تک نے پاپائے موصوف پر حملے کئے تھے اور تاشو[2] (Tasso) کی بھی انفعالی کیفیت بہت مشہور تھی۔

فرانس کا مشہور نقاش و مصور لیونارڈو داونسانی[3] (Leonardo Da Vinci) بھی اس مشغلہ کی وجہ سے بدنام تھا۔ ۱۴۷۴ء میں جب اسکی عمر ۲۴ سال

---

(فٹ نوٹ صفحہ ۲۰۲) [1] اینجلو پولیزیانو۔ ۱۴۵۴ء لغایۃ ۱۴۹۴ء۔ لاطینی، اطالین اور یونانی زبانوں کا زبردست ماہر تھا۔ جب اس نے یونانی ملک الشعراء ہومر کی کتاب ایلیڈ (Iliad) کا ترجمہ کیا تو تمام یوروپ میں دھوم مچگئی۔ پرنس لورنزو ڈی میڈیسائی نے اسکی سرپرستی کی اور "ملک الافاضل اطالیہ" بنادیا۔ علاوہ ازیں وہ فلورنس یونیورسٹی میں السنۂ یونانی و لاطینیا کا پروفیسر مقرر ہوا۔ جب پرنس لارنزو نے اسے اپنے دو لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا تو شہزادہ کی بیوی نے اعتراض کیا۔ کیونکہ وہ کافی بدنام ہو چکا تھا۔

[2] آرٹینو (Aretino) سولھویں صدی میں اطالیہ کا مشہور شاعر اور ظریف تھا۔ ۱۴۹۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۵۷ء میں ایک تپائی پر سے گر کر ہلاک ہوا۔ اپنے غیر فطری ذوق کی وجہ سے وہ جگہ جگہ سے نکالا گیا۔

---

[1] جولیس دوم۔ بمقام الیزولا۔ ۱۴۴۳ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۵۱۳ء میں فوت ہوا۔

[2] تاشو (Torquato Tasso) اطالیہ کا مشہور عالم اور شاعر تھا بمقام سورینٹو ۱۵۴۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۹۵ء میں فوت ہوا۔

(3) S. Freud, Eine Kindheitserinnerung des Leonardo da Vinci 1910.

کی تھی اسپر شہر فلورنس کی عدالت میں بالزام بداخلاقی مقدمہ چلا۔ اسی طرح وہ کئی بار ماخوذ ہوا۔ اور قید کر دیا گیا۔ تمام عمر اسکے گرد خوبصورت لڑکے جمع رہے اور عورت کی طرف کبھی ملتفت نہ ہوا۔

اسی طرح دورِ نہضت کا مشہور و معروف آرٹسٹ مائیکل اینجلو (Michael Angelo) بھی اسطرف بہت مائل تھا۔ اس کے خطوط اور نظمیں جذبات غیر فطری سے مملو ہیں۔

مائیکل اینجلو کا ہمعصر مصور بزی (Bazzi) اس علت مذموم میں اسقدر مشہور تھا کہ لوگوں نے اسکا نام ہی سوڈوما (Sodoma) رکھ دیا۔

بلینی (Cellini) بھی اسکا شوقین تھا۔ یہ شخص اپنے زمانہ کا مشہور سنگتراش اور بت ساز تھا۔ خلاف وضع فطری کے جرم میں اس شخص کو سزا بھی ہو گئی تھی۔

ملک فلینڈرس کے مشہور و معروف سنگتراش و مجسمہ ساز جیروم دکینا (Jerome Duquesnoy) کو اسقدر شوق تھا کہ بالآخر اسی جرم میں قتل کیا گیا۔ اسکی آخری حرکت یہ تھی کہ وہ شہر گھنٹ (Ghent) کے بڑے گرجا میں سقف کے لئے کچھ کام بنا رہا تھا۔ کہ "خانۂ خدا" میں بھی وہ اس حرکت سے باز نہ آیا اور

---

(1) J. A. Symonds, life of michael angelo
(2) R. H. Hobart Cust; Giovam Antonio Bazzi (3) J. A. Symonds life of Cellini.

آخر کار گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔[1]

تیرھویں صدی میں فرانس کے اندر یہ علت اسقدر وبا کی طرح پھیلی کہ پیرس کی کونسل نے ۱۲۱۲ء میں اور روئین کی کونسل نے ۱۲۱۴ء میں اسکی سزا قتل قرار دی اور اسقدر غلو کیا گیا کہ اگر کوئی عورت کسی مرد کی طرف راغب ہوتی تھی اور وہ مرد اسکی طرف توجہ نہ کرتا تھا تو اسے اسی مشغلہ کا عادی قرار دیکر سزا دیتے تھے۔

فرانس کے اندر چودھویں صدی میں بھی یہ علت بہت پھیلی ہوئی تھی۔ اور بانکوں (Knights) کے طبقہ ٹمپلرس (Templars) میں خاص طور پر پائی جاتی تھی جنکی نسبت خیال تھا کہ وہ اس علت مذموم کو ممالک مشرق سے لائیں ہیں علاوہ ازیں اطالوی ملکہ کیتھرائن دی میڈیسائی Catherine de Medici کا دربار اس قسم کے شوقینوں سے اسقدر معمور تھا کہ وہ دنیا بھر میں رسوا ہو گئی۔ بایں ہمہ مرتکبین جرم کو وقتاً فوقتاً سخت سزائیں دیجاتی تھیں۔ مثلاً ۱۵۸۶ء میں پیرس یونیورسٹی کے ریکٹر (Rector) دادون (Dadon) نے جب یہ مذموم حرکت کی تو بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور سزا یہ ملی کہ پھانسی پر لٹکا دیئے گئے اور لاش کو پھونک دیا گیا۔[2]

اٹھارویں صدی کے فرانس میں بھی اسکا چرچا اسقدر پایا جاتا تھا کہ اس زمانہ میں مادام نے جو نوعمر بادشاہ کی طرف سے نائب السلطنت کے فرائض انجام دے رہی

(1) Eckhouds' account of Duquesnoy (Jahrbuch für sexuelle Zwischenstufen, 1899) (2) P. de l'Etoile, Memoires journaliers, Vol II, p. 326.

تھی اس شوق مذموم کی اپنے خطوط میں بار بار شکایت کی۔ اسکا شوہر بھی اسی قسم کا آدمی تھا۔ اس زمانہ میں چونکہ بدچلن لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر پیرس کے مشہور قیدخانہ بیسٹل (Bastille) میں بھر دیا گیا تھا اسلئے یہ محبس اس قسم کی مذموم عادت کا مرکز بنگیا تھا۔ ۱۷۰۲ء میں بیسٹل کے اندر ایک نہایت جمیل اور متناسب الاعضاء نوجوان لیبل (Lebel) تھا۔ پہلے یہ لڑکا ادھر ادھر خدمتگاری کیا کرتا تھا۔ لیکن خود کو بہت شریف زادہ اور اونچے طبقہ کا ظاہر کرتا تھا۔ جب اسکی عمر دس سال کی ہوئی تو دو پلیشس (Duplessis) نے اسکے اخلاق خراب کردئے۔ اس کے بعد یہ بڑے بڑے فوجی افسروں نواب زادوں اور پادری صاحبان کے پاس رہا۔ جب تحقیقات ہوئی تو بہت سے آدمی جو اس سے ملوث تھے زندہ جلا دئے گئے۔ بعض نے ذلت و رسوائی سے بچنے کے لئے اپنا گلا خود کاٹ لیا۔ کچھ چھوڑ دیے گئے اور کچھ قیدخانے میں ڈالدئے گئے۔

جرمنی میں قدیم الایام سے اسکا شوق چلا آتا ہے امانیس مارسیلینس (Ammianus Marcellinus) نے لکھا ہے کہ سلطنت روم کے آخری عہد میں بعض جرمن قبائل کے اندر یہ مذموم عادت پائی جاتی تھی۔ قرون وسطیٰ میں بھی یہ شوق موجود تھا۔ جرمن خاندان شہنشاہی کے بہت سے شہزادے اور دیگر مختلف شہزادگان ریاستہائے ماتحت آپس میں یہی تعلقات رکھتے تھے۔

جرمنی کے مشہور شاعر ہنری فان کلیسٹ (Heinrich von Kleist) کو اسکا بہت شوق تھا۔ اسکا خاص محبوب ارنسٹ فان فیول (Ernst von Fiel) تھا جو بعد میں پروشیا کا وزیر جنگ ہوگیا تھا۔ ان دونوں کے تعلقات کا اندازہ اس خط سے

۲۰۷

کیا جاسکتا ہے جو کلیسٹ نے ۱۸۰۵ء میں بعمر ۲۸ سال، سکو لکھا تھا۔ لکھتا ہے کہ: —

"تم نے میرے لئے یونانیوں کا دور قدیم پیدا کر دیا ہے۔ میری روح تمہارا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جب تم تھون (Thun) کی جھیل میں نہاتے تھے تو میں تمہارے خوبصورت جسم کو تکا کرتا تھا ..... آؤ میرے ساتھ مقام انسباخ (Ansbach) کو چلو۔ اور عشق و محبت کے لطف اٹھاؤ ..... میں کبھی شادی نہ کرونگا"

انیسویں صدی کی جرمنی کے اندر ہر طبقہ میں بعض نہایت مشہور لوگ اس ذوق کے پیدا ہوئے۔ ایک طرف تو ہم ایک اعلیٰ صاحب علم و فضل اور عالی دماغ شخص الگزینڈر فان ہمبولٹ (Alexander von Humboldt) مشہور و معروف جرمن سیاح اور محقق کو پاتے ہیں۔ اور دوسری طرف الیف۔ اے کرپ (F. A. Krupp) جیسے شخص کو دیکھتے ہیں۔ یہ وہی شخص ہے جس نے بمقام ایسن (Essen) جرمنی کا مشہور کارخانہ آہن سازی قائم کیا تھا۔ اس شخص کی نسبت لکھا ہے کہ وہ جزیرہ کیپری (Capri) متصل نیپلز کی تفریحگاہ میں خوب رنگ رلیاں منایا کرتا تھا۔ ہر وقت خوبصورت لڑکے اسے گھیرے رہتے تھے۔ اور یہ ان پر پانی کی طرح روپیہ بہاتا تھا۔ بالآخر حد درجہ بدنام ہوگیا۔ مشہور جرمن اخبار "وورواریش" (Vorwärts) نے کیپری کے متعلق کرپ کی زندگی کے حالات شایع کئے۔ جس پر خاندان کرپ نے برافروختہ ہوکر اخبار مذکور پر از الہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا۔ لیکن فوراً ہی بعد کو کرپ نے خودکشی کرلی اور وہ مقدمہ اٹھا لیا گیا۔

اہل قلم جرمنوں میں منجملہ ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے پلیٹن (Platen) — کے۔ پی۔ مارٹزو (K. P. Moritz) اور ایفلینڈ

، Affland ، کا نام بھی اسی سلسلہ میں لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مول ( Moll ) کا قول ہے کہ خاص شہر برلن میں چھ سات سو اشخاص انھوں نے ایسے دیکھے ہیں جنھیں اسکا شوق ہے۔ اور ڈاکٹر ہرشفیلڈ بیان کرتے ہیں کہ وہ برلن میں دس ہزار سے زیادہ ایسے لوگوں کو جانتے ہیں۔ برلن میں بعض بڑے بڑے ہوٹل ایسے ہیں جہاں عموماً اسکے شائق جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہاں بہت سے نیپن ( Kneipen ) یعنی کھانے پینے کی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں جہاں خوبصورت لڑکے بطور خدمتگار ملازم ہوتے ہیں۔ برلن کی پولیس اگرچہ ان رازوں سے آگاہ ہے لیکن کوئی دخل نہیں دیتی۔

جرمنی ہی دنیا بھر میں ایسا ملک ہے جہاں اسکی کھلم کھلا تحریک موجود ہے۔ اور اسکے متعلق جتنی کتابیں جرمنی سے شایع ہوئی ہیں اتنی دنیا کے کسی ملک سے شایع نہیں ہوئیں۔

قدیم طیوطانی ( Teutonic ) زمانہ میں جرمنی کے اندر اس فعل کی کوئی سزا مقرر نہ تھی۔ لیکن جب مغربی قوط قوم عیسائی ہو گئی اور کلیسا کا زور ہوا تو یہ فعل جرم قرار دیا گیا۔ شاہ الاریق دوم کا فرمان جاری ہوا کہ ایسے شخص کو زندہ جلا دیا جائے۔ بعد ازاں ساتویں صدی میں شاہ چنداس وند ( Chindasuinth ) نے فرمان جاری کیا کہ جو شخص یہ حرکت کرے اسکو خصی کر دیا جائے۔ تیرہویں اور چودھویں صدی میں زندہ جلانے کی سزا مقرر ہوئی۔

# عورتیں اور استلذاذ بالمثل

حکیم افلاطون یونانی کی "سمپوزیم" (Symposium) یعنی "بزم نشاط" میں رجحانات جنسی کے بارہ میں جو نظریہ ارسطوفانیس[1] (Aristophanes) نے قائم کیا ہے، اس میں عورت و مرد کا درجہ مساوی رکھا ہے۔

ایک کیتھولک پادری نے ہیولاک ایلس[2] (Havelock Ellis) سے بیان کیا کہ چار میں ایک مرد اور تین عورتیں اس شوق کا اقرار کرتی ہیں یعنی یہ شوق بہ نسبت لڑکوں کے لڑکیوں میں زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ اسکولوں، کالجوں اور خانقاہوں میں ان کو اسکا بہت موقع ملتا ہے۔

اس شوق کا سب سے پہلا واقعہ جو مفصل طور پر قلمبند کیا گیا، اس میں ایک عورت ہی ملوث تھی۔ یہ عورت (Catherine Margaretha Kinaker) تھی جس نے مرد بنکر ایک دوسری عورت سے "شادی" کی۔ بالآخر بھانڈا پھوٹا گرفتار ہوئی۔ اور ۱۷۲۱ء میں عدالت سے بعمر ۲۷ سال سزائے موت دیگئی[3]

---

[1] ارسطوفانیس (۴۴۸ ق م تا ۳۸۰ ق م) یونان کا مشہور ڈرامہ نویس اور ظریف شاعر تھا۔

(2) Havelock Ellis sexual inversion p. 196

(3) F. C. Muller Ein weiteres Fall von Conträren sexual empfindung.

عورت کے متعلق پوری طرح تفتیش کردہ واقعہ وہ ہے جو ہنگری کی Countess Sarolta ، پر چلایا گیا تھا۔ یہ عورت ہمیشہ مردانہ لباس میں رہتی تھی۔ اس نے ایک لڑکی سے "شادی" کرلی۔ اس غریب لڑکی کو اپنے "شوہر" کی جنس سے قطعی آگاہی نہ تھی۔ بہرحال مقدمہ چلا۔ لیکن ملزمہ عدالت سے بری ہوگئی بلکہ اسے مردانہ لباس پہننے کی بھی اجازت ملگئی[1]

ایک عجیب بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ جس طرح اس حرکت کے مرد شائقین میں اکثر صاحب کمال ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جن عورتوں کو اسکا شوق ہوتا ہے ان میں کوئی مردانہ خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ مگر ہم اس قول سے متفق نہیں۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ ایسی بہادر عورتوں سے بھری پڑی ہے جن میں یہ مذموم عادت نہیں پائی جاتی تھی مثلاً مصر کی ملکہ ہتشپ سُود Hatshepsu ، کو لیجئے جس کی نسبت ایک مورخ کا قول ہے کہ وہ "تاریخ میں سب سے پہلی صاحب عظمت و جلالت عورت" تھی۔ اس ملکہ میں زبردست مردانہ خصوصیات تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی یادگار مردانہ لباس میں قائم کرتی تھی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات مصنوعی داڑھی بھی لگالیتی تھی۔ اسی طرح آشوریہ کی ملکہ سیمی رامیس Semi Ramis ، ہندوستان کی ملکہ رضیہ سلطانہ چاند سلطانہ۔ نورجہاں بیگم۔ تارا بائی وغیرہ شجاعت، تدبر و سیاست میں مردوں سے کم نہ تھیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کو اس حرکت کا شوق تھا۔ مگر عہد قدیم و جدید میں بعض عورتیں ایسی ضرور گذری ہیں جو کسی خصوصیت فائقہ کی مالک تھیں اور انہیں

(1) Krafft-Ebing psychopathia sexualis

یہ ذوق بھی پایا جاتا تھا۔ چنانچہ کیتھرائن دوم زارینۂ روس اور سوئیڈن کی ملکہ کرسٹینا (Christina) مردانہ جرات و بہادری کے ساتھ استلذاذ بالمثل کی بھی عادی تھیں۔ بعض بڑی بڑی ماہر دنیات اور معلمہ اخلاق عورتیں ایسی گذری ہیں جو اسکی شائق تھیں مثلاً مادام بلافنکی (Blavatsky) اور لوئسی مائیچل (Louise Michel)

علاوہ ازیں اٹھارویں صدی سے ابتک دیکھا گیا ہے کہ بڑی مشہور ایکٹریسیں اور دیگر فنون کی اعلیٰ ماہر عورتیں کسی نہ کسی صورت میں اسکی شائق پائی گئی ہیں۔ سیفو (Sapphо) جو اپنے زمانہ میں بھی اسقدر زبردست شاعرہ مانی جاتی تھی کہ اسکا نام نہایت ادب و احترام کیساتھ شعرائے یونان کے باوا آدم ہومر کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ اس عادت میں مبتلا تھی۔ ایک لڑکی فاؤن (Phaon) کے عشق میں وہ اسقدر شدت سے مبتلا ہوئی کہ جان دینے کے لئے سمندر میں کود پڑی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو اسی ذوق و شوق کے ساتھ پرازجذبات خطوط لکھا کرتی تھی جیسے کہ الکائیس (Alcaeus) اپنے محبوب لڑکوں کو لکھا کرتا تھا۔[1] اس زمانہ کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے اندر یہ شوق قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا۔ اور اس فن میں اسپارٹا (Sparta) لزبوس (Lesbos) اور میطوس (Miletus) کی عورتیں زیادہ مشہور تھیں۔

---

[1] سیفو (Sapphо) کی اس بدنامی کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ انگریزی زبان میں لفظ "Sapphism" کا مفہوم ہی "خلاف فطرت فعل" ہو گیا۔

یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ لٹریچر میں بمقابلہ مردوں کے ایسی عورتوں کا ذکر زیادہ آتا ہے۔ اسکے متعلق ہم مختلف ممالک خصوصاً فرانس کے بہت سے شعراء اور ناول نویسوں کے اسناد پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً آریوسٹو (Ariosto) نے عورتوں کے اس قسم کے رجحانات خوب بیان کئے ہیں۔ ڈائدرو (Diderot) کا مشہور ناول "لا ریلیجیس" (La Religieuse) جب اول اول شایع ہوا تو عام خیال یہ ہوا کہ یہ ناول درحقیقت کسی کلیسہ کی کنواری (Nun) کا لکھا ہوا ہے۔ جس نے ان مظالم کا حال بیان کیا ہے جو دیر کی راہبہ (Nuns) پر کئے جاتے تھے۔ عوام کا خیال یہ بھی ہوا کہ مصنف نے راہبہ کے پردے میں درحقیقت (Princess of Chimay) کا خاکہ اڑایا ہے جو نائب السلطنت کی دختر اور شاہی خاندان کی ایک رکن تھی۔ اور یہ خاندان شاہی پشتہا پشت سے اس باب میں بدنام چلا آتا تھا۔

اسی طرح ایک فرانسیسی ڈرامہ بنام "لی پلیزرس دو کلائسٹر" (La Plaisirs du Cloitre) یعنی "راہبہ خانہ کا عیش و عشرت" ۱۷۷۳ء میں لکھا گیا اس میں بھی ایک سین اس ذوق کا دکھایا گیا ہے۔ ۱۸۳۵ء میں گاتے (Gautier) نے اسی قسم کی ایک عجیب و غریب و لچسپ حکایت "مادیموزیل دی ماپین" (Mademoiselle de Maupin) کے نام سے لکھی۔ اس میں ہیروئن مردانہ لباس پہنکر زندگی بسر کرتی ہے۔ کبھی عورتوں کو پٹہ بازی سکھاتی ہے اور کبھی کسی تھیٹر میں مغنیہ بنجاتی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ فرانس کے مشہور اور ہر دلعزیز فسانہ نگار موسیو اے بلو

A. Belot نے ایک دلچسپ ناول موسوم بہ "مادیموزیل جراد، مافمہ"
(Mademoiselle Giraud Mafemma)
شایع کیا جس سے عوام کو بہت دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس قصہ کا لب لباب یہ ہے کہ ایک شخص نے شادی کی تھی مگر اسکی بیوی پاس نہیں آنے دیتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی پرانی سہیلیوں سے بہت مالوف تھی۔ الغرض اسی قسم کے بہت سے ڈرامے بہت سے ناول اور بہت سی نظمیں ہیں جن میں مختلف مصنفین نے عورتوں کے اس شوق کا ذکر کیا ہے۔

ایک امر اور بھی قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اس شوق کے سلسلہ میں تشدد کے جسقدر جرائم سرزد ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر عورتیں ملوث پائی جاتی ہیں اس وقت کے مرد بوجہ اپنی نسائی خصوصیات کے کسی کو زدوکوب یا قتل کرنے کے مرتکب نہیں ہوتے، لیکن عورتیں ان جرائم سے بھی نہیں چوکتیں۔

اس قسم کا سب سے پہلا تاریخی مقدمہ وہ ہے جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اندر ۱۸۹۲ء میں ہوا اور جسے عرف عام میں "ممفیس کیس" (Memphis case) کہتے ہیں۔ واقعات مقدمہ یہ تھے کہ ایک عورت ایلائس مائچل (Alice Mitchell) نے مردانہ لباس اور نام اختیار کرکے ایک بھولی بھالی لڑکی فریڈاوارڈ (Freda Ward) کو بہکا کر اس سے شادی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب یہ راز فریڈا کی بہن کو معلوم ہوا تو کامیابی نہ ہوئی۔ ایلائس مائچل کے دل کو اس واقعہ سے اسقدر صدمہ گذرا کہ اس نے اپنی معشوقہ فریڈا ہی کا گلا کاٹ ڈالا۔ مقدمہ چلا۔ لیکن عدالت نے ملزمہ کو فاتر العقل قرار دیکر چھوڑ دیا۔

۲۱۴

ڈاکٹر جے۔ جی کیرنان (Kiernan) نے شکاگو کی دو بہنوں کی نسبت بیان کیا جو عام طور سے "ٹلر خواہران" (Tiller Sisters) کے نام سے مشہور تھیں۔ دونو بہنیں ادنیٰ درجہ کے تھیٹروں میں کام کیا کرتی تھیں۔ نسل کے لحاظ سے ان میں یورو پین اور حبشی خون ملا ہوا تھا۔ کہنے اور دیکھنے کو تو یہ دونوں عورتیں "بہنیں" تھیں۔ لیکن فی الحقیقت "میاں بیوی" کی طرح رہتی تھیں۔ ایک کو فطرتاً اس فعل سے رغبت تھی اور دوسری کو نفرت۔ چنانچہ جب اسکا تعلق کسی مرد سے ہو گیا تو اس نے اپنی بہن کو چھوڑ دیا۔ اس بہن کو آتش رقابت نے اسقدر جلایا کہ جب رات کو وہ دونوں کمرہ میں پڑے سو رہے تھے تو یہ چپ چاپ اس کمرہ میں گھسگئی اور مرد کو گولی ماردی۔ ملزمہ گرفتار ہوئی۔ مقدمہ چلایا گیا اور حبس دوام کی سزا دیگئی۔

ایسا ہی ایک واقعہ جو شکاگو میں گذرا تھا ماہ جون ۱۸۹۹ء کے مجلہ "نڈلین" (Medicine Nurse) میں شایع ہوا تھا۔ ایک سند یافتہ نرس دوسری جوان عورت کے ساتھ چودہ برس تک رہی۔ اسی دوران میں وہ عورت چار مرتبہ اسے چھوڑ کر چلی گئی لیکن ہر مرتبہ کہنے سننے سے واپس آگئی۔ آخرکار پانچویں مرتبہ جاکر اس نے ایک مرد سے شادی کرلی نتیجہ یہ ہوا کہ اس نرس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے اس مرد کو گولی کا نشانہ بنادیا۔ خوش قسمتی سے زخم مہلک نہ تھا۔ اور مرد کی جان بچ گئی۔ ملزمہ گرفتار ہوئی۔ مقدمہ چلا۔ لیکن عدالت نے صرف سزائے جرمانہ دینے پر اکتفا کی۔ یہ دو مرتبہ مردوں سے شادی کرچکی تھی۔ لیکن دونوں شوہروں کو چھوڑ بھاگی تھی۔

شکاگو میں ایک اور واقعہ ایسا ہی گذرا جس میں ایک روسی لڑکی آنا ربنیوچ (Annarubinowitch) نے ایک دوسری روسی لڑکی کو محض رشک

وحدکی بنا پر گولی ماردی۔ انّا اس لڑکی کو بچپن سے چاہتی تھی۔ معشوقہ کو گولی مار کر انّا نے اپنے بھی گولی مار لی۔ اور اس طرح دونوں کا خاتمہ ہوگیا۔ بات یہ ہوئی کہ انّا کی معشوقہ ایک مرد سے ملنے لگی۔ اس پر آتش رقابت بھڑکی جس نے "عاشق و معشوق" دونوں کا خاتمہ کر دیا۔

جن عورتوں کو اسکا شوق ہوتا ہے وہ کبھی کبھی دلشکستہ ہو کر خودکشی بھی کر لیتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۰۱ء میں امریکہ کی ریاست ساچوسیٹس (Massachusetts) میں ایک ایسی قسم کا واقعہ رونما ہوا۔ اکیس سال کی ایک لڑکی بیمار پڑی جسکی تیمارداری ایک شوہردار عورت نے کی۔ یہ عورت اس لڑکی سے عمر میں چودہ سال بڑی تھی۔ دونوں میں محبت پیدا ہوگئی۔ اور اسقدر بڑھی کہ عشق کے درجہ تک پہونچگئی۔ لیکن لڑکی کی ماں اور عورت کے شوہر کو یہ ضرورت سے زیادہ گہری محبت "ناگوار" معلوم ہوئی اور انھوں نے روک تھام کرنا چاہا۔ چنانچہ لڑکی کو ایک دور و دراز مقام پر بھیجدیا گیا۔ مگر باینہمہ دونوں میں چوری چھپے سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں کا راز افشا ہوگیا تو اور زیادہ سختی ہونے لگی۔ بالآخر مجبور ہو کر نوجوان لڑکی نے ریوالور لیا اور اپنی ماں کے سامنے اپنی کنپٹی میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ ۱۹۰۵ء بمقام نیویارک گذرا۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ ایک بہت پرانا جہازراں جو سالہاسال یوروپ اور امریکہ کے درمیان آنے جانیوالے جہازوں کی ناخدائی کر چکا تھا بیمار پڑا اور "ملاح خانہ" (Sailors Home) میں داخل کرلیا گیا۔ اسکا نام جان ویڈ (John Weed) تھا چند روز بعد دلشکستہ ہو کر اس کپتان نے اپنا گلا کاٹ لیا۔ [illegible] معلوم ہوا

کہ "کپتان وڈ" درحقیقت ایک عورت تھی۔ اور یہ بھی تفتیش حالات سے ثابت ہوا کہ خودکشی کا باعث اپنی "معشوقہ" سے جدائی تھی۔

نوجوان لڑکیاں بسا اوقات خوبصورت ایکٹریسوں پر ایسی عاشق ہو جاتی ہیں کہ انھیں دین و دنیا تک کی خبر نہیں ہوتی۔ اور اکثر اس یکطرفہ عشق کا نتیجہ مایوسی اور پھر خودکشی ہوتا ہے۔ مثلاً چند سال ہوئے کہ فلاڈلفیا میں ایک انیس سال کی نوجوان لڑکی جو ایک متمول اور عالی مرتبہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور خود بھی نہایت حسین وجمیل اور اعلیٰ تعلیمیافتہ تھی، مس میری گارڈن ایکٹریس پر عاشق ہوگئی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے ملاقات کرنا کبھی نصیب نہ ہوا۔ نوجوان عاشق زار لڑکی ایکٹریس کی تصویر کے سامنے دوزانو بیٹھ جاتی اور اسکی پوجا کیا کرتی۔ اور پھر اس خیال سے کہ شاید اسے کبھی میری گارڈن کی مشاطگی کی مسرت نصیب ہو نوجوان لڑکی نے بال اور ناخن بنانا بھی سیکھے، اور آخر کار دلشکستہ ہو کر ریوالور سے خودکشی کر لی۔ اسی قسم کے صدہا واقعات روزمرہ اخباروں میں شایع ہوتے ہیں۔ صرف چند واقعات بطور مثال درج کر دیئے گئے۔

یہ شوق صرف قدیم یونانی عورتوں ہی میں نہیں تھا بلکہ قدیم اینگلو سیکسن (Anglo Saxons) قوم میں بھی تھا۔ جسکا ثبوت یہ ہے کہ ساتویں صدی میں تھیوڈور کی کتاب "الکفارہ" (Theodore's Penitential) رائج تھی جس میں اس فعل کے شایق مردوں اور عورتوں کے لئے بطور کفارہ علیحدہ علیحدہ ریاضتیں درج تھیں مرد کے لئے مدت ریاضت اگرچہ زیادہ تھی لیکن عورت کے لئے صرف تین سال کی ریاضت مقرر کی گئی تھی۔

دنیا کی تمام وحشی قوموں کی عورتوں میں یہ شوق مردوں سے زیادہ پایا جاتا ہے

ڈاکٹر مورینہاؤٹ (Moorenhout) سیاح کا قول ہے کہ نیوزیلینڈ کی عورتوں کو اسکا بہت شوق ہے۔ یہی حال برازیل کی عورتوں کا ہے۔ ڈاکٹر گنڈاوو (Gandavo) نے اقوام برازیل کی نسبت تحریر کیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندوں میں عورتوں کا ایک خاص طبقہ ہے جنھوں نے تمام عمر پاکدامن رہنے اور کسی مرد کی صورت نہ دیکھنے کا عہد کر لیا ہے۔ یہ عورتیں تمام زنانہ مشاغل ترک کر دیتی ہیں۔ تمام کام مردوں جیسے کرتی ہیں۔ بال بھی ترشوا کر مردوں جیسے رکھتی ہیں یہ عورتیں تیر و کمان سے مسلح ہو کر مردوں کے ساتھ میدان جنگ میں جاتی اور لڑتی ہیں۔ ہر عورت کے ساتھ ایک دوسری عورت ہوتی ہے جو اسکی ہر طرح خدمت کرتی ہے[1]

امریکہ کے اصلی باشندوں میں اس طرح کی عورتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں یہ شوق زمانۂ قبل از تاریخ سے چلا آتا ہے مثلاً برطانوی کولمبیا (Columbia) کی قدیم قوم سالش (Salish) میں اس قسم کی روایتیں بکثرت پائی جاتی ہیں[2]

کناڈا و مونتانا کی قوم اسینی بوئین (Assiniboine) اور آٹووہ (Ojibwa) کی قوم "فاکس" (Fox) میں بھی قدیم روایات اس طرح کی پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے ہم دو روایتیں ذیل میں درج کرتے ہیں:—

(1) Gandavo, quoted by Lamacco, Archivio per le Antropologie, 1889

(2) Journal Anthropological Institute July Dec. 1904. p. 342.

ایک روایت یہ ہے کہ ایک شخص کی بیوی اپنی نند کی محبت میں اسقدر مبتلا ہوئی کہ دونوں نند بھاوج گھر سے بھاگ گئیں۔ ان دونوں کے تعلق سے ایک بچہ پیدا ہوا جو گوشت کا لوتھڑا تھا۔ مرد نے ان دونوں کا تعاقب کرکے ڈھونڈھ نکالا اور اپنی بیوی اور اس مضغۂ گوشت لڑکے کو مار ڈالا۔

دوسری روایت ہے کہ عرصہ ہوا کسی زمانہ میں دو جوان عورتیں آپس میں بہت محبت رکھتی تھیں اور اسی طرح دو جوان مرد آپس میں بہت دوست تھے۔ دونوں مرد ان عورتوں میں سے ایک ایک پر فریفتہ تھے۔ لیکن وہ عورتیں ان سے بات تک نہ کرتی تھیں۔ چند روز تک تو ان جوانوں نے صبر و ضبط سے کام لیا مگر پھر انھیں ان عورتوں کی طرف سے کچھ شک پیدا ہوا۔ بالآخر ایک دن موسم گرما میں جب وہ دونوں عورتیں باہم ملکر جنگل میں لکڑیاں توڑنے گئیں تو وہ دونوں جوان بھی چھپکر ان کے پیچھے گئے۔ اور ایک مقام پر خاموشی کے ساتھ چھپکر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تک تو وہ دونوں عورتیں لکڑیاں توڑنے میں مصروف رہیں۔ لیکن بعد میں انکی آواز آنا بند ہو گئی۔ جب یہ حالت ہوئی تو وہ دونوں جوان چھپے چھپے دبے پاؤں اس طرف گئے جہاں وہ عورتیں تھیں۔ اور وہاں جو کچھ دیکھا وہ ناقابل بیان ہے۔

بقول مسٹر جیکبس (Jacobs) (جنکا قول پلاس و بارٹیلس (Ploss & Bartels) نے بھی نقل کیا ہے) جزیرۂ بالی (Bali) کے مردوں میں جتنا شوق اس حرکت کا پایا جاتا ہے اسیقدر وہاں کی عورتوں کو بھی ہے۔

ڈاکٹر بامین (Baumann) سیاح جنھوں نے جزیرۂ زنجبار

وغیرہ کی خوب سیر و سیاحت کی ہے فرماتے ہیں کہ مردوں میں تو یہاں یہ شوق خیر پایا ہی جاتا ہے، لیکن یہاں کی عورتیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ یہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ مشرقی رسم و رواج کی وجہ سے یہ عورتیں کھلم کھلا مردانہ لباس نہیں پہن سکتیں۔ لیکن پرائیوٹ طور پر محلوں میں وہ ضرور ایسا کرتی ہیں۔ اس قسم کی عورتوں کی چال ڈھال تمام مردانہ ہوتی ہے۔ اور خوبصورت عورتوں کو سبز باغ دکھا کر اپنے پھندے میں پھانس لیتی ہیں۔

ڈاکٹر کوچر ( Kocher ) لکھتے ہیں کہ اگرچہ عرب مردوں میں یہ شوق بہت عام ہے۔ لیکن ان کی عورتوں میں یہ شوق اسقدر زیادہ نہیں ہے۔ مصر کے متعلق ڈاکٹر گوداڑ، کوچر ( Gouard Kocher ) لکھتے ہیں کہ اس ملک کی عورتوں میں یہ شوق فیشن بنگیا ہے۔ حتیٰ کہ حرم سرا کی ہر عورت اپنے لئے ایک "دوگانہ" رکھتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ٹرکی کی عورتوں میں یہ شوق بہت شاذ پایا جاتا ہے۔ البتہ سولھویں صدی میں بقول برانٹوی ( Brantome ) ترک عورتوں کا یہ شوق وہاں کے حماموں میں نظر آتا تھا۔ اور اسی صدی میں لیو افریقانوس ( Leo Africanus ) نے بیان کیا تھا کہ مراکش کی عورتیں اس میں اسقدر مبتلا ہیں کہ وہاں دارالخلافہ شہر فاس ( Fez ) میں ایسی عورتوں کے باقاعدہ اڈے موجود ہیں۔ شہر ماسیہ میں ایک ترک شاعرہ کی قبر ہے جس کا نام مہری خانم تھا۔ اور اس شوق میں سیفو سے کم شہرت نہ رکھتی تھی۔

ڈاکٹر کوریے ( Corre ) کا بیان ہے کہ فرانس کے افریقی مقبوضات

کی عورتوں میں بھی یہ شوق بشدت پایا جاتا ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ "مین ایک خوبصورت اور شریف یوروپین عورت سے واقف ہوں جو کئی بچوں کی ماں ہے۔ یہ شریف عورت ڈر کے مارے بازار نہیں جاتی۔ کیونکہ وہاں کی عورتیں اس سے گستاخانہ طور پر اظہار عشق کرنے لگتی ہیں۔ اور ایسے ایسے اشارے کنائے کرتی ہیں جسے کوئی شریف زادی گوارا نہیں کر سکتی"۔ انھی ڈاکٹر صاحب نے کئی واقعات ایسے بیان کئے ہیں کہ بعض دیسی عورتیں نے کمسن لڑکیوں کو پکڑ کر زبردستی انکو اپنا معمول بنایا۔

بقول ڈاکٹر لوریاں (Lorian) چین و ماچین کی عورتوں میں اس شوق کا پتہ نہیں۔ لیکن ہندوستان کے زن و مرد میں یہ شوق موجود ہے۔ ہندوستان کی عورتوں میں اس کے شائق ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستانی زبان میں اس شوق کے متعلق کم از کم پانچ اصطلاحیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی (۱) دوگانہ۔ (۲) زناخی۔ (۳) سعتر۔ (۴) چپٹ ہائی۔ (۵) چپٹ باز۔

ہندوستانی شعرا نظیر۔ رنگین۔ و جان صاحب نے اپنے کلام میں اس شوق کی نسبت بکثرت اشارے کئے ہیں۔ بلکہ جان صاحب نے تو تمام کارروائی کھلم کھلا بیان کر دی ہے۔ عورتوں کی اصطلاح میں اس فعل کو "چپٹ" یا "چپٹی" کہتے ہیں۔ اور ایسی عورتوں کی اصطلاح میں "ساتھ رہنے" کو "جدا رہنا" کہتے ہیں۔

ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب (Sexual Inversion) میں ہندوستان کے بعض واقعات بیان کئے ہیں مثلاً:۔

"شہر . . . . کے جیلخانہ میں سپرنٹنڈنٹ نے عورتوں کے احاطہ سے متعدد آلات برآمد کئے جو چکنی مٹی سے بنا کر دھوپ میں سکھا لئے گئے تھے۔ ان کے دیکھنے سے ظاہر

ہوتا تھا کہ انھیں کام میں لایا گیا ہے "

"شہر ... کے قید خانہ میں ایک مرد نما عورت تھی جو اوائل عمر سے خراب ہو کر کسبی بنگئی تھی۔ اس عورت کی "بیوی" ایک ذلیل سی عورت تھی۔ لیکن اس میں عنصر نسائیت زیادہ غالب تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک روز وہ عورت مقامی پنڈت جی کے پاس گئی اور ان سے درخواست کی کہ وہ دیوتا سے کہہ سنکر ایسا کردیں کہ اسکی "بیوی" حاملہ ہو جائے۔ واضح ہو کہ سنسکرت کی کتب طب مثلاً چرک و سشرت میں اس امر کا امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ دو عورتوں کے اس تعلق سے حمل قرار پاکر ایک مضغۂ گوشت بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو "آریوں کے علم طب کی مختصر تاریخ" (A Short History of Aryan Medical Science)"

"شہر ..... میں دو عورتیں "جدا جدا رہتی تھیں" ان میں ایک برہمنی تھی اور دوسری گڈریہ۔ دونوں آپس میں "میاں بیوی" تھیں۔ اسی طرح ایک مسلمان عورت کو دیکھا گیا جس نے اسکا اقرار کیا۔ ایک اور مسلمان عورت نے بیان کیا کہ اسے یہ شغل بارہ برس کی عمر میں ایک پڑوسن نے سکھایا تھا۔ اسی طرح مالن کی دو بیوہ لڑکیاں تھیں جو اسکی شایق تھیں "

ہندوستان کے جیلخانوں میں عورتوں کا جو حال ہے وہی یوروپ کے جیلخانوں میں ہے۔ بلکہ بعض امور کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یوروپ کے قیدیوں میں مردوں کے اندر استلذاذ بالمثل کی علت اسقدر زیادہ نہیں جسقدر عورتوں میں ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بات بھی بہت دلچسپ ہے۔ یعنی پیشہ ور عورتوں میں بھی جنھیں مردوں کی کوئی کمی نہیں، اسکا شوق ہوتا ہے۔ برلن میں ۲۵ فیصدی

پیشہ ور عورتیں یہ شوق رکھتی ہیں۔ اور بقول پیرنٹ دوشاتلے (Parent-Duchatelet) پیرس میں بھی یہی نسبت ہے۔ لیکن ڈاکٹر بورنوائل (Bourneville) کا قول ہے کہ پیرس کے شفاخانوں میں جسقدر عورتیں زنانہ امراض کے سلسلہ میں زیر علاج ہیں ان میں ۵۰ فیصدی ایسی ہیں جو اسکی عادی تھیں۔ ڈاکٹر ہیمر کا قول ہے کہ جرمنی کے اندر سنجلہ ۶۶ کے ۴۱۔ اسکی شایق پائی گئیں۔ ہیولاک ایلس (Have lock Ellis) کے ایک دوست نے بیان کیا کہ پیرس کی پیشہ ور عورتوں میں اسکا شوق بیحد رائج ہے۔

لومبروزو اور فریرو (Lombroso ferrero) نے اپنی کتاب "بیت اخلاق عورت" (La-Donna-Delinquente) میں پیشہ ور عورتوں میں اس شوق کے پائے جانے کے اسباب حسب ذیل تحریر کئے ہیں:—

(۱) ضرورت سے زیادہ ہیجان نفس (۲) عرصہ تک مرد سے دور کسی جگہ مقید رہنا۔ (۳) ہر وقت عورتوں ہی کی صحبت میں رہنا جیسا قحبہ خانوں میں اکثر ہوتا ہے۔ (۴) بڑھاپا اور خواہش نفسانی کی زیادتی (۵) پیشہ کرتے کرتے جنس مقابل سے جی بھر جانا یا نفرت ہو جانا۔ (۶) آنے جانے والوں کے ساتھ محبت کا نہ ہونا۔

یہ شوق خصوصیت کے ساتھ اُن عورتوں میں زیادہ نظر آتا ہے جو اپنے مشاغل زندگی کے لحاظ سے زیادہ وقت مردوں سے علٰحدہ بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ چنانچہ کلیسہ کی کنواریوں (Nuns) میں اور بڑے بڑے ہوٹلوں کی خادمہ عورتوں میں اسی سبب سے یہ عادت پائی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں سوئٹزرلینڈ کا ایک واقعہ بیان کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا۔ ایک انگریز نے معہ اپنی بیوی کے وہاں بود و باش اختیار کی۔ اور بیوی

کے لئے ایک خوبصورت لڑکی بطور پیش خدمت ملازم رکھی گئی۔ جسے رات دن یہیں رہنا پڑتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ رات کے وقت سونے کے لئے اور نئی نئی عورتیں لاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ عورت پہلے ایک بڑے ہوٹل میں کام کیا کرتی تھی۔ وہیں اُسے یہ شوق پیدا ہوا تھا۔

اسی طرح بڑی بڑی دوکانوں، کوٹھیوں اور کارخانوں میں جو لڑکیاں یا عورتیں عرصہ تک ساتھ رہتی ہیں بلکہ جنھیں ایک ہی جگہ سونے کا موقعہ ملتا ہے انمیں یہ شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ایک کمرہ میں صرف دو عورتیں ہوں۔ رومہ کے کارخانوں میں نائسفورو (Niceforo) نے عورتوں کے متعلق زبردست تحقیقات کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ "قوم کی وہ نیک بچیاں" جنکی عمر بارہ چودہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور جو بغل میں بقچہ دبائے، نگاہیں نیچی کئے نہایت معصومانہ انداز سے گذر جاتی ہیں، اپنے دلوں میں کیسے طوفانی جذبات رکھتی ہیں سلائی کے کارخانوں میں جاکر دیکھئے کہ جس وقت کوئی نگراں موجود نہیں ہوتا تو ان لڑکیوں میں باہمدگر کس قسم کی شہوت انگیز باتیں ہوتی ہیں۔ بلکہ بسا اوقات وہ نگراں کی موجودگی میں بھی معمہ کے اندر باتیں کرلیتی ہیں۔ الغرض ان کارخانوں میں ہر وقت ایک پرہیجان فضا طاری رہتی ہے جس سے متاثر ہوکر اکثر لڑکیاں "خیالی استلذاذ" (Psychic onanism) کرتی رہتی ہیں۔ یا بعض اوقات کسی اور طریقہ سے عملاً استلذاذ کرلیتی ہیں۔

موسم گرما میں صورتِ حالات اور زیادہ موافق ہو جاتی ہے کیونکہ کمروں کے اندر لڑکیاں زیر جامہ نہیں پہنتیں بلکہ اکثر اپنے شلوکوں کے بٹن بھی کھولدیتی ہیں۔

ران پر ران رکھکر کام کرتی ہیں جس سے ان کا بدن کم وبیش عریاں ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اکثر لڑکیاں قریب کھسک کر ایک دوسرے کو عریاں دیکھتی ہیں، بعض اپنی گداز رانوں کی تعریف کرتی ہیں بعض کو اپنے سڈول سُرینوں پر ناز ہوتا ہے۔ اور اس مشغلہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ تمام حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ دوپہر سے دو بجے دن تک جبکہ سخت گرمی ہوتی ہے، یہ منظر اور بھی زیادہ ہیجان انگیز ہو جاتا ہے۔ اسوقت کارخانہ کی مالکہ تو اپنے کمرے میں جاکر سو جاتی ہے۔ میدان خالی ہوتا ہے اور تمام لڑکیاں بلا استثناء استلذاذ غیر فطری میں مشغول ہو جاتی ہیں[1]۔

مندرجہ بالا واقعات کا تعلق چونکہ نوعمر لڑکیوں سے ہے اسلئے ممکن ہے ان کے شغل کو "بچیوں کا کھیل" خیال کیا جائے۔ لیکن بڑی عمر کی عورتوں میں تو اس قسم کے واقعات دیکھے گئے ہیں جن کی نوبت جبر تک پہونچتی ہے۔ ہسپانیہ کے سگار سازی کے کارخانوں میں بھی عورتوں کے اندر یہ شوق دیکھا گیا ہے۔ فصل گرما میں یہ تقریباً عریاں ہو کر کام کرتی ہیں اور اسلئے جب کارخانہ کے اندر کوئی غیر شخص آتا ہے تو اطلاع کے لئے پہلے سے گھنٹی بجا دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنا اپنا لباس پہن لیں۔

سیوائل (Seville) کے ایک ایسے ہی کارخانہ کا مندرجۂ ذیل واقعۂ قابل غور ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کی عورتوں میں رشک وحسد کے جذبات بھی نہایت سختی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں:۔ "ایک صبح جب کارخانہ میں داخل ہو کر کاریگر عورتیں اپنا صاف ستھرا لباس اتار کر کام کرنے کے کپڑے پہن رہی تھیں، ایک عورت نے اپنی شال کے نیچے سے چھرا نکالکر دوسری عورت پر اچانک حملہ

(1) Niceforo Il Gergo cap VI 1897 Turian

Digitized by commisionedwriting.com for the IdeaMines collective.

۲۲۵

کیا اور اسکے چہرہ اور گردن پر جلد جلد چھ سات زخم لگائے۔ اور دھمکی دی کہ اگر کسی نے دخل دیا تو وہ اسے بھی قتل کر ڈالے گی۔ یہ دونوں عورتیں اس کارخانہ میں عرصہ سے کام کرتی تھیں۔ اور استانیوں میں داخل تھیں۔ ایک کی عمر ۴۸ سال تھی جسمیں کسیقدر مردانہ پن تھا اور دوسری کی عمر ۳۲ سال تھی جس میں نسوانی خصوصیات کا غلبہ تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں عورتیں آپس میں ناجائز تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن چند روز سے کم عمر عورت کسی اور عورت سے "ملنے" لگی تھی۔ اسلئے پہلی عورت کے دل میں جذبات رشک وحسد بھڑک اٹھے اور اس نے دونوں کو قتل کر ڈالنے کا ارادہ کرلیا۔"

تھیٹروں میں بھی عورتوں کا عموماً یہی حال دیکھا گیا ہے۔ کیونکہ ایکٹرسوں کو بار بار بہروپ ہوکر نیا نیا لباس بدلنا پڑتا ہے۔ اور بعض اوقات کسی خاص پارٹ کے لئے علیحدہ کمرے میں گھنٹوں بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔ ان باتوں سے ایکٹرسوں کی طبیعت استلذاذ بالمثل کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔

سن شعور تک پہونچنے سے پہلے ہی اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بھی اسکا شوق پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ بورڈنگ ہاؤس میں جب دو لڑکیاں ایک کمرہ کے اندر رہتی ہیں تو دونوں میں عموماً الفت پیدا ہو جاتی ہے اور یہیں سے استلذاذ بالمثل کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب Sexual [illegible] (صفحہ [illegible]) میں ایک عورت کی تحریر درج کی ہے جس میں اسنے ظاہر کیا ہے کہ:-

"اسکول کی اکثر لڑکیوں کی طرح مجھے بھی وہیں کی ایک لڑکی نے اس طرف راغب کیا۔ اور پھر میں نے دو اور لڑکیوں کو اسکا عادی بنایا۔"

لڑکیوں میں اسکا شوق پیدا ہونے کے اسباب عموماً حسب ذیل ہوتے ہیں:-
(۱) لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت آزادی سے مل سکتی ہیں اور لڑکے ایسا نہیں کر سکتے (۲) لڑکیوں میں محبت و خلوص کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے (۳) معاشرتی رواج کے موافق کوئی لڑکی کسی جوان مرد سے مخلی بالطبع ہو کر نہیں مل سکتی لیکن جوان لڑکیاں آپس میں ملسکتی ہیں (۴) رواجاً جوان لڑکیوں کا آپس میں بے تکلف ہو کر ملنا برا نہیں سمجھا جاتا۔

اس امر کی شایق عورتوں میں کسیقدر مردانگی پائی جاتی ہے اور وہ اکثر لباس مردانہ کر لیتی ہیں۔ بعض مثالیں اس قسم کی ہم پیش کر چکے ہیں۔ بعض اور دلچسپ تاریخی واقعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

پادری جوزف لاڈیل (Cadell) جس کا اصلی نام لیوسی تھا، عورت ہی تھی لیکن مردانہ لباس میں رہتی تھی۔ جوانی میں ایک مرد سے شادی کی۔ ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ لیکن شوہر سے موافقت نہ ہوئی اور وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بالآخر لیوسی نے مردانہ لباس اختیار کیا۔ اور اپنا نام پادری لاڈیل رکھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کی قادر انداز تھی۔ رائفل سے بال باندھ نشانہ مارتی تھی۔ بسر اوقات کے لئے اس نے شکاری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اور امریکہ کے اصلی باشندوں میں لانگ ایڈی کی شکاری عورت (Female hunter of Long Ede) کے نام سے مشہور ہوئی۔ فن شکار پر اس نے ایک کتاب بھی لکھی جو کافی مقبول ہوئی۔ اس اثنار میں وہ ایک نوجوان تعلیمیافتہ عورت پر فریفتہ ہو گئی۔ اس عورت کا خاوند بھی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ بالآخر دونوں نے "شادی" کر لی لیکن چند روز

بعد بھاگ پھوٹ گیا۔ اور حکومت نے لیوسی کو بعلت آوارہ گردی قید کر دیا۔ لیکن جب دوسری عورت نے عرضیاں دے دیکر حکومت کا ناک میں دم کر دیا تو اسکو چھوڑ دیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ پر لطف ایک اور واقعہ ہے جو مجلہ "لینسٹ" (Lancet) بابتہ ماہ فروری ۱۸۸۴ء میں درج ہوا تھا:—

"بندرگاہ بلفاسٹ میں ایک مزدور جان کولٹر (John Conlter) نامی بارہ سال سے ملازم تھا۔ ایک روز وہ اتفاقاً زینہ سے گر کر مر گیا۔ معائنہ کے وقت یہ راز کھلا کہ متوفی جس کی عمر اس وقت پچاس برس کی تھی درحقیقت عورت تھا۔ جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بحیثیت مرد بسر کیا تھا۔ اسکے ہاتھ پاؤں اور اوضاع واطوار بالکل مردانہ تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جب وہ "جوان تھا" تو ایک کسان کے یہاں مزدور کی حیثیت سے کام کیا کرتا تھا۔ اس وقت اس نے اپنے مالک کی لڑکی سے باقاعدہ "شادی" کر لی تھی۔ دونوں "میاں بیوی" انتیس ۲۹ برس تک اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن پچھلے چھ سال سے دونوں میں علحدگی ہو گئی تھی جسکا باعث اسکی کثرت شرابخواری تھی"

ذیل کا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے جو ویکلی اسکاٹسمین (Weekly Scotsman) بابتہ ماہ فروری ۱۹۰۱ء میں شایع ہوا تھا۔

میری اینڈرسن (Mary Anderson) عرف "مرے ہال" (Murray Hall) جسکا ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا، اسکاٹلینڈ میں بمقام گووان (Govan) پیدا ہوئی۔ اوائل عمری میں یتیم ہو گئی اور جب اسکا بھائی بھی مر گیا تو وہ اسکے کپڑے پہنکر بحیثیت مزدور اڈنبرا چلی گئی۔ لیکن

ایک مرتبہ جب وہ بیمار ہوئی تو اسکا راز فاش ہو گیا۔ اسکاٹلینڈ سے بھاگ کر امریکہ پہونچی جہاں وہ مردانہ لباس اور مشاغل میں تیس برس تک نظر آئی اور اسی دوران میں اس نے کافی دولت جمع کر لی۔ وہ اکثر سیاسیات میں بھی حصہ لیتی تھی۔ اور بزمہائے نشاط میں بھی شرکت کرتی تھی۔ وہ شراب خوب پیتی اور شراب پی کر خوب فحش گیت گاتی تھی۔ مردوں کی طرح گھونسہ بازی بھی کرتی تھی۔ اس نے دو مرتبہ "شادی" کی۔ پہلی شادی کے بعد خلع ہو گیا۔ لیکن دوسری "بیوی" بیس برس تک زندہ رہی۔ اسکے علاوہ وہ کئی نوجوان لڑکیوں سے بھی اختلاط کرتی رہتی تھی۔ مرنے کے بعد اسکی جنسیت کا راز فاش ہوا"

ایک اور واقعہ جو لندن کے اخباروں میں شایع ہوا تھا کیتھرائن کوم (Catherine Coome) کا ہے جو چالیس برس تک کامیابی کیساتھ مرد بنی رہی۔ اس نے مردوں کی تمام باتیں اختیار کر لی تھیں یہانتک کہ اس نے ایک اور عورت سے "شادی" بھی کر لی تھی"

۱۹۰۱ء میں تختہ جہاز پر ایک عورت مس کیرولائن ہال (Caroline Hall) ساکن بوسٹن کی موت واقع ہوئی جو عرصہ تک شہر میلان میں مصوری کرتی رہی تھی۔ یہ عورت مردانہ لباس پہنتی تھی اور ایک اطالوی لیڈی کے "شوہر" کی حیثیت سے رہتی تھی۔ وہ اپنا نام ہمیشہ "مسٹر ہال" بتاتی تھی۔ اس کے اوضاع و اطوار تمام مردانہ تھے۔ وہ رائفل سے نہایت اچھا نشانہ لگاتی تھی۔ اور تمام مردانہ کھیلوں میں شرکت کرتی تھی۔ مرض دق میں مبتلا ہو کر فوت ہوئی۔

سب سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ شہر سیوائل (Seville) کے ایک پولیس مین کا ہے جو تیس برس تک حاکم شہر کا اردلی رہا۔ ایک اتفاقی حادثہ

میں مضروب ہوکر وہ اسپتال پہونچا جہاں یہ راز فاش ہوا کہ زخمی پولیس مین مرد نہیں بلکہ دراصل ایک سن رسیدہ عورت ہے۔ اس نے اپنا نام فرینڈو میکنزی Fernando Mackenzie رکھا تھا۔ اور اگرچہ اس نے عرصۂ دراز تک پولیس کی ملازمت کی لیکن اسکا راز کسی طرح بھی فاش نہ ہوسکا۔ یہ عورت ۱۸۳۶ء میں بمقام پیرس پیدا ہوئی تھی۔ اسکا باپ انگریز اور ماں ہسپانوی تھی۔ اس نے اوائل عمر ہی سے مردانہ لباس اختیار کرلیا تھا۔ اور فرانسیسی فوج میں بطور سپاہی ملازم ہوگئی تھی۔ مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد وہ ۳۵ سال کی عمر میں ہسپانیہ میں آکر رہنے لگی۔ اور یہاں بھی اس نے جوڑ توڑ لگاکر محکمہ پولیس میں نوکری کرلی۔ میڈرڈ میں اس نے ایک عورت سے "شادی" کرلی۔ اس عورت کے پہلے خاوند سے ایک لڑکا بھی تھا۔ جسے وہ ہمیشہ اپنا لڑکا بتایا کرتی تھی۔ میڈرڈ سے وہ سیوائل تبدیل ہوئی جہاں وہ شہر کے گورنر کی خدمت میں بحیثیت باورچی اور اردلی تعینات کی گئی۔ اسی طرح وہ یکے بعد دیگرے سات گورنروں کی ماتحتی میں رہی۔ لیکن جب اسکا راز فاش ہوگیا تو اسے ملازمت سے بغیر پنشن کے علیحدہ کردیا گیا۔ دو سال پیشتر اسکی "بیوی" کا انتقال ہوچکا تھا۔ جسکا جنازہ اس نے بہت دھوم دھام سے اٹھایا تھا۔

---

۱۹۰۶ء میں بمقام شکاگو روسی قونصل کے معتمد خصوصی نکولس دی ریلان (Nicholas de Rayton) کا بعمر ۳۳ سال انتقال ہوگیا۔ تجہیز و تکفین کے وقت معلوم ہوا کہ وہ دراصل "عورت" ہے۔ وہ ہمیشہ مردانہ لباس پہنتی تھی۔ امریکہ میں اس نے دو مرتبہ شادی کی لیکن پہلی بیوی نے دس برس کے بعد طلاق

لے لی۔ اور شکایت یہ کی کہ اسکا "شوہر" ظلم کرتا ہے اور تھیٹر کی ایکٹرسوں کی صحبت میں رہتا ہے۔ بعدازاں اس نے ایک دوسری عورت سے جو تھیٹر میں رامشگر کا کام کرتی تھی "شادی" کی۔ یہ عورت اپنے "شوہر" کی بہت وفادار اور خدمتگذار تھی۔ دونوں بیویوں کو کامل یقین تھا کہ اُنکا "شوہر" مرد کامل ہے۔

۱۹۰۹ء میں بمقام سینٹ لوئی (St Louis) ایک ۲۲ سالہ نوجوان عورت کا راز فاش ہوا۔ جو نو سال تک مرد بنی رہی تھی۔ اس نے مردانہ بھیس میں مختلف جگہ محنت مزدوری کی۔ اصطبلوں میں سائیسی کی اور لوہار کے ہاں گھن چلایا۔ ایک مرتبہ اسے ایک آدمی نے متبنیٰ کر لیا۔ جسکے چند لڑکیاں بھی تھیں۔ اس نے ان لڑکیوں کو بھی دھوکا دیا اور خود کو مرد بتایا۔ ۱۹۰۲ء میں وہ بمقام سینٹ لوئی آئی۔ اور ایک کارخانہ میں بید کی کرسیاں اور ٹوکریاں وغیرہ بنانے لگی۔ تمام کاریگروں سے مردوں کی طرح بدرجۂ مساوات ملتی تھی۔ ایک خصوصیت اس میں اور بھی تھی یعنی وہ ہمیشہ مشکل کام کرنا پسند کرتی تھی اور سخت سے سخت محنت سے نہیں گھبراتی تھی۔ وہ مردوں کی طرح شراب پیتی، مردوں کی طرح گالی بکتی، لڑکیوں سے محبت کرتی شکار کھیلتی، مچھلیاں پکڑتی۔ اور جب کبھی کوئی جھگڑا ہو جاتا تو آستینیں چڑھا کر لڑنے کو تیار ہو جاتی، اسکا جسم ورزشی ہو گیا تھا۔ فٹ بال وہ کھیلتی تھی۔ کرکٹ وہ کھیلتی تھی۔ اکھاڑہ میں کشتیاں وہ لڑتی تھی اور اچھے اچھے طاقتور پٹھوں کو پچھاڑ دیتی تھی۔

۱۹۱۲ء میں بمقام لندن ایک ۲۳ سالہ خادمہ ایکٹن (Acton) کی عدالت فوجداری میں پیش ہوئی۔ وہ ہمیشہ مردانہ لباس میں رہتی تھی۔ اور ایک دوسری خوبصورت عورت کے ساتھ جو اس سے کمسن تھی بحیثیت شوہر کے رہتی تھی۔

Digitized by commisionedwriting.com for the IdeaMines collective.

لیکن عدالت نے دونوں عورتوں کو ان کے اعزہ کے سپرد کر دیا۔ بلکہ ان کے لئے نوکری کی بھی فکر کر دی۔ اور چونکہ ان دونوں میں اسقدر محبت تھی کہ وہ ہرگز جدا نہ رہ سکتی تھیں۔ اسلئے مجبوراً دونوں کو ساتھ رہنے کی اجازت دیدی گئی۔

ایسی ہی ایک اور عورت کورا اینڈرسن (Cora Anderson) تھی۔ یہ عورت تیرہ برس تک مرد بنی رہی۔ اور دو عورتوں کو بیوی کی حیثیت سے اپنے پاس رکھا۔

جزیرہ نمائے بلقان کی جنوبی سلافی قوم کی عورتوں میں استلذاذ بالمثل کا طریقہ سحق کے طور پر ہے۔ لیکن سب سے زیادہ عام طریقہ وہ ہے جس میں ایک مصنوعی آلہ یا "صبورہ" سے کام لیا جاتا ہے۔ مصنوعی آلہ کے استعمال کا طریقہ قدیم یونان میں بھی رائج تھا جیسا کہ ہیروندس (Herondas) نے بیان کیا ہے۔ اور سوکداس (Sindas) کا قول ہے کہ اس کی ایجاد ملیطوس (Miletus) کی عورتوں نے کی تھی۔ اور ارسطوفانیس (Aristophanes) نے اپنی کتاب "لائسستراتہ" (Lysistrata) میں لکھا ہے کہ مصنوعی آلہ بنانے کی خاص جگہ ملیطوس تھی۔ یوروپ میں بزمانۂ قرون وسطیٰ بھی اسکا رواج موجود تھا۔ چنانچہ بارھویں صدی میں شہر وارمس (Worms) کے اسقف برچارڈ (Burchard) نے اسکا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح اٹھارھویں صدی کے اوائل میں مارگریٹ لنکن (Margaret Linkin) نے جرمنی میں اس کی مدد سے ایک عورت کیساتھ "شادی" کی تھی۔

سولھویں صدی میں فرانس کے اندر بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہوا تھا۔

مقام شاموں (Shammount) کی چھ سات لڑکیوں نے یہ ارادہ کیا کہ مردوں کا لباس پہنیں اور مردوں جیسے کام کریں۔ ان میں سے ایک لڑکی مقام وتری (Vitry) پہونچی۔ اور ایک لڑکی پر عاشق ہو کر اس سے شادی کر لی۔ لیکن بدقسمتی سے شامون کے ایک شخص نے اسے پہچان کر راز فاش کر دیا۔ پکڑی گئی۔ مقدمہ چلایا گیا۔ اور عدالت نے پھانسی کی سزا دیدی۔[1]

---

(1) Inoulaig ues journal due voyage-en-Italian. 1850

۲۳۳

# استلذاذ بالوحوش

(Zoroastra)

استلذاذ بالوحوش کے متعلق سب سے پہلا تاریخی ثبوت مشہور و معروف یونانی مورخ
وسیاح ہیرودوطوس (Herodotus) کا بیان ہے جس نے منڈیس
(Mendes) کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں ایک مقدس بکرا ہے جس کی
لوگ بیحد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مقدس بکرا درحقیقت
پان دیوتا (Pan) کا اوتار ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں اولاد
حاصل کرنے کی خواہش میں اسکی مدد حاصل کرتی ہیں[1]

اسی طرح مصر قدیم کی عورتوں کے متعلق دولارے (Dulare)
نے لکھا ہے[2]

شت پتھ برہمن میں جسکا ترجمہ انگریزی "کتب مقدسہ مشرقیہ" کی جلد یازدہم
صفحہ ۳۲۵ پر موجود ہے اور جسکا اقتباس بھی میکڈانلڈ ایم۔ اے۔ ڈی۔ ڈی۔ نے
اپنی کتاب الموسوم بہ "ویدوں کے برہمن" صفحہ ۶۲ پر دیا ہے حسب ذیل روایت
لکھی ہے:۔

پہلے پرجاپتی اکیلا ہی تھا۔ اس نے چاہا کہ دنیا کو پیدا کرے۔ چنانچہ اس نے اگنی،

(1) Herodotus, book ii, chapter 46
(2) Dulare (Des divinités Generatrices, chapter 11)

دایو، آدیتہ وغیرہ دیوتاؤں کو پیدا کیا۔ بعدازاں اس نے اپنے منھ کی پھونک سے
گائے کو پیدا کیا۔ اگنی دیوتا نے جب گائے کو دیکھا تو اسکا دل للچایا۔ اور اس نے
چاہا کہ میں اس گائے کے ساتھ التفات کروں۔ چنانچہ وہ ایسا کر گذرا۔

سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی مشہور کتاب "سیتارتھ پرکاش" میں صفحہ ۳۲۴
پر تحریر فرمایا ہے:۔ "سنتے ہیں کہ اس ملک میں گورکھپور کا ایک راجہ تھا۔ پوپوں نے
یگیہ کرایا اور اسکی پیاری رانی کا سماگم گھوڑے کے ساتھ کرایا۔ جس سے وہ مرگئی۔"

قدیم خرافیات یونان میں بھی اسی قسم کی اکثر روایات موجود ہیں جن میں کسی
دیوی یا دیوتا کا بہ صورت انسان جانوروں سے حظ حاصل کرنا ثابت ہوتا ہے۔ ان میں
آؤ (Io) اور سانڈ بیل۔ اور لیڈا (Leda) اور ہنس کی روایات زیادہ
مشہور ہیں۔

بائبل مقدس کے مطالعہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اب سے چار پانچ ہزار
برس پیشتر ملک فلسطین اور قریب کے ممالک میں بھی استلذاذ بالوحوش کا شوق لوگوں
میں موجود تھا۔ چنانچہ توریت میں ایسے شخص کے لئے حسب ذیل سزا مقرر ہے:۔

جو کوئی چارپایہ کے ساتھ لیٹے گا وہ جان سے مارا جائیگا۔ (خروج باب ۲۲ آیتہ ۱۹)

اگر کوئی مرد کسی چوپایہ سے شہوانی لطف حاصل کرے گا وہ جان سے مارا جائیگا۔
اور وہ جانور بھی ہلاک کیا جائے گا۔ (Leviticus باب ۲۰ آیتہ ۱۵)

سیاحوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں قدیم باشندوں
کے اندر اسکا شوق موجود تھا۔ متمدن دنیا میں یہ شوق عموماً دیہاتیوں میں پایا جاتا ہے
جسکے اسباب حسب ذیل ہیں:۔ (۱) حیات انسانی کے متعلق قدیم خیالات جن میں

۲۳۵

انسان اور حیوان کے اندر کوئی تمیز نہیں ہوتی ۔ (۲) دیہاتیوں اور ان کے جانوروں کا ہر وقت ساتھ رہنا ۔ (۳) عورت کا میسر نہ آنا (۴) بعض قدیم روایات جنکا مطلب یہ ہے کہ اس سے بعض بیماریوں کو شفا ہوتی ہے ۔

بعض قدیم اور پست قوموں کا اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد بعض آدمی جانور اور بعض جانور آدمی بنجاتے ہیں ۔ لہذا انسان اور جانوروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے ۔ اسی لئے جانوروں سے استلذاذ کوئی ذلت اور شرم کی بات نہیں ہے ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جانور درحقیقت آدمی ہی ہوتے ہیں صرف "چولا" بدلا ہوا ہے ۔ مذہبی کھیلوں ، تماشوں ، اور لیلاؤں میں بعض جانوروں کا روپ غالباً اسی خیال سے اختیار کیا جاتا ہے ۔

مختلف ممالک میں مختلف زمانوں کے اندر مختلف جانوروں کا ذکر پایا جاتا ہے لیکن زیادہ تر انھیں جانوروں کا نام آتا ہے جو گھروں میں پالے جاتے ہیں ۔ مثلاً گائے ، گھوڑی ، بھینس ، بھیڑ ، بکری ، گدھی وغیرہ ۔ بعض حالات میں کتوں ، بلیوں ، خرگوشوں ، بطخوں اور راج ہنسوں کا بھی نام لیا جاتا ہے ۔ قدیم رومی عورتوں کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات اس کام کے لئے سانپ پالتی تھیں اسی سلسلہ میں ریچھوں ، بندروں حتی کہ مگرمچھوں کا نام بھی لیا جاتا ہے ۔

ڈاکٹر کوچر ( Koch ) کا بیان ہے کہ عرب میں بھیڑوں ، بکریوں اور گھوڑیوں سے استلذاذ کا رواج پایا جاتا ہے ۔ اور فرانسیسی ڈاکٹر موندیری ( Monderie ) کا بیان ہے کہ انام میں سؤر یا درکتوں سے کام لیا جاتا ہے اور جزیرہ سیلون کی سنگھالی قوم میں بکریوں اور گایوں سے ۔

اس سلسلہ میں مسٹر ہاورڈ، ڈاکٹر جی۔ ایف۔ لڈسٹن، ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ اور ڈاکٹر مول نے عجیب وغریب واقعات درج کئے ہیں جن کا ذکر کرنا اس جگہ ہم مناسب نہیں سمجھتے۔

دیہاتیوں میں استلذاذ بالوحوش کا شوق محض اس سبب سے نہیں ہے کہ ان کی طبیعت میں نفاست نہیں ہوتی یا انھیں عورتیں میسر نہیں آتیں۔ بلکہ سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ہر وقت جانوروں میں رہتے ہیں اور خود بھی رفتہ رفتہ حیوان بنجاتے ہیں۔

مرابو (Mirabeau) نے قوم باسق (Basque) کے پادریوں سے اٹھارھویں صدی میں معلوم کیا تھا کہ کوہستان پیرینیز (Pyrenees) کے تمام گڈریے اپنی بھیڑ بکریوں سے لذت اندوز ہوتے تھے۔ یہی حالت اطالیہ میں بھی ہے۔ جنوبی اطالیہ اور جزیرۂ صقلیہ (Sicily) کے چرواہوں، گڈریوں اور کسانوں کے یہاں تو یہ شغل ایک قومی رواج یا دستور بنگیا ہے۔ شمالی یوروپ میں بجائے بھیڑ بکری اور گائے وغیرہ کے ہرنی کام دیتی ہے۔

مانٹی گاذہ (Mantegazza) نے اپنی کتاب "Gli Amori degli Uomini" کے باب پنجم میں لکھا ہے کہ مقام ریمینی (Rimini) میں ان کی ملاقات کوہستان پرینیز کے ایک گڈریے سے ہوئی جو بری طرح ضعف اعصاب میں مبتلا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس تکلیف کا باعث صرف یہی شوق تھا۔

گشیٹ (Gutteiet) نے کتاب "Dreissig aller Parsis"

۲۳۷

کے صفحہ ۳۱۰ پر لکھا ہے کہ بعض روسی افسروں نے جو ۱۸۲۸ء کی جنگ روم و روس میں شریک تھے اپنے اس ذوق کا اعتراف کیا۔ پھر جس طرح بعض مردوں میں یہ ذوق پایا جاتا ہے اسی طرح بعض عورتیں بھی اس میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر بلاخ نے لکھا ہے کہ بعض قحبہ خانوں میں پیشہ ور عورتیں اس قسم کے تماشے لوگوں کو دکھاتی ہیں۔ ماسچکا (Maschka) نے بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے پیرس میں ایک عورت کو دیکھا تھا جو لوگوں سے فیس لیکر یہ تماشہ دکھایا کرتی تھی

ڈاکٹر روشہ (Rossa) نے واشنگٹن کی ایک ناکتخدا جوان عورت کا حال بیان کیا ہے جو اس شوق کی بدولت آخر کار مر گئی۔

انھی ڈاکٹر روشہ (Rossa) نے "ورجینا میڈیکل منتھلی" (Virginia Medical Monthly) بابتہ ماہ اکتوبر ۱۸۸۲ء کے صفحہ ۳۷۹ پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ یورپ میں ایک عورت اس طرح تماشہ دکھایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر کراوش (Krauss) نے لکھا ہے کہ ملک بوسنہ (Bosnia) کی عورتوں میں بھی اسکا رواج پایا جاتا ہے اور اگر وہ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتے تو انھیں ہرگز یقین نہ آتا۔

شکاگو کے ڈاکٹر کیرنان (Kenman) نے بھی اپنے ایک پرائیوٹ خط میں ڈاکٹر روشہ کے بیانات کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ "جو حالت ڈاکٹر روشہ نے سان فرانسسکو کی لکھی ہے وہ قریب قریب ہر بڑے شہر میں پائی

جاتی ہے۔"

مسوری (Masochism) واقع امریکہ میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان لڑکی علاج کے لئے آئی اور جب اسکے جسم کو پچکاری لگا کر دھویا گیا تو معلوم ہوا کہ اندر تین جگہ زخم ہیں جو اس شوق کی بدولت پیدا ہو گئے تھے۔

ملک برازیل میں دریائے امیزان کے قریب کیٹلناؤ (Catalao) سیاح نے ایک عورت کے دروازہ پر بہت بڑا بندر بندھا دیکھا۔ سیاح مذکور کو اسقدر پسند آیا کہ اس نے خرید لینا چاہا۔ چنانچہ اس کے متعلق سیاح نے ایک دوسری عورت سے جو وہاں موجود تھی بہت بڑی رقم کے بالعوض سودا کرنا چاہا۔ یہ سنکر وہ عورت ہنسی اور کہا کہ:۔ "آپ کی کوشش فضول ہے کیونکہ یہ بندر اس عورت کا "شوہر" ہے۔"

علاوہ ازیں بعض لوگوں میں استلذاذ کی عجیب و غریب عادتیں پڑ جاتی ہیں مثلاً بعض کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ جانوروں کی خوش فعلیوں اور مستیوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں حتی کہ استمنا بالید پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جنھیں جانوروں کا جسم چھیڑنے میں لطف آتا ہے۔ ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب "اروٹک سمبلزم" (Erotic Symbolism) میں اسی قسم کے چند واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ اسکو کسی پادری نے لکھکر بھیجا تھا جسکا خلاصہ یہ ہے:۔

"آئرلینڈ میں میرے والد کا مکان وہاں کے پادری کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں میری عمر بیس سال کی تھی اور میری طبیعت پر ہر وقت مذہب کا رعب غالب رہتا تھا۔ پادری کی دو بیٹیاں تھیں۔ اور دونوں لڑکیوں کی پرورش

نہایت سخت مذہبی فضا میں ہوئی تھی۔ دونوں مکانوں کے اصطبل ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ لیکن درمیان میں ایک دروازہ تھا جس میں تختے جڑ دیئے گئے تھے۔ ایک رات مجھے باغبانی کا ایک اوزار لانے کے لئے اصطبل میں جانے کی ضرورت پڑی۔ مین نے وہاں جاکر دیکھا کہ پادری صاحب کے اصطبل کا دروازہ کھلا اور درمیانی تختوں کی دراز سے روشنی نظر آئی۔ مین حیران ہوا کہ اسوقت اصطبل میں کون شخص آیا ہے۔ لہذا مین نے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ پادری صاحب کی ایک صاحبزادی گھوڑی کے جسم کو چھو رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی دہنی آستین چڑھائی اور کہنی تک اپنا ہاتھ آلودہ کرلیا۔ مین دیکھ رہا تھا کہ اس لڑکی کو اپنی اس عجیب وغریب حرکت سے بیحد لطف آرہا ہے۔ اور فرط لذت سے بار بار اپنے ہونٹ چباتی ہے۔ لڑکی کا یہ واقعہ دیکھکر مجھے بھی اس کا شوق پیدا ہوا اور مین نے بھی بارہا یہ عمل کیا۔"

ڈاکٹر نیک (Naëke) نے بھی "Psychiatrischen neurologisch bladen" ۲ مطبوعہ ۱۸۹۹ء میں ایسے ہی ایک شخص کا حال لکھا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر گلیرو (Guillereau) نے "journal de medicine veterinaire et de zoo technie" بابتہ ماہ جنوری ۱۸۹۹ء میں ایک لڑکے کا حال لکھا ہے جو یہی عمل گایوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

آبرے (Aubrey) نے لکھا ہے کہ سر فلپ سڈنی کی بہن کاؤنٹس پمبروک نے لذت اندوزی کا عجیب طریقہ نکالا تھا۔ یہ عورت حد درجہ کی شہوت پرست تھی۔ اور دریچہ میں بیٹھکر گھوڑوں کی مستی کا تماشہ دیکھا کرتی تھی۔

اسی طرح برچارڈ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ پوپ الگزینڈر ششم اور ان کی صاحبزادی لکریزیا (Lucrezia) دونوں اس قسم کے تماشے دیکھا کرتے تھے۔ بلٹروڈ اور مرسیر (Belltrud & Mercier) نے ایک مضمون بعنوان "Perversion de Instinct Genisique" مجلہ "صحت عامہ" (Annales d'Hygiene publique) بابتہ ماہ جون ۱۹۰۳ء میں ایک نوجوان شخص کا حال لکھا ہے جو گورکن تھا۔ یہ مرد وہ اس بات کا عادی تھا کہ جوان لڑکیوں اور عورتوں کی لاش نکال کر اُن سے آلودہ ہوتا تھا۔

استلذاذ بالوحوش کا فعل دنیا کی مہذب سوسائٹی میں ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا گیا۔ ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک میں اسکے لئے سزا مقرر رہی۔ بعض اوقات تو صرف سزائے جرمانہ دیکر مجرم کو چھوڑ دیا گیا اور بعض اوقات مجرم اور جانور دونوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ قرون وسطیٰ میں بھی یوروپ کے اندر یہ شوق بکثرت پایا جاتا تھا۔ جسکا ثبوت یہ ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی کے مسیحی مبلغین اور واعظین اپنے خطبات میں ہمیشہ اس فعل مکروہ کی برائیوں پر زور دیتے تھے۔ دین مسیحی کی کتاب الکفارہ میں اس کے لئے تعزیرات موجود ہیں۔

کتاب الکفارہ ایگبرٹ (Egbert's Penitentials) میں جو نویں و دسویں صدی کی چیز ہے۔ استلذاذ بالوحوش کے لئے دو سال سے لیکر دس سال تک کی سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔

اسی زمانہ کی ایک اور کتاب الکفارہ تھیوڈور میں ایسے لوگوں کے لئے دس برس کی سزا مقرر تھی۔

"پینی ٹینشل سوڈو رومانم" Penitentiale pseudo-Romanum) کی رو سے ایک سال کی سزا معقول خیال کی گئی تھی۔ اور اگر مرد ملزم کے بیوی نہ ہوتی تھی تو رحم کھا کر اسکی سزا نصف کردی جاتی تھی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اتنی ہی سزا کسی بیوہ عورت یا باکرہ سے ملتفت ہوتے پر دی جاتی تھی۔ گویا انکے نزدیک باکرہ بیوہ اور جانور ایک ہی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح فلبرٹ (Fullbert) کی کتاب الکفارہ میں استلذاذ بالوحوش کے لئے دس سال کی سزا مقرر تھی۔

قرون وسطی کے یوروپ خصوصًا فرانس میں اس کے لئے وہی سزا مقرر تھی جو توریت یعنی شریعت موسوی میں تجویز کی گئی تھی۔ یعنی دونوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا چنانچہ شہر طولوزد (Toulouse) میں ایک عورت اور کتا دونوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

علاوہ ازیں قرون وسطی میں جب پادری لوگ اپنے معتقدین سے ہفتہ کے روز اقرار معصیت لینے بیٹھتے تھے تو تمام یوروپ خصوصًا جنوبی اطالیہ، فرانس اور جرمنی میں کسانوں اور مویشی پالنے والوں سے یہ بات خصوصیت کے ساتھ دریافت کی جاتی تھی کہ وہ ... اس ہفتہ میں اپنی گائے، گھوڑی، بھیڑ، بکری، گدھی اور سور یا سے تو آلودہ نہیں ہوئے۔ کیتھولک ممالک میں یہ دستور آجتک چلا آتا ہے

۲۴۲

# استلذاذ بالنفس

(Auto-Erotism)

**استلذاذ بالنفس جانوروں میں** کہتے ہیں کہ استلذاذ بالنفس کا طریقہ بھی انسان نے جانوروں ہی سے سیکھا ہے۔ جانوروں میں خصوصاً بحالت اسیری جبکہ انھیں انتفار خواہش نفسانی کے لئے کوئی مادہ نہیں ملتی تو استلذاذ بالنفس کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔

ہیولاک ایلس نے اپنی کتاب "ماڈسٹی و آٹوار ٹوزم وغیرہ" (Modesty + auto-Erotism ETC) میں لکھا ہے کہ ملک ڈیز کے ٹٹو اس حالت میں اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سخت ہیجان کا اظہار کرتے ہیں مخصوص موسم میں بارہ سنگھے بھی مستی کے عالم میں اپنا بدن کسی چکنے درخت سے رگڑنے لگتے ہیں۔ اسی طرح بھیڑیں اور اونٹنیاں بھی اپنا بدن رگڑ رگڑ کر لذت حاصل کرتی ہیں۔ ہاتھی کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ مست ہوتا ہے تو اپنی پچھلی ٹانگیں سکوڑ کر اپنی بیتابی کا اظہار کرتا ہے۔ یہی مشاہدہ بلومنباخ (Blumenbach) کا ریچھ کے متعلق بھی ہے۔ اور پلاش و بارٹل نے بچوں کو بھی اسی عالم میں دیکھا ہے اور بندر خصوصیت کے ساتھ اس میں مبتلا پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سول (Moll) نے اپنی کتاب "Libido Sexualis"

میں لکھا ہے کہ بعض طوطے جب قفس میں بند ہوتے ہیں تو وہ اپنے جسم کا پچھلا حصہ کسی چیز سے رگڑ کر لذت حاصل کرتے ہیں۔

**استلذاذ بالنفس انسانوں میں** عالم انسانی میں اسکا شوق صرف مہذب و متمدن دنیا تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں یہ کسی نہ کسی صورت میں نہ پایا جاتا ہو اور اسکے لئے کوئی نہ کوئی اصطلاح مقرر نہ ہو۔

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں خصوصاً نیو ساوتھ ویلز کے رہنے والوں میں یہ شوق زیادہ پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر راتھ (Roth) کا بیان ہے کہ شمالی کوئنسلینڈ (North Queensland) اور دیگر علاقوں کے مرد جبکہ وہ گھر سے دور ہوتے ہیں ایسا کرنا معیوب نہیں جانتے۔

ڈاکٹر نارتھکوٹ کا بیان ہے کہ نیوزیلینڈ کی ماوری اور راروٹونگا (Maori-E-Rarotanga) اقوام میں یہ شوق نہیں ہے۔ بلکہ جزیرہ کوک (Cook Island) کے باشندے اور دیگر جزائر قرب وجوار کی قومیں اسکو "خلاف مردی" سمجھتی ہیں۔ اور ان لوگوں میں اسکے متعلق ایک طنزیہ جملہ بولا جاتا ہے۔ جسکا مطلب ہے کہ "مرد کا خود کو عورت بنا لینا"

افریقہ کی ہاٹنٹوٹ (Hottentot) نسل کی نامانا (Namana) قوم میں نوجوان عورتوں کے اندر یہ شوق اسقدر عام ہے کہ علانیہ اسکو پورا کرلیتی ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کی کہانیوں اور قدیم روایتوں میں اسکو اس طرح بیان کیا جاتا ہے گویا کہ وہ حوادث زندگی کی نہایت معمولی بات ہے۔ یہی حال قوم بسوتو اور کافر

، Baoulé & Kaffirs ) کا ہے۔

جب اہل ہسپانیہ جزائر فلیپائن کے مقام وزکایا ( Vizcaya ) میں پہنچے تو انھوں نے وہاں کے تمام مرد و زن میں عام طور پر اسکا رواج دیکھا۔

جزیرۂ بالی ( Bali ) کے متعلق جیکب سیاح نے لکھا ہے کہ اس جزیرہ میں یہ شوق عام ہے۔ ڈاکٹر ایرام ( Ermans ) کا بیان ہے کہ ممالک مشرق کی نوجوان عورتوں میں بھی اسکا شوق دیکھا گیا ہے۔ اور سب بیان ڈاکٹر سونینی ( Sonnini ) مصر میں تو یہ شوق فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔

ہندوستان قدیم میں بھی اسکے رواج کا پتہ یوں چلتا ہے کہ بعض عمارتوں کی دیواروں پر اُبھری ہوئی تصویریں بنی ہوئی ہیں جن میں عورتیں اور مرد اس شغل میں مصروف نظر آتے ہیں۔

جزیرۂ سیلان کی تامل قوم میں بھی یہ شوق بکثرت موجود ہے۔ اور ماچین میں یہ مشغل صرف شادی شدہ عورتیں کرتی ہیں۔

لیکن جاپان کی عورتوں نے اس فن کو بدرجۂ کمال پہونچا دیا ہے۔ یہ عورتیں پیتل کی باریک پاور کی دو خالی گیندیں بناتی ہیں۔ جو قد و قامت میں بقدر کبوتر کے برابر ہوتی ہیں۔ ایک گیند بالکل خالی رکھی جاتی ہے۔ اور دوسری گیند میں سیسہ کی گولی یا پارہ بھر کر اسکا منہ بند کر دیا جاتا ہے۔ پہلے وہ خالی گیند اندرون جسم تک پہونچا دی جاتی ہے۔ پھر پارہ والی گیند داخل کی جاتی ہے۔ اور اسکے بعد ڈاٹ لگا کر رانوں کو حرکت دیجاتی ہے۔ ان دونوں گیندوں کا نام جاپانی اصطلاح میں "رین۔نو۔تاما" ( Rin-no-tama ) ہے۔ ڈاکٹر جوسٹ

( goost ) کا بیان ہے کہ اگرچہ جاپان کی تمام عورتیں اس آلہ سے آگاہ ہیں لیکن پیشہ ور عورتوں میں خصوصیت کے ساتھ اسکا رواج زیادہ ہے۔ جاپان کی عورتیں ایک اور مصنوعی آلہ بھی استعمال کرتی ہیں۔ جسے ان کی اصطلاح میں "اینگی" ( Engi ) کہتے ہیں۔

## استلذاذ بالنفس کی قدیم تاریخ

بابل و آشوریہ کے قدیم خرابوں میں جو سنگین محلات و مناور و معابد برآمد ہوئے ہیں۔ ان پر صبورہ کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متمدن دنیا میں اس کا شوق تقریباً پانچ چھ ہزار برس قبل مسیح سے موجود تھا۔

ان مذہبی کتب میں جو الہامی ہونے کی دعویدار ہیں صبورہ کی طرف صحیفۂ خرقی ایل میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ( ملاحظہ ہو صحیفۂ مذکور باب ۱۶۔ آیتہ ۱۷ )

نیز تو نے وہ زیور جو میرے دیئے ہوئے سونے اور چاندی کے بنے ہوئے تھے لے لئے۔

اور تو اس سے مردوں کے بت بناتی ہے اور ان سے مباشرت کرتی ہے۔

برٹش میوزیم میں ایک قدیم یونانی گلدان موجود ہے۔ جس پر ایک قدیم یونانی کسی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ عورت اپنے ہاتھ میں صبورہ لئے بیٹھی ہے۔ اسی قسم کا ایک دوسرا قدیمی گلدان ہے جو شہر پومپیائی کے کھنڈروں سے برآمد ہوا تھا۔ یہ گلدان شہر نیپلز کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

یوروپ کے اندر قرون وسطی میں یہ شغل عام موجود تھا۔ کیونکہ پادری لوگ اسکے خلاف مسلسل وعظ کہا کرتے تھے۔ اور پندرھویں صدی میں تو صبورہ کا ذکر کھلم کھلا اور پوری تفصیل کیساتھ ہونے لگا تھا۔ سولھویں صدی میں مشہور ناول

نولیس فورٹینی ( Fortini ) نے بھی اپنی کتاب "Nevelle deie Novunz " میں ـــــ" اس آلہ بلوریں" کا ذکر کیا ہے جسکا استعمال زنان کلیسہ کیا کرتی تھیں۔

انگلستان میں بعہد ملکہ ایلزبیتھ بھی مصنوعی آلات سے کام لیا جاتا تھا چنانچہ مارسٹن نے ( Marston ) نے ہجو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کس طرح "لیوسیا ( Lucea ) اپنے شوہر کے نرم و گرم بستر پر ایک آلہ بلوریں کو ترجیح دیتی تھی"۔

اس مصنوعی آلہ کو ہندوستان میں صبورہ کہتے ہیں۔ قدیم یونانی عورتوں میں اسکا نام اولیسبوس ( Olisbos ) تھا۔ لاطینی زبان میں اسکا نام "فلس" ( phallus ) یا فیسینم ( Fascinum ) ہے۔

فرانسیسی زبان میں اسے گادمیشہ ( Godemiche ) ہے اور جرمنی میں سمتھانسے ( Samtheanse ) اطالوی زبان میں اسکا نام پاسا ٹیمپو اور ڈیلیٹو ( passatempo & Diletto ) کہتے ہیں۔ موخرالذکر سے انگریزی اصطلاح ڈلڈو ( Dildo ) نکلی ہے۔ مردوں کے لئے جو مصنوعی چیز بنائی جاتی ہے اسے انگریزی اصطلاح میں مرکن ( Merkin ) کہتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں بقول ڈوہرین ( Dühren ) جرمنی کی امرازادیوں میں اسکا خاص شوق پایا جاتا تھا اور اسی زمانہ میں انگلستان کے اندر بھی ڈلڈو ( Dildo ) کا استعمال عام ہو گیا تھا۔ آرخنہولز ( Archenholtz ) کا بیان ہے کہ اگرچہ اس زمانہ میں پیرس کے اندر مصنوعی آلا ــــ

کی فروخت مخفی طور پر ہوتی تھی لیکن لندن میں ایک عورت مسز فلپس اپنی دوکان میں جو بمقام چوک لیسٹر واقع تھی ان کی تجارت کھلم کھلا بہت وسیع پیمانہ پر کیا کرتی تھی۔ ۱۷۳۵ء میں جان بی (John Bee) نے لکھا ہے کہ انگریزی میں اسکا نام اول اول "دلدول" تھا۔

اٹھارھویں صدی میں فرانس میں ایک بہت بڑی آبرو باختہ عورت مادام گوردان (Gourdan) تھی جو ان آلات کی وسیع پیمانہ پر تجارت کرتی تھی۔ ان دنوں فرانسیسی زبان میں اسکو "کنسولیٹر" (Consolateur) یعنی "تسکین دینے والا" کہتے تھے۔ ہندوستان میں غالباً اسی فرانسیسی "کنسولیٹر" کا ترجمہ "صبورہ" کیا ہے۔ ڈاکٹر وہرین (Buhren) نے اسی مادام گوردان کی نسبت تحریر کیا ہے کہ جب یہ عورت مرگئی تو خانقاہوں کی راہبہ عورتوں اور کلیسہ کی کنواریوں کے بیشمار خطوط اسکے مکان سے برآمد ہوئے جنہیں انھوں نے "صبورے" طلب کئے تھے۔

مسیحی دنیا کی طرح ممالک اسلامیہ میں بھی اسکا استعمال پایا جاتا ہے اور ترکی عورتیں اسکا استعمال کرتی ہیں۔ ڈاکٹر ہامن (Baumann) کا قول ہے کہ زنجبار کی حرم سراؤں میں پردہ نشین عورتیں اسکا استعمال بکثرت کرتی ہیں۔

ڈاکٹر بی۔ اسٹرن (B. Stern) نے اپنی کتاب "Zur Medizin der Türken" میں لکھا ہے کہ ٹرکی اور مصر کی عورتیں بعض اوقات کیلے اور کھیرے بھی استعمال کرتی ہیں۔ عہد عباسیہ کے تمدن و تہذیب کے متعلق

الف لیلہ سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس میں "نو اور فرنگی" کا ایک قصہ ہے جسکے اندر ایک نظم بھی ہے جسکا مفہوم یہ ہے کہ: "او کیلے! ملائم اور چکنی جلد والے کیلے!! جسے دیکھکر جوان عورتوں کی آنکھیں پھیل جاتی ہیں ..... اے کیلے! تمام پھلوں میں تو ہی ایک ایسا پھل ہے جسکا دل نرم اور ہمدرد ہے۔ اے کیلے! تو ہی بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو تسکین دیتا ہے"

اسی طرح جزائر ہوائی ( Hawaii ) کے علم الاصنام میں بعض روائتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دیویوں نے کیلے سے کام لیا۔ صرف کیلے ہی پر منحصر نہیں بلکہ کھیروں، گاجروں، بیگنوں، مولیوں سے بھی کام نکالا گیا ہے اور بعض نے پنسلیں، مہر لگانے کی لاکھ کی تہی، سوت کی ریل، بالوں کی سلائیاں، بُننے کی سلائیاں، بوتلوں کی ڈانٹیں، موم بتیاں وغیرہ بھی استعمال کی ہیں۔

ڈاکٹر میرابو ( Mira beau ) نے اپنی کتاب "اروٹیکا بیلون" ( Erotika biblon ) میں ان چیزوں کی بہت بڑی فہرست دی ہے جنھیں کلیسہ کی "اچھوتیاں" استعمال کیا کرتی تھیں۔

سوئزرلینڈ کے پروفیسر ریورڈین ( Reverdin ) نے چار عورتوں کا حال بیان کیا ہے جنھوں نے اسکا اقرار کیا۔ ان میں ایک عورت جسکی عمر ۲۲ سال تھی ایک مدرس کی بیوی تھی، اس عورت نے بلا پس و پیش اور بغیر شرم و لحاظ کے اپنے شوہر کے بالمواجہہ اقرار کیا کہ وہ بالوں میں لگانے کی سلائی سے مادنا لطف حاصل کر لیتی تھی۔ دوسری عورت ۴۲ سال کی ایک مجرد عورت تھی جو ایک

ڈاکٹر کے یہاں ملازم تھی۔ اسکا بھی مشغلہ یہی تھا۔ تیسری عورت ایک سترہ سالہ انگریز لڑکی تھی اور چوتھی ایک دوازدہ سالہ لڑکی جس نے اسکا اعتراف کیا۔

بعض عورتوں کو اس کی ایسی بری عادت پڑ جاتی ہے کہ بغیر اسکے انھیں تسکین ہی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مول ( Moll ) نے ایک ۲۸ سالہ مصورہ کا حال بیان کیا ہے۔ کہ باوجود صاحب شوہر ہونے کے وہ اسکی عادی تھی۔

اسی طرح ڈاکٹر ہاورڈ ( Howard ) نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک عورت کا حال لکھا ہے جو نہایت ہی بے اختیارانہ طور پر اس عمل کو جاری رکھتی تھی۔

بعض اوقات بچوں میں ہیجان شہوانی پیدا کرنیکی عجیب عادت ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ کرسی کے کنارہ یا کسی اور فرنیچر سے سحق کرکے لطف حاصل کرتی ہیں۔ ڈاکٹر آر۔ ٹی۔ ماریس ( Morris ) ساکن نیویارک کا بیان ہے کہ "میری ایک مریضہ خیالات کے لحاظ سے نہایت مذہبی واقع ہوئی ہے۔ اسے گرجا جانے کا بہت شوق ہے۔ لیکن باینہمہ وہ ہر روز صبح کو یہ فعل کرتی ہے۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر"

ڈاکٹر گنسبیٹ ( Ginsbert ) نے روس کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں کی اکثر عورتیں اپنے پیراہن کے اگلے دامن میں گرہ باندھ لیتی ہیں اور اسی سے لطف حاصل کرتی ہیں۔ افسی ڈاکٹر صاحب نے ایک روسی عورت کی نسبت لکھا ہے کہ وہ اپنے پاؤں کی ایڑی برہنہ کرکے اس پر بیٹھ جاتی ہے۔

بعض لڑکیاں چکر کے جھولے میں گھوڑے کے گھوڑوں پر اس شوق کی وجہ سے

۲۵۰

سوار ہوتی ہیں۔ اور بعض کو سائیکل کی سواری بھی یہی لطف دیتی ہے۔

ایک فرانسیسی ڈاکٹر پوئلے (Pouillet) لکھتے ہیں کہ "میں ایکمرتبہ ایک فوجی درزی خانہ میں گیا جہاں تقریباً تیس مشینیں چل رہی تھیں۔ جنکی آواز تقریباً یکساں تھی۔ لیکن اسی اثنا میں دفعتاً میری توجہ ایک مشین کی طرف ہوئی جو بمقابلہ دیگر مشینوں کے زیادہ تیزی سے چل رہی تھی۔ مشین پر کام کرنیوالی سنہرے بالوں والی ایک سُرخ و سفید لڑکی تھی جسکی عمر تقریباً اٹھارہ یا بیس برس کی ہوگی۔ عین اسی حالت میں جبکہ وہ مشین پر پتلون سی رہی تھی، اچانک اسکا چہرہ دمکنے لگا۔ منہ کا دہانہ کسیقدر کھل گیا۔ ناک کے نتھنے پھول گئے۔ اور اسکے پاؤں مشین کے پائدان پر تیزی سے چلنے لگے۔ عین اسی حالت میں میں نے اسکی آنکھوں میں کسیقدر تشنج دیکھا۔ اسکی پلکیں جھک گئیں۔ چہرہ اسقدر زرد ہوگیا گویا مردنی چھاگئی ہے۔ اور پیچھے کی طرف کرسی کے تکیہ کا سہارا لیکر لیٹ گئی۔ اسکے ہاتھوں اور پاؤں نے اپنا کام چھوڑ دیا۔ اس نے انگڑائی لیکر ٹانگیں پھیلالیں گلے سے خفیف سا خروش اور پھر ایک آہ سرد برآمد ہوئی جو گرد و نواح کے شور و غل میں محو ہوگئی۔ چند منٹ تک وہ لڑکی بیحس و حرکت رہی۔ پھر اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا۔ چہرہ کا پسینہ پونچھا اور پھر اپنے ساتھ کام کرنے والیوں کی طرف کسیقدر شرمائی اور لجائی ہوئی آنکھ ڈالکر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

ڈاکٹر ویڈلر (Vedler) جنھیں ممالک سویڈن اور ناروے کا بہت بڑا تجربہ ہے بیان کرتے ہیں کہ یہاں کی عورتیں دونوں رانوں کی رگڑ سے پوری کیفیت حاصل کرلیتی ہیں۔

ہیولاک ایلس ایک مرتبہ کا ذکر کرتے ہیں کہ "ایک روز میں کسی اسٹیشن پر ٹرین کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک دور کی نشست پر جو بالکل تنہائی میں تھی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ نشست کے سہارے لیٹی ہوئی تھی اور اسکا ایک پاؤں جلد جلد اور مسلسل طور پر ہل رہا تھا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک مسلسل یہی حرکت کرتی رہی۔ رفتہ رفتہ اسکی اس حرکت میں شدت پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا بدن کسیقدر اور سیدھا کیا۔ اور ٹانگیں کسیقدر اکڑا کر اپنا جسم تپائی کے سرے سے ملا لیا۔ بعد ازاں دو تین جھٹکے کھائے اور ڈھیلی پڑ گئی۔ چند منٹ بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور خراماں خراماں ڈینگ روم میں جا کر دیگر مسافروں کے پاس جا بیٹھی۔ اسوقت اسکا چہرہ اترا ہوا تھا۔"

الغرض اسکا شوق متمدن دنیا میں آجکل اسقدر پھیلا ہوا ہے کہ غالباً کوئی متنفس اس سے خالی نہ رہا ہوگا۔ جرمنی کے مشہور ڈاکٹر برجر (Berger) نے اپنی کتاب "ورے سنجن" (Vorlesungen) میں تحریر کیا ہے کہ کہ فی زمانہ ۹۹ فیصدی نوجوان مرد اور لڑکیاں وقتاً فوقتاً استلذاذ بالنفس کر لیا کرتے ہیں۔ ہرمان کوہن (Hermann Cohen) کا قول ہے کہ اس قول کا ملک جرمنی پر بالکل صحیح اطلاق ہوتا ہے۔ روہلیڈر (Rohleder) کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ۹۵ فیصدی ہے۔ اور جولین مارکیوز کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ۹۲ فیصدی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ڈیوکس (Duchs) کا قول ہے کہ اسکول کے لڑکوں میں ۹۵ فیصدی تعداد ایسے ہی لڑکوں کی ہے۔

ڈاکٹر مورینگیا (Morenga) نے اٹالیہ میں دو سو ادنیٰ طبقہ کی

عورتوں کی تحقیقات کی۔ ان میں سے ۱۲۰ عورتوں نے اقرار کیا کہ وہ ایسا کرتی ہیں یا کسی زمانہ میں ایسا کر چکی ہیں۔

ڈاکٹر ارنسٹ (Ernest) کا قول ہے کہ ملک وینی زولا (Venezuela) کی ہسپانوی نژاد دوغلی آبادی میں ہر طبقہ کے لڑکے اور لڑکیاں اسکی عادی ہیں۔

فرانس میں ایک پادری صاحب نے ڈاکٹر ڈبرین (Dubreyen) کو بتایا کہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جو ہفتہ بھر بعد اقرار معصیت کرنے آتی ہیں ان میں منجملہ بارہ لڑکیوں کے گیارہ ایسی ہوتی ہیں جنھیں اسکا شوق ہے۔

پروشیا میں ایک تادیب خانہ کے میڈیکل افسر نے روہلیڈر (Rebhelder) سے بیان کیا کہ یہاں کے تمام لوگ جو سن بلوغ تک پہونچ گئے ہیں اس علت میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح اسٹینلی ہال کا بیان ہے کہ امریکہ کے ایک تادیب خانہ میں ہر شخص بلا استثناء اسکا عادی ہے۔

**استلذاذ بالادویہ** ڈاکٹر ریورڈین (Reverdin) کا بیان ہے کہ ملک فرانس کے اضلاع آئین و کوٹ دا اور (Ain-e-Côte d'or) میں یہ بات غیر معمولی نہیں ہے کہ نوجوان لڑکیاں اپنے جسم میں ایک بوٹی کے پتے مل لیتی ہیں جسے علمی زبان میں "لنیاریہ سمبالیریا" (Linaria Cymbalaria) اور عام طور پر "پنٹین" (Pintou) یا "ٹمبارڈے" (Timbarde) کہتے ہیں۔ اس سے ہلکی سی سوزش پیدا ہو کر لطف پیدا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ذوہرین (Dühren) نے اپنی کتاب "Geschichte in England" جلد دوم صفحہ ۳۹۲ پر انگلستان کی عورتوں کی نسبت لکھا ہے کہ نوجوان لڑکیاں اکثر بچھو بوٹی کی پتی مل لیتی ہیں جس سے خفیف سی سوزش پیدا ہو جاتی ہے اور مجبوراً سوزش رفع کرنے کے لئے اس جگہ کو ملنا پڑتا ہے۔

ممالک مشرق خصوصاً ایران و ہندوستان میں اس غرض کے لئے عطر گلاب اور عاقر قرحہ وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے۔ اس سے ایک قسم کی خفیف سوزش پیدا ہو کر تحریک ہوتی ہے اور لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بعض عورتیں صبورہ پر سہاگا اور شہد کا ضماد کر لیتی ہیں۔

**استلذاذ بالخیال** بعض لوگ کسی قسم کے مصنوعی آلہ سے کام نہیں لیتے۔ نہ وہ اپنے اعضاء کو کسی قسم کی رگڑ یا سوزش پہونچاتے ہیں۔ بلکہ وہ عالم تصور میں خیالی طور پر پورا لطف حاصل کر لیتے ہیں۔

نائسفورو (Nicefors) نے ایک اطالوی لڑکی کا حال بیان کیا ہے جسکی عمر ۱۴ سال کی تھی اور جو ایک کارخانہ میں کام کیا کرتی تھی۔ اس چھوٹی سی لڑکی کو استلذاذ بالخیال میں اسقدر کمال حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کارخانہ کے اندر اور سب لوگوں کے سامنے دن بھر میں تین چار مرتبہ اس طرح لطف حاصل کر لیا کرتی تھی

شرنگ نوٹزنگ (Schrenk Notzing) نے ایک عورت کا حال بیان کیا ہے کہ وہ اچھا کانا سنکر یا کوئی مرد دیکھکر حد درجہ بیتاب ہو جاتی تھی۔ اسی طرح ایک اور عورت تھی جو خوبصورت مناظر دیکھتے ہی ختم ہو جاتی تھی اسکی شہادت ہندوستان میں بھی اب سے کئی ہزار سال پیشتر ہندوؤں کی

۲۵۴

مشہور و معروف رزمیہ نظم مہابھارت کے آدیرب میں ملتی ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ ایک روز اپریچر نامی راجہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا۔ وہاں اسے اپنی بیوی کی یاد میں ابال ہو گیا۔ اس نے وہ خارج شدہ نطفہ کسی درخت کے پتہ میں دونا بنا کر رکھا اور ایک شکاری پرند کی معرفت اپنی رانی کے پاس روانہ کر دیا۔

اتنا راہ میں اسکو دوسرا شکاری پرندہ ملا اور اس نے وہ دونا چھیننا چاہا۔ اسی چھینا جھپٹی میں وہ دونا دریائے جمن میں گر پڑا۔ پانی میں ایک اپسرا (بہشتی حور) جو کسی رشی کی بد دعا سے مچھلی بنگئی تھی تیر رہی تھی۔ اس نے فوراً اس کو نگل لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاملہ ہو گئی۔ حمل کی مدت پوری ہونیکے وقت اس مچھلی کو ایک ماہی گیر نے پکڑ لیا۔ پیٹ چاک کیا تو ایک لڑکا اور ایک لڑکی توام برآمد ہوئے۔ ماہیگر نے وہ بچے راجہ کو دیدیا اور لڑکی خود پالی جسکا نام مچھودری رکھا۔ یہی لڑکی ویدیاس جی کی ماں اور کوروں پانڈوؤں کی دادی تھی۔

یوروپ کے اندر بھی سترھویں صدی میں عورتوں کے اندر اسکا شغل موجود تھا۔ چنانچہ سخوریگ (Schurig) نے بحوالہ ریولان (Riolan) لکھا ہے کہ بعض عورتیں اسقدر مغلوب النفس ہوتی ہیں کہ اگر انھیں کوئی حسین شخص نظر آجاتا ہے تو صرف اسکو دیکھکر یا باتیں کرکے انتہائی لطف حاصل کرلیتی ہیں۔

جان پیکٹ (John Paget) نے اپنی کتاب "قانونی معمے" میں ایک شادی شدہ عورت کا حال لکھا ہے جو اپنے ڈاکٹر پر عاشق ہو گئی تھی۔ اور عالم خیال میں اپنے معشوق سے اس طرح باتیں کیا کرتی تھی کہ "تین موٹی موٹی گنگائیں بنگئی تھیں۔ ڈاکٹر بیچارے کو اس خیالی عشق کا حال قطعی معلوم نہ تھا۔ لیکن جب اسکے

شوہر کو یہ حال معلوم ہوا تو اسقدر جھگڑا بڑھا کہ طلاق تک نوبت پہونچی۔

**استلذاذ بالنفس کے اسباب و علل**

خواہشات نفسانی انسان کے اندر فطرتاً پیدا ہوتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ بچے عالم شیر خوارگی میں بھی جب ان کے اندر کسی قسم کا مادۂ شہوانی موجود نہیں ہوتا، وہ اپنے عضو جنسی کو اکثر مسلتے رہتے ہیں۔ اس سے انھیں ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ یہی عادت بعد میں استلذاذ بالنفس کی محرک ہوتی ہے۔ (۲) بعض دایہ اور انا بچوں کو سلاتے وقت ان کے بدن کو ملائم ہاتھوں سے سہلاتی ہیں جس سے انھیں ایک قسم کی لذت حاصل ہو کر نیند آجاتی ہے۔ اور یہی عادت بعد میں اس عادت کی محرک ہوتی ہے۔ (۳) مجلسی لحاظ سے انسان نے فعل مباشرت کو ایک قابل شرم اور ناپاک فعل قرار دیا ہے جسکے لئے رازداری اور خلوت کی ضرورت ہے۔ اسلئے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے جب وہ مغلوب خواہش ہوتی ہیں۔ اسطرح کام نکالنے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔ (۴) بعض لوگ مذہبی یا اقتصادی وجوہ کی بنا پر نہ شادی کرتے ہیں نہ حرامکاری اسلئے وہ اس گناہ تنہائی کے ذریعہ سے اپنی خواہشات پوری کر لیتے ہیں۔ (۵) بدکار عورتوں اور مردوں سے التفات کرنے میں آتشک و سوزاک وغیرہ کی بیماری کا خطرہ ہوتا ہے لیکن استلذاذ بالنفس میں اس کا کوئی احتمال نہیں۔ (۶) انسان کسی سے محبت کرنے لگتا ہے اور اُس تک رسائی نہیں ہوتی تو وہ عالم خیال میں ہی اس سے لطف حاصل کر لیتا ہے۔

**یہ مشغلہ عورتوں میں کیوں زیادہ ہے**

اگرچہ دنیا بھر میں اسکا شوق عورتوں اور مردوں دونوں میں پایا جاتا ہے

لیکن تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ شوق بمقابلہ مردوں کے عورتوں میں زیادہ ہے۔ جسکے اسباب حسب ذیل ہیں:۔ (۱) مردوں کی تعداد میں کمی۔ جنگ یا وبا کی وجہ سے یہ حالت اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ ممالک یورپ میں جنگ عظیم کے بعد ہوئی (۲) عورتوں میں بمقابلہ مردوں کے شرم وحیا زیادہ ہوتی ہے۔ اسلئے وہ حرامکاری کے بجائے گناہ تنہائی کی طرف رجوع کرتی ہیں (۳) جوان مرد وعورت یا جوان مردوں کا ایک ساتھ سونا سوسائٹی میں معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ اسلئے عورتوں کے لئے استلذاذ بالنفس میں زیادہ آسانی ہے (۴) بعض اقوام میں دوبارہ شادی کرنا معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ اسلئے تقاضائے فطرت پورا کرنے کے لئے عورتیں اس مشغلہ کی طرف مائل ہو جاتی ہیں (۵) مرد جلد کمزور ہو جاتا ہے اور اسکی خواہش عرصہ تک قائم نہیں رہتی برخلاف عورت کے کہ اسکی خواہش عرصہ تک قائم رہتی ہے اور اسلئے وہ اس طرح کام نکال لیتی ہے۔ (۶) اکثر عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی تسکین فطری طور پر بہ آسانی نہیں ہو سکتی، اسلئے وہ خود اسکا علاج کرنا چاہتی ہیں۔ (۷) چونکہ عورتوں کو حاملہ ہونے کا خوف رہتا ہے اسلئے یہ مشغلہ ان کو بہت محفوظ نظر آتا ہے (۸) عورت کو ایام سے فارغ ہونے کے بعد ہی مرد کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اسوقت مرد میسر نہ آئے تو وہ استلذاذ بالنفس کی طرف رجوع کرتی ہے۔ (۹) مرد کے اندر آلۂ خواہش صرف ایک ہے۔ لیکن عورت کے اندر بہت سے اعضاء ایسے ہیں جن میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ (۱۰) فی زمانا اقتصادی امور کی بنا پر مردوں کو کام میں اسقدر منہمک رہنا پڑتا ہے کہ وہ عورتوں کی طرف پوری توجہ نہیں کر سکتے۔ اسلئے عورتیں استلذاذ بالنفس سے اپنا شوق پورا کر لیتی ہیں۔

(۱۱) بعض عورتوں کو ہسٹیریا وغیرہ ایسی بیماریاں ہوتی ہیں کہ ان کی طبیعت اس کی طرف خود بخود مائل ہو جاتی ہے۔ (۱۲) بعض عورتیں جو اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہیں خاطرخواہ شوہر نہ ملنے سے اس کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ (۱۳) بعض عورتوں کو اپنے حسن و جمال کا اسقدر غرہ ہوتا ہے کہ وہ مرد سے بات کرنا اپنی ذلت سمجھتی ہیں۔ لیکن تقاضائے فطرت استلذاذ بالنفس پر انھیں مجبور کرتا ہے

## استلذاذ بالنفس کے نقصانات

قوانین فطرت کے خلاف جو حرکت کی جائیگی اس کے نقصانات جسمانی یا دماغی طور پر ضرور ظاہر ہونگے۔ چنانچہ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے استلذاذ بالمثل یا استلذاذ بالنفس کے جو نقصانات لکھے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہم ذیل میں ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے استلذاذ بالنفس کے نقصانات کے متعلق ڈاکٹروں کی رائیں ظاہر ہوتی ہیں:—

| نام ڈاکٹر | | نقصانات |
|---|---|---|
| اسپائٹزکا | Spitzka | دیوانگی۔ صرع۔ مختلف عوارض چشم شقیقہ دوران سر |
| سیوچ | Savage | کھوپڑی میں عجیب قسم کی تکلیف |
| اینٹی جے چیپین | Anti J. Chapman | مختلف اقسام کے درد |
| چیپین | Chapman | گدی کی جلد کا کمزور ہو جانا |
| لاکاشیئنا | Lacassagne | پٹھوں کا ڈھیلا پڑ جانا |
| وسینڈوسکی | Wisniewski | پستانوں کا غائب ہو جانا |

| نام ڈاکٹر | نقصانات |
|---|---|
| پیئر Peyer | دمہ |
| سیرلے Seerly | اختلاج قلب |
| بارادوق Baraduc | زخموں پر چھالا پڑ جانا |
| کلپسن Clipson | مہاسے اور پھوڑے پھنسیاں |
| اسکین ۔ لوئس ۔ موریگلیا Skene - Lewis Moragha | آنکھوں کی پتلیوں کا پھیل جانا |
| پوئلے Pouilet | آنکھوں کا اوپر چڑھ جانا یا ترچھا ہو جانا |
| بونیر Bonnier | آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ۔ گاہے گاہے |
| | ثقل سماعت |
| جے چیپمن J. Chapman | تکلیف کے ساتھ حیض ہونا |
| ونکل پوئلے Winckel Pouilet | سیلان الرحم |
| جبیٹ Gisard - | خصیتین میں تکلیف ہونا |
| لوئس ۔ موریگلیا Louis Moraglia | زرد رنگ یا چہرے کی بے رونقی |
| گرونر Gruner | ناک کا سرخ ہو جانا |
| جول میکنزی Joal Mackenzie | نکسیر پھوٹنا |
| گوورس Gowers | خراش گلو بوقت بلوغ |
| فلائس Fliess | ناک میں مختلف بیماریاں پیدا ہونا |
| شوفیلٹ Shufellet | انزال نہانی میں خرابی کیفیت |
| گریانڈو [illegible] | ضعف مثانہ |

۲۵۹

| نقصانات | نام ڈاکٹر |
|---|---|
| عورتوں کے ہاتھوں پر مسّے ہو جانا | دور۔ کچار۔ خان اوئی Dur Krichmar Oye |
| توہم سامعہ و شامّہ | گریسنجر۔ لوئس Griesinger Louis |
| قارورہ کا غلیظ ہو جانا | ہرٹر Herter |
| عورتوں کے جسم سے بو کا پیدا ہونا | اسکین Skene |

۲۶۰

# فحاشی عہدِ قدیم میں

**قدیم یونان** یورپ میں باقاعدہ فحاشی کی ابتدا مشہور یونانی مقنن حکیم سولن (Solon) کے زمانہ سے قرار دیتے ہیں۔ یہ شخص بڑا مصلح تھا اور فحاشی کے اڈے اور چکلے جو اس نے قائم کئے تھے ان سے اسکی غرض اشتراک فی النفسواں کے رواج کو قائم کرنا تھا نہ کہ بڑھانا۔ سولن کے قانون کے مطابق ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ اگر وہ کسی شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ ملوث دیکھے تو اسے قتل کروا دے لیکن اگر ناکتخدا عورت سے کوئی شخص بالجبر ملوث ہوتا تھا تو اسے سزائے جرمانہ دیجاتی تھی جسکی مقدار ۱۰۰ بھیڑوں کی قیمت ہوتی تھی۔ اور اگر کوئی شخص پیشہ ور عورت کے علاوہ کسی ناکتخدا عورت کو اغوا کرتا تھا تو اسے کم جرمانہ کی سزا ہوتی تھی۔ یعنی صرف بیس بھیڑوں کی قیمت حکیم سولن نے لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو فروخت نہ کریں جبتک وہ صاحب عصمت ہیں۔

اسکے مرتب کردہ قوانین نے بہت سی باتوں کو جو اسی قبیل سے تھیں باقاعدہ کر دیا تھا۔ ایک قانون یہ تھا کہ اگر کسی صاحب جائداد عورت کا شوہر ہیجکارہ ثابت ہو تو وہ اپنے کسی رشتہ دار کو پسند کرے تاکہ اس سے کوئی وارث مال پیدا ہو سکے۔ صاحب مال و جائداد عورت کے خاوند کو مہینہ میں کم از کم تین مرتبہ تعلق جنسی کرنا پڑتا تھا۔

بعض قوانین حکیم سولن کے ایسے ہیں جو غالباً آجکل کے شوہروں کو بھی پسند آئیں۔

مثلاً کسی عورت کو اجازت نہ تھی کہ وہ تین جوڑے سے زیادہ کپڑے لیکر سفر کرے۔ وہ رات کے وقت سفر نہیں کر سکتی تھی اگر کرتی تھی تو ایک بند گاڑی میں جس کے آگے آگے روشنی لیکر چلنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے کہنے سننے سے اپنی وصیت میں بعض خاص شرائط لکھدیتا تھا تو انھیں ناجائز قرار دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر ایوان بلاخ نے حکیم سولن کی نسبت لکھا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے غلط منطق سے کام لیکر آئین و قوانین حکومت کی تائید و حمایت کی۔ جو لوگ اسبات کے حامی ہیں کہ چکلوں کو موقوف کیا جائے ان کی نظروں میں سولن کی یہ دلیل غلط ہے کہ اگر بدکاری کو قانوناً جائز قرار دیدیا جائے تو اس سے گھروں کی حرمت و عزت قائم رہتی ہے۔ اور شہریوں کی بیوں اور بیٹیوں کی عصمت محفوظ رہتی ہے۔ آجکل بھی بعض پابند قانون عورتوں اور مردوں کا یہ خیال ہے کہ "چکلوں" کی جو تائید و حمایت کی جاتی ہے وہ سولن کی اسی دلیل کی بنیاد پر ہے۔

قدیم یونانیوں میں ..... حکومت ابویت (Patriarchate) بہت زیادہ رائج تھی اور جس شخص نے حکیم افلاطون کی کتاب "جمہوریت" یا حکیم ارسطو کی ... سیاسی و اخلاقی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اس پر یہ بات بالکل روشن ہو گئی ہو گی کہ گھر کے بعض معاملات چلانے کے لئے جو تدبیر سولن نے تجویز کی تھی اس میں کوئی جدید بات نہ تھی۔ سولن ہرگز عورتوں کا طرفدار نہیں تھا۔ اس نے اخلاقیات جنسی کا معیار بلا چون و چرا تسلیم کر لیا تھا۔ اسکا مرتب کردہ تمام نظام بیوی کو اپنے شوہر سے وابستہ رکھتا تھا۔ اور اس نے مردوں کو ارتباط و اختلاط کی کامل آزادی دے رکھی تھی تاوقتیکہ وہ کسی دوسرے شہری کی بیوی یا بیٹی سے کوئی معاملہ نہ رکھیں۔

نظام سولن کے ماتحت کسبیوں کا طبقہ رضاکار عورتوں سے نہیں بھرتی کیا جاتا تھا۔ بلکہ اس میں لونڈیاں اور کنیزیں داخل تھیں جو زیادہ تر غیر ملکی ہوتی تھیں ان کسبیوں کے چکلوں کے مصارف منجانب ریاست ادا کئے جاتے تھے اور بقول مورخ نکاندر (Nicander) جو آمدنی سولن کو ان چکلوں سے حاصل ہوتی تھی وہ آفرودیتہ پانڈیموس کے مندر میں پجاریوں کو دیدی جاتی تھی۔ غالباً سولن یہ سمجھتا ہوگا کہ بدکاری اب بھی کسی نہ کسی طرح مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب یقیناً نہیں ہے کہ مذہب خود کسبیوں کو مقدس قرار دیتا ہے۔ یہ وہ بدنصیب عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں قید ہوکر آتی تھیں اور چکلوں کے سامنے خوش خلاف ہوکر آنے جانیوالے پر ڈورے ڈالتی تھیں۔ ان عورتوں کو کسی مرد کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل نہ تھا بلکہ انھیں ہر اس شخص کے لئے رضامند ہونا پڑتا تھا جو ازروے قانون مقرر کردہ حقیر ترین رقم پیش کردے۔

اس زمانہ میں عورتیں نہایت حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ اور بیوں کا فرض بچے جننے کے سوا اور کچھ نہ تھا باینہمہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں سولن نے ان عورتوں کے حقوق کا تحفظ کردیا تھا جو صاحب مال و جائداد ہوتی تھیں۔ پلوٹارک (Plutarch) نے سولن کے ان قوانین کی تعبیر عجیب و غریب طور پر کی۔ الغرض عام طور پر شادی شدہ عورت سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ گھر میں رہے اور اپنے بال بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ لڑکیوں کی شادیاں عموماً اوائل عمر میں ہوجاتی تھیں اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ ان ضروری فنون کی تعلیم پالیتیں جو ایک اچھی گھر والی کے لئے ضروری ہیں۔ قدیم یونان کی معزز عورت مطلق تعلیم یافتہ نہیں ہوتی

تھیں ۔ علاوہ ازیں وہ دنیا بھر سے الگ تھلگ رہتی تھیں ۔ شادی سے پہلے اکثر شوہر کو دیکھنا تک نصیب نہ ہوتا تھا ۔ دولھا اور دلہن میں باہم محبت کا ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا

عورتوں کو تھیٹروں ۔ مردانہ کھیلوں ، یا دیگر پبلک مقامات میں جانے کی اجازت نہیں تھی ۔ لیکن ان احکام امتناعی سے پیشہ ور عورتیں عموماً مستثنیٰ کر دی جاتی تھیں ۔ ہومر کے زمانہ میں عورتوں کی حالت نسبتاً اچھی تھی تاہم مرد عورتوں کو جبراً بھگا لیجاتے تھے یا انھیں قید کر کے شادی کرتے یا گھر میں ڈالتے تھے ۔ اور اس سلسلہ میں بعض مرتبہ سخت جنگ ہو جاتی تھی چنانچہ ہیلن کے حسن و جمال نے جس طرح ایک ہزار جنگی جہازوں کا بیڑہ تباہ کر دیا تھا وہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے ۔

قدیم یونان میں کسی شخص کی بیوی سے یا کسی اپنی ناکتخدا رشتہ دار عورت سے تعلق پیدا کر لینا معمولی بات سمجھی جاتی تھی اور جس شخص کے خلاف یہ جرم کیا جاتا تھا اسکو عموماً یہ حق حاصل ہوتا تھا کہ مجرم سے وہ جو چاہے انتقام لے ۔ اس میں سزائے موت بھی شامل تھی ۔ حکومت کی طرف سے بھی مختلف قسم کی سزائیں انسداد زنا کاری کے لئے مقرر تھیں ۔

ان سزاؤں کے خوف سے صاحب عصمت عورتیں محفوظ رہتی تھیں اور مرد چکلوں میں جا کر رنڈیوں سے متمتع ہوتے تھے ۔ اُس زمانہ میں کسی کسبی کے گھر جانا معیوب نہ تھا اور نہ خوف کا سبب کیونکہ ان کسبیوں کا خرچ حکومت اُٹھاتی تھی اور یہ اندیشہ نہ تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں سے ملکر لوگوں کو لٹوا دینگی ، اسی کیساتھ البتہ یہ امر ضرور قابل توجہ ہے کہ اس زمانہ میں آتشک یا سوزاک جیسی ناپاک بیماریوں کا کہیں وجود نہ تھا ۔ یورپ میں آتشک کا پتہ اس وقت کے بعد سے چلتا ہے

جبکہ کولمبس امریکہ دریافت کرچکا تھا۔ یقیناً یہ ناپاک بیماری اس وقت جزیرہ ہائٹی یا سان ڈومنگو واقع مجمع الجزائر غرب الہند سے ہسپانیہ میں لائی گئی تھی۔ سوزاک قدیم یورپ میں ضرور پایا جاتا تھا۔ لیکن اس بیماری کی نوعیت اور اس میں مبتلا ہونے کے اسباب لوگوں کو معلوم نہ تھے۔

الغرض کسبیوں کا وجود ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے طبقۂ احرار کی بیویوں کی عصمت و عفت محفوظ رہتی تھی۔ قدیم زمانہ کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں غلام کا بہت بڑا حصہ تھا۔ مسیح سے قبل چوتھی صدی میں ایتھنز کی مردم شماری ہوئی تو معلوم ہوا کہ آزاد شہری ۲۱ ہزار۔ غیر ملکی باشندے ۱۰ ہزار اور غلام ۴۰ لاکھ ہیں۔ زمانۂ مابعد میں غلاموں کو آزاد کرنا روما میں عام ہوگیا تھا۔ لیکن یونان میں یہ بات شاذونادر تھی۔

واقعات مندرجہ بالا سے یہ بات پوری طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ بہت کم آزاد عورتیں کسبیوں میں شامل ہوتی تھیں۔ لیکن یہ ہوتا تھا کہ کسی شہری کی لڑکی کو بحری قزاق پکڑ لیتے تھے یا وہ جنگ میں اسیر کرلی جاتی تھی۔ یا لڑکی کا باپ اسے فروخت کردیتا تھا اور اس طرح یہ سب یونان قدیم کے چکلوں میں چلی جاتی تھیں۔

قدیم زمانے کے یونانی کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہونا بڑی کمزوری خیال کرتے تھے۔ اسلئے کسبی صرف مردوں کی تفریح کا کام دیتی تھی۔ داشتہ عورت خانگی ضرورتوں کو دیکھتی تھی اور بیوی اسلئے تھی کہ جائز بچے جنے۔ یونان میں بیوی کو ایک ناگزیر مصیبت خیال کیا جاتا تھا اور عشق و محبت انکے نزدیک ایک بیماری یا ہلکا سا جنون تھا۔

قدیم یونانیوں میں عشق و محبت کو غیر اہم چیز سمجھنے کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہاں تعلق جنسی علی رؤس الاشہاد بغیر کسی آڑ یا پردہ کے ہوتا تھا۔ یونانیوں کے نزدیک برہنگی کوئی گناہ نہ تھا۔ اولمپیائی کے کھیلوں میں جو لوگ کرتب دکھاتے تھے وہ کرتہ یا پاجامہ نہیں پہنتے تھے۔ ہر جگہ عریاں بُت اور ننگی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اور انھیں دیکھ کر کوئی شخص نہیں شرماتا تھا۔ یہی "عریانی" تھی جو عشق و محبت کی کیفیت دل میں قائم نہ ہونے دیتی تھی۔

عشق و محبت کے خیال کو فحش سے علٰحدہ کرنا قدیم یونانیوں کے حکیمانہ رجحان کے قطعی خلاف تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہر صورت سے حکومت کی تکمیل کریں اور کسی خاص بات کی ترقی پر توجہ نہ کی جائے تاوقتیکہ وہ ریاست کی ترقی میں مدد نہ دے۔

بہت سے یونانی اہل فکر کے نزدیک باقاعدہ فحاشی سے ریاست کی خدمت ہوتی تھی۔ ان کے نزدیک فحاشی ذریعۂ شہوت رانی نہیں تھا۔ بلکہ خواہشات فطری کے یوراکرنیکا ذریعہ تھا۔

واضح ہو کہ قدیم زمانہ میں بدکاری صرف بڑے بڑے شہروں ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی عورتوں کے چکلے پائے جاتے تھے اسی کے ساتھ جب کسی مہم پر فوجیں بھیجی جاتی تھیں تو انکے ساتھ کسبیاں بھی جاتی تھیں۔ یہ یونیورسٹیوں میں بھی پہونچ جاتی تھیں۔ تہواروں اور مذہبی میلوں میں تیرتھ کے مقامات میں اور ان تمام میلوں میں جہاں مرد بکثرت جمع ہوتے تھے کسبیوں کے جھرمٹ ضرور ہوتے تھے۔

روما کے تہوار فلوریلیا کی طرح بہت سی مذہبی تقریبیں کسبیوں سے خاص طور پر تعلق رکھتی تھیں۔ اور بعض ایسے تہوار بھی ہوتے تھے جنکا تعلق صرف کسبیوں سے تھا اور ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ میلہ تھا جو آفرودیتہ دیوی کے اعزاز میں بمقام کارنتھ برپا ہوتا تھا۔

اگرچہ یونان کی اکثر کسبیاں کنیزیں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے درجے مختلف تھے۔ درجۂ خاص کی کسبیاں وہ تھیں جو بطور مدخولہ عرصہ تک ایک ہی مرد کی پابند رہتی تھیں۔ اور ادنیٰ درجہ کی کسبیاں وہ تھیں جو وقتی طور پر نہایت ہی حقیر معاوضہ کے قبول کرنے میں بھی عذر نہ کرتی تھیں

بہت سی کسبیاں شریف خاندان کی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ جو قزاقوں کے ہاتھ پڑنے یا جنگ میں مفتوح ہونے کے بعد لونڈیاں بنالی جاتی تھیں اور پھر انسے کسب کرایا جاتا تھا۔ ان میں بعض ایسی بھی ہوتی تھیں جو علم مجلسی اور فن موسیقی سے واقف ہوتی تھیں اور اگر وہ قبول صورت اور تعلیم پانے کے قابل ہوتی تھیں تو انھیں چکلوں میں بھی تعلیم دیجاتی تھی۔

جو کنیز ناچنا گانا اور ساز بجانا جانتی تھی اس کی قیمت بازار بردہ فروشاں میں بمقابلہ دوسری کنیز کے زیادہ ہوتی تھی۔ اگرچہ اکثر یونانی اپنی بیویوں کا تعلیم یافتہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن وہ انھیں کسبیوں کی طرف زیادہ مائل ہوتے تھے جو تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔

جو کسبیاں چکلوں کے سامنے کھڑی ہوکر مردوں کو ترغیب دیا کرتی تھیں وہ نہایت ادنیٰ اور ذلیل طبقہ کی ہوتی تھیں۔

اعلیٰ طبقہ کی کسبیوں میں وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو اس زمانہ کے مختلف سازوں کو عمدگی اور ہنرمندی کے ساتھ بجا سکتی تھیں۔ یہ کسبیاں گویوں، رقاصوں، نقالوں اور بھانڈوں کے ساتھ ضیافتوں اور جلسوں میں اکثر طلب کی جاتی تھیں بیویوں کو ہمیشہ گھروں پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ ایسی صحبتوں میں شریک نہیں کیجاتی تھیں۔ ان پیشہ ور رنڈیوں کے ناچ ہمیشہ عریاں اور شہوت انگیز ہوا کرتے تھے کیونکہ فن کا فلسفہ یہی ہے کہ اشارتاً و کنایتہً یا صراحتاً جذبات حیوانی کو حرکت میں لایا جائے اور پھر چونکہ اس عہد میں شرم و حیا اخلاقی دنیا میں بہت کم وزن چیز سمجھی جاتی تھی اسلئے ان کے رقص کو قدرتاً زیادہ عریاں اور شہوت انگیز ہونا چاہیئے تھا۔

عہد حاضر کی طرح قدیم زمانہ میں بھی ناچ کے ساتھ ناٹک کی بعض خصوصیات متعلق ہوتی تھیں اور جس طرح اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تھیٹر معزز عورتوں کے جانے کی جگہ نہیں ہے، اسی طرح یونانیوں میں جو عورت اسٹیج پر آکر کام کرتی تھی اس کو کسبی سمجھا جاتا تھا۔

جیسا کہ اب سے پہلے انگلستان میں رواج تھا اسی طرح یونان قدیم میں بھی اسٹیج پر زنانہ اور مردانہ پارٹ سب مرد کیا کرتے تھے۔ اس وقت تمثیل میں اصلیت کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ ایکٹر لوگ مصنوعی چہرے لگایا کرتے تھے تاکہ وہ دیوتا کی طرح معلوم ہوں۔ اور وہ جوتے بھی اونچے پہنتے تھے تاکہ کام کرتے وقت بلند بالا نظر آئیں۔

ایک قسم کا ڈرامہ ایسا بھی ہوتا تھا جس میں عورتیں پارٹ کیا کرتی تھیں اس میں وہ حد درجہ شہوت انگیز ناچ ناچتی تھیں اور عریاں یا نیم عریاں حالت

میں جو عریانی سے بھی زیادہ ہیجان انگیز ہے، نرت کر کے فن عیاشی کے تمام راز بے سرپتہ کھول دیا کرتی تھیں اور پھر ناچ رنگ کے بعد وہ مردوں کے لئے وقف ہوتی تھیں۔

اُس عہد کے حمام بھی چکلہ ہی کا کام دیتے تھے اور ایتھنز اور دیگر یونانی شہروں کے حماموں میں بھی تھیٹروں کی طرح ناچ رنگ کا انتظام ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چکلوں کی طرح حمام بھی شہر سے باہر بنائے جاتے تھے۔

یونان کے قحبہ خانے نہ صرف عام اور کھلے ہوئے بازارِ حسن فروشی ہوتے تھے بلکہ وہاں جانا معیوب بھی نہ تھا۔ وہ ایک قسم کے سرکاری مکانات ہوتے تھے جن کا انتظام حکومت کے سپرد ہوتا تھا۔ بعض قحبہ خانے ہوٹل کا کام بھی دیتے تھے جہاں سامان اکل و شرب بھی عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ ان قحبہ خانوں سے باہر اعلیٰ طبقہ کی کسبیاں اپنے ذاتی چھوٹے چھوٹے آراستہ و پیراستہ کمروں میں رہا کرتی تھیں۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی ایک مرد کی پابند ہو کر رہتی تھیں۔ ان میں وہ کسبی بہت زیادہ مرکزِ توجہ ہوتی تھی جو نہ صرف بلحاظ حسن و جمال بلکہ بلحاظ علم و علمی کوئی خصوصیت حاصل کرے۔ ہیرو دوطوس نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مشہور کسبی رہوڈوپی کو سیفو (Sappho) کے بھائی چاراکس نے آزاد کرا دیا تھا لیکن وہ پھر مصر جا کر اپنا پیشہ بدستور کرتی رہی۔ کہتے ہیں کہ وہ اسقدر دولتمند ہو گئی تھی کہ اہرامِ مصر میں سے ایک ہرم خود اس کے خرچ سے تعمیر ہوا تھا۔

پلوٹارک نے (Alexander) پیریکلیز کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اسپاسیا (Aspasia) محض ایک کسبی کو خوش کرنے

کے لئے شہر ایتھنز کو جنگ میں جھونک دیا تھا۔ بعض مصنفین لکھتے ہیں کہ پیریکلیز اسپاسیا کو محض اس کی عقلمندی اور سیاسی قابلیتوں کے باعث چاہتا تھا۔ سقراط اور اسکے احباب بھی اس عورت کی صحبت میں بیٹھتے تھے۔ اور جو لوگ اسکی باتیں سن لیتے تھے وہ اپنے ساتھ اپنی بیویوں کو بھی لے آتے تھے تاکہ وہ بھی اس کی باتوں سے مستفید ہوں۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ پیریکلیز نے اپنی بیوی کو نکال دیا تھا اور خود اسپاسیا کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

ڈاکٹر ایوان بلاخ نے قدیم زمانہ کی کسبیوں کے بہت سے حالات لکھے ہیں جن میں ایک آرچیے (Archeanassa) تھی جسے سوفوکلیس مشہور ڈرامہ نگار اپنی تمام دولت دے گیا تھا۔ ایک اور لیونیتون (Leontion) تھی جو ایپی کیورس اور اسکے شاگردوں کی معشوقہ تھی۔ اور خود بھی ایک اچھی مصنفہ اور فلسفی تھی۔ ایک اور تھی جس کا نام فرائین (Phryne) تھا، یہ تمام یونان میں اپنے حسن و جمال کے لئے مشہور تھی۔ اسکا ایک طلائی بت بمقام دلفائی (Delphi) نصب تھا۔ ایتھنز کی ایک اور مشہور کسبی تھائیس (Thais) تھی جو سکندر اعظم کی معشوقہ بنگئی تھی اور اسکے بعد بطلیموس اول شاہ مصر کے ساتھ اسکے تخت پر بیٹھتی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس بطلیموس شاہ مصر کی ماں کسی زمانہ میں سکندر اعظم کے باپ فیلقوس شاہ مقدونیہ کی معشوقہ تھی۔

اپیلیس (Apelles) یونانی مصوروں میں سب سے زیادہ مشہور و معروف شخص تھا جو چوتھی صدی قبل مسیح میں گذرا اور سکندر اعظم کا ہمعصر تھا، اس نے بھی کسبیوں کی تصویریں کھینچنے سے انکار نہیں کیا۔ اسکی سب سے زیادہ

کامیاب تصویر وہ ہے جسکا عنوان یہ ہے "زہرہ سمندر سے نکل رہی ہے" حالانکہ یہ تصویر فی الحقیقت فرائن (Phryne) کی تھی جو (Poseidonia) دیوتا کے ایک تہوار کے موقعہ پر برہنہ ہوکر سمندر میں کودی تھی۔ کہتے ہیں پراکسائٹیس (Praxiteles) نے جو اپنی مشہور و معروف تصویر آفرودیتہ دیوی کی کھینچی تھی اسکے لئے بھی اسی عورت نے نمونہ کا کام دیا تھا۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے بنے ہوئے جو یونانی گلدان ہیں اُن میں بہت سے ظروف پر قحبہ خانوں کے مناظر اور ننگے آسن بنے ہوئے ہیں جنھیں بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور معزز شہری اُن کو اپنے گھروں میں سجاتے تھے۔ چنانچہ ارسطو نے اپنی کتاب "سیاسیات" (Politics) میں اور اصلاحات کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ فحش تصاویر منظر عام پر ممنوع قرار دیجائیں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قدیم یونان کی کسبیاں ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے ایسی ہی تھیں جیسی کہ اس زمانہ کی ہیں؟ ڈاکٹر بلاخ کا خیال ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جیساکہ لومبروسو نے اس زمانہ کی کسبیوں کا حال بیان کیا ہے۔ اسیطرح تمام زمانہ کی کسبیوں کے اوصاف میں انکی پاکیزگی و صفائی، انکی توہم پرستی، انکا مکر و فریب، انکا رشک و حسد اور انکی بے غیرتی و بیحیائی داخل تھیں لیکن ایک نا کخیال فلسفی یہ کہہ سکتا ہے کہ موخر الذکر بات کے سوا کون سی بات ایسی ہے جو تمام عورتوں میں نہیں پائی جاتی۔

ان عالمگیر خصوصیات قحبگی کو قدیم زمانہ کی کسبیوں پر عائد کرتے ہوئے ہمارے خیال میں ڈاکٹر بلاخ ایک بات بھول گئے ہیں اور وہ یہ کہ قدیم زمانہ کی اکثر کسبیاں

اپنی مرضی کے خلاف قحبہ خانوں میں داخل ہوتی تھیں اور جب ایک مرتبہ وہ قحبہ خانہ میں داخل ہو جاتی تھیں تو وہ اس پیشہ کے تمام ہتھکنڈے اور چالاکیاں سیکھ لیتی تھیں۔ اور بعض وہی طریقے اختیار کر لیتی تھیں جو پہلی کسبیوں کے ہوتے تھے۔ لومبروسو کا نظریہ جس سے ڈاکٹر بلاخ پوری طرح متفق نہیں ہیں یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی کسبی۔ اپنی فطری خصوصیات کی وجہ سے ایسی بنگئی ہے اور حالات سے مجبور ہو کر اس نے ایسا نہیں کیا بہت سی چھوٹی چھوٹی تفصیلات جو قدیم یونان کی کسبی میں پائی جاتی تھیں وہ اس زمانہ میں بھی یورپ اور امریکہ کی کسبیوں میں موجود ہیں، یونان و روم کی کسبیاں اپنے چہرہ پر غازہ لاکرتی تھیں۔ اور بعض اوقات معزز عورتیں بھی ان کی تقلید کرتی تھیں۔ جو طرز رفتار آجکل کی کسبیوں کا ہے وہی قدیم زمانہ کی کسبیوں کا تھا یعنی وہ بھی مٹک مٹک کر شہوت انگیز چال چلا کرتی تھیں۔ یونانیوں کا لباس بیشک ہم سے سادہ تھا۔ پھر بھی اعلیٰ طبقہ کی یونانی کسبیوں کو نئے نئے فیشن جاری کرنیکا موقعہ ملتا رہتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں بھی فن مشاطگری اتنا ہی ترقی یافتہ تھا جتنا آجکل ہے۔ سن رسیدہ اور بدصورت عورتوں کو بناسنوار کر دلفریب اور خوبصورت بنانیکا علم ایک مستقل فن تھا جسے بہت محنت سے حاصل کیا جاتا تھا۔

قدیم زمانہ کی کسبیاں مصنوعی دانت بھی استعمال کرتی تھیں جو غالباً موم یا کسی مسالہ کے بنائے جاتے تھے۔ اور انکا مقصد کھانا پینا نہیں بلکہ محض نمائش ہوتا تھا قدیم زمانہ کے لوگ مختلف قسم کے منجن اور مسیاں بھی جانتے تھے جن سے دانت خوبصورت بنائے جاتے تھے۔

خضاب کے ذریعہ سے بالوں کو رنگنا مصنوعی بالوں کو کام میں لانا۔ جسم پر سے بال اُڑانا۔ یہ تمام باتیں قدیم یونانی کسبیاں کیا کرتی تھیں۔ الغرض اس زمانہ کے اسباب آرائش و زیبائش جہانتک ہم کو معلوم ہے موجودہ زمانہ کے سامان زیب و زینت سے ہرگز کم نہ تھے۔

قدیم زمانہ کی کسبیاں موجودہ زمانہ کی ہر عورت کی طرح جانتی تھیں کہ فن دلربائی میں عریانی اسقدر کامیاب چیز نہیں ہے جسقدر نیم عریانی اور یہ کہ غمزہ و عشوہ کا برمحل استعمال کتنا موثر حربہ عورت کا ہے۔

الغرض قدیم یونان کی کسبیاں اپنی موجودہ یورپین اور امریکانی جانشینوں کی طرح تھیں۔ اور اگر کچھ فرق تھا بھی تو اسکی توجیہہ صرف اقتصادی یا فلسفیانہ ہو سکتی ہے۔

اس امر کے باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ فطرت انسانی خواہشات نفسانی میں گذشتہ پانچ چھ ہزار سال کے اندر کسی قسم کا تغیر واقع ہوگیا ہے۔ یہ بات باوجود زمانہ حال کے بیشمار آئین و قوانین، جلسوں، کانفرنسوں، الہامات اور پیشینگوئیوں کے بدستور موجود ہے۔ قحبہ خانے بھی تقریباً ویسے ہی ہیں جیسے پہلے زمانہ میں تھے۔ آجکل کی کسبی اگر سیگرٹوں اور وہسکیوں بوتلیں شراب کی پی جاتی ہے تو قدیم یونان کی کسبی بھی مسکرات کا استعمال کیا کرتی تھی۔

اناطول فرانس نے اپنے ناول "تھائیس" (۱۸۹۰ء) میں نہایت دلچسپی سے کام لیکر ایک خوبصورت اور دلعزیز یونانی کسبی کا حال لکھا ہے۔ یہ کسبی قدیم یونان میں نہیں بلکہ مصر میں رہتی تھی۔ اس زمانہ میں مصر کے بڑے بڑے شہروں پر یونان

کا اثر تھا۔ اس قصہ میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ ایک راہب ایک پیشہ ور عورت پر کسقدر اثر ڈالتا ہے مگر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ایک مرد اکڑتا ہوا جاتا تھا اور فصل بھر کے لئے قحبہ خانہ کا ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ وہ ان لوگوں کی طرح مکارانہ صورت نہیں بناتا تھا جو آجکل اوپیرا میں ایک چوڑا کمرہ خرید لیتے ہیں اور پھر بھی زاہدان خشک کی سی صورت بنائے رہتے ہیں عملی طور پر نوجوان طبقہ کا ہر فرد کسبی کا گھر جھانکتا تھا۔ کیونکہ وہاں ہر شخص بآسانی آجا سکتا تھا۔ فیس بہت کم تھی۔ اور وہاں آنا جانا رائے عامہ کے نزدیک قابل شرم بات نہ تھی۔

سولن کے زمانہ میں چند سکوں کی مدد سے ہر شخص ایک معمولی کسبی کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ جو کسبیاں زیادہ پسندیدہ ہوتی تھیں وہ اتنی ہی زیادہ گراں بھی تھیں۔ اسوقت کسبیوں کے دلال بھی موجود تھے جو یا تو سرکاری ملازم ہوتے تھے یا غلام کسبیوں کے مالک یا آزاد رنڈیوں کے مقرر کئے ہوئے لوگ بعض صورتوں میں یہ لوگ کسبیوں کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ ماں اپنی بیٹی اور شوہر اپنی بیوی سے ملا دیتا تھا۔ زمانہ قدیم میں کسبیوں کا کاروبار وہ لوگ بھی کرتے تھے جو اس ذریعہ سے تجارتی نفع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بازار برہ فروشاں میں دیگر غلاموں کیطرح کسبیاں بھی فروخت ہوتی تھیں اور خرید و فروخت میں ان کے جذبات کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ جو لوگ خریدنے والے ہوتے تھے وہ انکو پوری طرح دیکھ لیا کرتے تھے۔ قدیم زمانہ کے لٹریچر میں لوطیوں کا ذکر آتا ہے جنکے لئے قحبہ خانوں میں خاص انتظام کیا جاتا تھا۔ تقریباً تمام خواہشیں جو آجکل ہم کو خلاف فطرت

اور خلاف اخلاق نظر آتی ہیں وہ قدیم زمانہ میں معقول اور فطری خیال کی جاتی تھیں چنانچہ لواطت ایک نہایت اہم بات تھی جو کھلم کھلا ہوتی تھی اور جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔

بہت سی کتابیں جو آجکل مخرب اخلاق سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم زمانہ میں پوری طرح اشاعت پذیر تھیں۔ مثلاً بہت سی کتابیں "زہرہ کی تصویر" پر لکھی گئی تھیں جن میں مجامعت کرنے کے مختلف طریقے تحریر تھے۔

یہودیوں میں غسل جنابت ایک فریضۂ مذہبی تھا اور اسی لئے حمام اور قحبہ خانے پاس پاس ہوتے تھے اور بعض اوقات حمام اور قحبہ خانہ میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ جسمانی ورزش سے پہلے یہ لوگ اپنے جسم پر تیل مل لیا کرتے تھے۔ اور غالباً اسی عمل کی بدولت وہ بسا اوقات گندی بیماریوں سے محفوظ رہتے تھے۔ قدیم زمانہ کے لوگ خود اپنے فائدہ کی غرض سے کسبیوں کی جسمانی صفائی اور پاکیزگی کا بیحد خیال رکھا کرتے تھے۔ وہ ان کے نزدیک ایک مفید بلکہ مذہبی چیز تھی جسکی وجہ سے گھر کی عصمت و عفت محفوظ رہتی تھی ورنہ انسان ہونے کی حیثیت سے کبھی اسکا لحاظ نہیں کیا گیا۔

یونان قدیم میں کسبیوں کی پاک حکومت کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو اسکی کمائی کا بڑا حصہ لے لیتی تھی۔ ان سے ٹیکس وصول کرنیوالوں کا ایک خاص عملہ ہوتا تھا اور جو عورت حکومت کی ملکیت سے باہر ہوتی تھی وہ ماہانہ ٹیکس ادا کرتی تھی جو اسکی مقررہ خرچی کے برابر ہوتا تھا۔

قدیم ہندوستان یونان اور روم میں ہر چند کسبیوں کو ذلیل سمجھا جاتا تھا

لیکن جائز بیوی کے مقابلہ میں انھیں بہت زیادہ آزادی اور اہمیت حاصل تھی۔ بیوی کا کام گھر میں رہنا کھانے پینے کا انتظام کرنا اور بال بچوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ لیکن کسبی آزادی کے ساتھ لوگوں سے ملتی تھی۔ اگر وہ ہوشیار ہوتی تھی تو اسقدر اثر اور طاقت حاصل کرلیتی تھی کہ سلطنت کی قسمت کا فیصلہ اسکے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ بہرحال اسکی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا میدان بہت وسیع ہوتا تھا۔ اگر اس میں اتنی قابلیت اور خواہش ہوتی تھی کہ وہ مذاکرات حکیمہ میں شرکت کرسکے تو اسے اجازت و پذیرائی تھی۔ ہر شخص اسکا مداح ہوسکتا تھا اور ہر شخص اسکا جام صحت پی سکتا تھا۔ ہر شخص اسکے ساتھ بعزت واکرام پیش آتا اور تحفہ تحائف نذر کرتا تھا۔

ناظرین میں سے جن حضرات نے ملکہ الیزبتھ کے زمانہ کے ڈرامے پڑھے ہونگے وہ واقف ہونگے کہ انکا منظر عام طور پر کوئی قحبہ خانہ یا مشہور بارونق شرابخانہ رکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ منجملہ دیگر خصوصیات کے لاطینی تماشیل سے لیا گیا تھا اور لاطینی تماشیل میں یونان کی تقلید کی گئی تھی۔ قدیم زمانہ کے لوگ اسٹیج پر قحبہ خانہ دیکھکر ناراض نہیں ہوتے تھے۔ اور بہت سی یونانی تماشیل میں کوئی اعلیٰ پایہ کی کسبی ہیروئن ہوتی تھی۔

سلطنت روم کے زمانہ میں یونان کی کسبیوں کا جو کچھ حال تھا وہ لیوسین (Lucian) کے طنزیہ مکالموں اور اسکے ہمعصر السیفرون (Alciphron) کے فرضی خطوط سے بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔ قدیم زمانہ کے تمام چھوٹے بڑے مصنفین معاملات جنسی پر آزادانہ قلم فرسائی کرتے تھے۔ اور بہت سی کتابوں کا مقصد یہی تھا کہ وہ "کوکشاستر" کا کام دیں۔ اس مقصد کی طرف قدیم طبی کتب میں

بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

یہی بات قدیم فنون لطیفہ میں بھی پائی جاتی ہے چنانچہ آج بھی "لنگ" کی بیشمار نشانیاں موجود ہیں۔ لیکن انھیں دیکھکر وہی لوگ پہچان سکتے ہیں جو انکے راز سے واقف ہیں قدیم زمانہ میں جب یہ "لنگم" اور بھی زیادہ بکثرت تھے تو ہر شخص انکا مطلب و مفہوم سمجھتا تھا۔

قدیم زمانہ سے یہ بات چلی آتی ہے کہ جب کوئی مصور یا سنگتراش کسی مقدس مجسمے یا تصویر کے لئے کسی عورت کا نمونہ تلاش کرتا ہے تو عموماً وہ صاحب عصمت و عفت نہیں ہوتی۔ یونان میں آفرودیتہ (Aphrodite) دیوی کے بہت سے بت مشہور و معروف کسبیوں کے نمونہ پر بنائے گئے تھے۔ چونکہ وہ عشق و محبت کی دیوی تھی اسکے لئے کچھ ضرورت نہ تھی کہ تقوے کا رنگ اسمیں پیدا کیا جائے۔ ہومر (Homer) شاعر اور یونانی ڈرامہ نویس کی دیویاں اور دیوتا چونکہ بشریت سے جدا نہ تھے اسلئے وہ بھی طبعی تقاضائے فطرت کے ماتحت کام کرتے تھے۔

## فحاشی قدیم رومیوں میں

قدیم رومی تہذیب و تمدن کی بنیاد زیادہ تر یونانی تہذیب و تمدن پر قائم ہوئی تھی بہت سی باتیں جو جزیرہ نمائے یونان کی تجگی کے متعلق کہی جا چکی ہیں انکا اطلاق اطالوی اور سلطنت روم کی تجگی پر بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ حالات بدل گئے تھے مگر غلامی کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ اور اخلاق جنسی کا معیار بھی وہی قائم رہا۔

اہل رومہ زمانۂ قدیم سے نسلاً بعد نسلٍ لنگ کی پوجا کرتے چلے آتے تھے۔

قدیم یونانیوں اور اہل مشرق سے انھوں نے عشق و محبت کی دیوی کی پوجا کرنا سیکھا چنانچہ رومی دیوی وینس کی وہی خصوصیات ہیں جو یونانی دیوی آفرودیتہ کی تھیں۔ بعض کا قیاس ہے کہ لفظ "وینس" (Venus) عبرانی لفظ "بنات" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "بیٹیاں" یا "لڑکیاں" ہیں۔ اس لغوی معنی سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مشرق میں "کنیا کی کٹی" (Maidens hut) اور مذہبی مباشرت میں باہم کیا تعلق تھا۔ بائبل کی بہت سی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب بناتِ اسرائیل اجنبی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگتی تھیں تو وہ حد درجہ بدمستیوں اور سیہ کاریوں میں بھی مبتلا ہو جاتی تھیں۔

یونان کی طرح روم میں بھی قحبہ خانہ کا دروازہ ہر اُس شخص کے لئے کھلا رہتا تھا جسکے پاس کچھ بھی رقم موجود ہوتی تھی اور سلطنت روم کے زمانہ میں تقریباً ہر شرابخانہ حسن فروشی کا بازار بنا ہوا تھا۔

ہوریس کا خانساماں گاؤں کی زندگی سے گھبرا گیا تو ہوریس نے اپنے خط میں اُسے اس طرح ڈانٹا تھا:۔ "ہم دونوں ایک ہی چیز کو یکساں نظر سے نہیں دیکھتے ..... میں دیکھتا ہوں کہ قحبہ خانے اور شرابخانے تمہارا دل شہر کی طرف کھینچتے ہیں ..... یہاں شرابخانے کہاں جو تمہیں شرابیں بہم پہونچائیں۔ نہ یہاں کوئی گانے بجانیوالی ہے جسکے ساتھ طبلہ کی تھاپ پر تم کو لا مٹکا کرنا چو"

رومی قحبائیں عموماً وہ عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں اسیر ہو کر آتی تھیں۔ اور ملک شام کی رقاصہ اور مغنیہ عورتیں بھی دریائے ٹائبر کے ساحل سے جہاں رومہ آباد تھا بخوبی واقف تھیں۔ ان میں جملہ اقوام و ملل کی عورتیں موجود تھیں

اور یہ ہر معاشرتی اور مجلسی طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس زمانہ کے پر تکلف شرابخانوں میں عمدہ کھانے۔ عمدہ شرابیں۔ راگ رنگ اور بھینی بھینی خوشبوئیں خواہشات نفسانی کو ہیجان میں لاتی تھیں۔ شرم و حیا کی دیوی "پودی سیتا" (Pudicitia) کے رومہ میں دو مندر تھے۔ لیکن لوگ اس نیک دیوی کی پوجا اس شوق سے نہیں کرتے تھے جیسے عشق و محبت کی دیوی وینس کی۔ بلکہ خود "پودی سیتا" کے مندر میں کثرت سے شہوت رانیاں ہوتی تھیں۔

جب سلطنت روم میں عورتوں اور مردوں کے لئے مشترکہ حماموں کا رواج جاری ہوا۔ اور پبلک حماموں میں پیشہ ور عورتیں داخل ہونے لگیں تو بعض لوگ بہت برافروختہ ہوئے۔ اسلئے ان کا عام داخلہ بند کر دیا گیا۔ اگر کوئی جاتی بھی تھی تو خاص اجازت نامہ لیکر جاتی تھی کیونکہ ان کو عام شہریوں جیسے حقوق حاصل نہ تھے

قدیم یونان کی طرح روم میں بھی قحبہ خانے کو اہلی زندگی کی پاکیزگی کا ممد و معاون سمجھا جاتا تھا۔ زنا سب سے بڑا جرم تھا۔ زانیہ کے شوہر کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنی سیہ کار بیوی کو قتل کر ڈالے۔ اور اسکے بہکانے والے سے جس طرح چاہے انتقام لے۔ آخری شہنشاہ روم کے زمانہ میں زنا کے لئے حکومت کی طرف سے بھی سزائے قتل مقرر کر دیگئی تھی۔

جب کوئی زبردست فتح حاصل ہوتی تھی تو ہزار ہا نوجوان لونڈیاں قید ہو کر بازار میں آجاتی تھیں۔ اور جب رومی سپاہی بعض اوقات کسی غیر ملک میں عرصہ تک متعین رہتا تھا تو اسکو تقاضائے فطرت پورا کرنے کے لئے یا تو کسی پیشہ ور عورت سے متعلق ہونا پڑتا تھا۔ یا وہ کسی عورت کو اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔

اس زمانہ میں بھی جزائر شرق الہند میں جو ولندیزی فوجیں متعین ہیں ان کے سپاہیوں کو اجازت ہے کہ وہ جزائر کی سانولی عورتوں کو اپنے پاس رکھیں۔

روم کے تمام سرکس۔ تمام تھیٹر۔ تمام مذہبی میلے ٹھیلے۔ اور تمام پبلک جلسے مقاصد تجملی کو پورا کرتے تھے۔ ہر جگہ عورتیں آزادی کے ساتھ بہار حسن دکھاتی تھیں چنانچہ جوریس (Horace) نے کسبی اور بیوی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مرد سوائے چہرے کے اپنی بیوی کا کوئی حصہ جسم نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن کسبی ..... کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی۔ اپنے باریک ریشمی لباس میں وہ مرد کو ایسی ہی نظر آتی ہے گویا عریاں ہے۔ اور اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

روم کے ہر بارونق بازار میں پیشہ ور عورتیں لوگوں پر ڈورے ڈالتی نظر آتی تھیں جب شہر روم عروج پر تھا تو اسکی آبادی ۱۵ لاکھ تھی۔ آزاد شہریوں، کاروباری لوگوں، آزاد غیر ملکیوں اور غلاموں کے اجتماع سے شہر میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ بعض محلے ایسے تھے جن میں کسبیوں کی خاص طور پر کثرت تھی۔ یہ مندروں کے آس پاس بھی اسی کثرت سے رہتی تھیں جیسے دیگر مقامات میں۔ لیکن نیچے درجہ کی ارزاں کسبیاں عموماً شہر کے گرد و نواح میں رہا کرتی تھیں۔ سہ پہر کے وقت قحبہ خانے کھلتے تھے اور رات بھر کھلے رہتے تھے۔ رات کے وقت کسبیاں شرابخانوں کی زندگی میں بھی حصہ لیتی تھیں پرائیویٹ مکانات کے جلسوں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ اور لوگ موسیقی کے مدرسوں میں بھی اسی نیت سے جاتے تھے کہ شاید انکی نظر انتخاب کسی پر پڑ جائے۔

شہنشاہی کے زمانہ میں شہر روما عیش وعشرت اور سیہ کاریوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بہت سے مورخین کا قول ہے کہ زوال سلطنت کا باعث یہی عیش پرستیاں اور سیہ مستیاں ہوئیں۔ مانٹسکیو (Montesquieu) نے لکھا ہے کہ: "روما کے عوام بدترین شہنشاہوں سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے جب رومیوں کے ہاتھ سے سلطنت نکل گئی۔ اور انکے لئے جنگ وجدال کا کوئی مشغلہ نہ رہا تو رومی بدترین قوم بنگئے۔ وہ تجارت و فنون کو غلاموں کا کام سمجھتے تھے۔ حکومت کی طرف سے جو انھیں مفت غلہ ملتا تھا اسکی وجہ سے انھوں نے فن زراعت سے لاپروائی کی اور کھیل تماشوں کے عادی ہوگئے۔ جب شہنشاہ نیرو (Nero)، کموڈوس (Commodus)، کالیگولا (Caligula)، (شاہان روما) کا انتقال ہوگیا تو لوگوں نے انکا ماتم کیا کیونکہ وہ ان کی عیش پرستیوں میں حتی الامکان ہر طریقے سے مدد کرتے تھے۔ اور تمام سلطنت کی دولت ان کے لئے خرچ کر دیتے تھے"

وہ بھی کیا وقت تھا جب شہنشاہی روما کے باشندوں کی اکثریت سرکاری وظائف اور دوشیزوں پر زندگی بسر کرتی تھی، کام کرنے کو انکا دل نہ چاہتا تھا۔ کسبیاں بہت سستی تھیں۔ ذرائع نقل وحمل کی کمی کے باعث تمام آبادی صدود شہر میں گھٹی پڑی تھی۔ گرد ونواح میں جاکر لوگ نہیں بستے تھے۔ غریب و نادار لیکن مغرور شہری روما کے اندر ہی رہنا پسند کرتے تھے۔

عالم تصور میں نقشہ کھینچئے کہ قدیم اطالیہ کی ایک کسبی بھرے بازار میں جہاں خوب چہل پہل ہے، اٹھلاتی ہوئی گذر رہی ہے۔ کسی سے آنکھ لڑائی، کسی کا منھ

چڑھایا "کہیں گڑ گئی کہیں مرگئی" الغرض چوروں سے غلاموں سے کاہل شہریوں سے چھیڑ کرتی چلی جارہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا نتیجہ کیا ہوگا اور اخلاقی انحطاط کیسے انسان کے قوائے عمل کسدرجہ مضمحل ہوجائینگے۔

بعض اوقات گاؤں یا قصبہ کے کسی معزز آدمی کی لڑکی شہر کی شان وشوکت اور رنگ رلیوں کا حال سُنکر گھر سے نکل کھڑی ہوتی تھی اور رفتہ رفتہ صحبت بد کے اثر سے وہ بھی کمانے لگتی تھی۔ الغرض بمقابلہ یونان کے روما میں آزاد کسبیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور اعلیٰ طبقہ کی رومی کسبیاں یا تو آزاد شدہ کنیزیں ہوتی تھیں یا ان کی اولاد اور روما کی اکثر مشہور و معروف کسبیاں ایشیائی نژاد تھیں۔ ان میں بعض ایسی تھیں جو بحیثیت لونڈی لائی گئی تھیں اور بہت سی ایسی تھیں جو بطیب خاطر شہر روما یا سلطنت روم کے اور بڑے شہروں میں آبسی تھیں۔ اور اپنا پیشہ کرتی تھیں۔ یونان کی طرح روم میں بھی اعلیٰ طبقہ کی بعض کسبیاں تاریخی کسبیاں بنگئی تھیں۔ ہوریس (Horace) کی کتاب میں ایسی عورتوں کی ایک بڑی فہرست موجود ہے ان ناموں میں سے سائنارا (Cynara) لالیجہ (Lalage) لیڈیا (Lydia) اور فلیس (Phyllis) ایسے نام ہیں جنھوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہمارے خیال میں یہ انکے اصلی نام نہیں تھے بلکہ لقب یا پیار کے نام تھے۔ یا ایسے نام تھے جو محض پیشہ کی خاطر رکھ لئے گئے تھے۔ قدیم یونان میں بہت سی کسبیوں کا نام لالیجہ (Lalage) ہوا کرتا تھا جسکے معنی ہیں "بچوں کی طرح بھولی بھالی باتیں کرنیوالی"

لیکن واضح ہو کہ بہت سی کسبیوں کو صرف بھولی بھولی باتیں ہی کرنا نہیں آتا تھا بلکہ وہ بعض اوقات اعلیٰ درجہ کی گویا اور اعلیٰ پیمانہ کی شاعرہ بھی ہوتی تھیں ایسی عورتوں کے لئے ایسے امکانات تھے جو گھر کی بی بیوں اور بیٹیوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتے تھے۔

اس آزادی کے شوق میں رومہ کی بہت سی کتخدا عورتوں نے بھی خود کو خفیہ طور پر آزاد کر لیا تھا حتیٰ کہ بعض شہنشاہوں کی بیویاں بھی قحبہ خانوں میں جا کر مصروف نشاط ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں شہنشاہ کلادیوس (Claudius) کی ملکہ میسالینہ (Messalina) کا نام کافی بدنام ہے۔ اس عورت کو ۴۸ء میں بایں جرم قتل کر دیا گیا کہ اس نے ایسی حالت میں جبکہ اسکا شوہر شہنشاہ کسی دوسری جگہ مصروف تھا اس نے ایک خوبصورت رومی نوجوان سے کھلم کھلا شادی کر لی تھی۔ جوونیل (Juvenal) نے اس شہنشاہ بیگم کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک قحبہ خانہ میں اپنے لئے ہمیشہ ایک کمرہ محفوظ رکھتی تھی۔ اور ہر رات سر پر سنہری بالوں کی ٹوپی پہنکر لائسسکا (Lycisca) کے نام سے قحبہ خانہ میں جاتی تھی۔

رومی قحبہ خانے عبارت تھے کوٹھریوں کی ایک قطار سے جن کے دروازے ایک ہی غلام گردش میں ہوتے تھے۔ ایک ہی قحبہ خانہ میں مرد و عورت دونوں قسم کے عصمت فروش مل جاتے تھے۔ بڑے کمرہ میں بہت سی کسبیاں اور امرد (نوعمر لڑکے) جمع رہتے تھے جن میں سے ہر شخص کو انتخاب کر لینے کی اجازت تھی۔ ان میں نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں اور ادھیڑ عورتیں بھی جنھیں اس شرم انگیز پیشہ میں

مدتیں گذر گئی تھیں ۔ لیکن قدیم زمانہ کی مشہور کسبیوں کو اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ قحبہ خانہ میں جاکر حسن فروشی کریں یا سڑکوں پر کھڑے ہوکر مردوں کو ترغیب دیں ان کی بات چیت نوکروں کے ذریعہ سے ٹھہر جاتی تھی اور گھر بیٹھے دولت پہنچ جاتی تھی

بعض قحبہ خانوں کے دروازوں پر کسبیوں اور نوعمر لڑکیوں کی فہرست آویزاں ہوتی تھی جس میں ہر ایک کا مختصر حال اور انکی خصوصیات درج ہوتی تھیں ہر ایک کی خرچی بھی اس فہرست میں درج ہوتی تھی ۔ بعض کی خرچی اتنی بڑی ہوتی تھی کہ اسے ایک امیرزادہ ہی ادا کرسکتا تھا بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ ۔ علاوہ ازیں جو لوگ آتے جاتے تھے وہ فرمائشیں بھی پوری کرتے تھے ۔ تحفہ تحائف بھی لاتے تھے

رومی تماثیل میں بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں جن میں کسبی لونڈیوں کو فروخت کیا گیا یا کسی مدت معینہ کے لئے ٹھیکہ پر دیدیا گیا بعض مرتبہ اس قسم کے معاملات عدالتوں تک پہونچتے تھے ۔

قدیم یونان میں آزاد کسبیوں پر جو ٹیکس لگایا جاتا تھا اسکا حال ہم لکھ چکے ہیں تیسری صدی عیسوی میں بزمانہ شاہ اسکندر سیوپروس ( Severus ) یہ ٹیکس روم میں بھی جاری کردیا گیا تھا ۔ اور اس طرح جو آمدنی ہوتی تھی وہ سرکسوں تھیٹروں اور عام جلسوں پر خرچ کی جاتی تھی ۔ گویا عیش پرست کسبیوں سے روپیہ جمع کرکے مزید اہتمام عیش رانی کیا جاتا تھا ۔ قدیم زمانہ کی کسبیاں بعض خاص مجسٹریٹوں کے ماتحت ہوتی تھیں ۔ یہ عموماً وہ مجسٹریٹ ہوتے تھے جو لوگوں کے اخلاق کے نگراں رہتے تھے ۔ روم کے ایسے مجسٹریٹ جو کسبیوں کے لئے قواعد وضوابط مرتب کیا کرتے تھے ، بازاروں اور پبلک حماموں کے بھی انچارج ہوتے تھے ۔ روم میں کسبیوں کو

ایک خاص امتیازی لباس پہننا پڑتا تھا۔ یہ نہایت زرق برق اور شوخ رنگ ہوتا تھا۔ معزز بیبیاں زیادہ تر سادہ لباس پہنا کرتی تھیں۔ خصوصاً زمانۂ جمہوریت میں۔ سیاہ قبا کسبیوں کا خاص نشان تھا۔ گھر کی معزز بیبیاں ڈھیلا ڈھالا جامہ پہنتی تھیں جس سے ان کے بدن کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ حتیٰ کہ پاؤں تک ڈھکے ہوتے تھے۔ لیکن کسبیاں تنگ و چست لباس استعمال کرتی تھیں۔ لیکن شہنشاہی دور میں یہ تمام تفریحات محو ہو گئی تھیں

کسبیوں کو رومی مجسٹریٹوں سے اپنا پیشہ کرنے کے لئے لائسنس لینے پڑتے تھے۔ اور ان کے نام درج رجسٹر کر لئے جاتے تھے۔

شہنشاہی زمانہ کے بہت سے قوانین ایسے ہیں جن کی رو سے کوئی خاوند اپنی بیوی سے پیشہ نہیں کرا سکتا۔ دیگر قوانین ایسے بھی ہیں جنکا مقصد یہ تھا کہ آزاد رومی عورتوں یا کم از کم شریف خاتونوں کو بدکاری سے باز رکھا جائے۔ شہنشاہ ٹیبی ریس (Tiberius) نے کوشش کی تھی کہ شہر روما کے تمام قحبہ خانے توڑ دیے جائیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ یہ واقعہ تیسری صدی عیسوی کا ہے۔ تھیوڈوسیوس اعظم (Theodosius the Great) اور ویلنٹی نین اول (Valentinian) نے چوتھی صدی میں سلطنت روم کے اندر قحبگی کا پیشہ قطعی بند کر دیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں بھی سلطنت مشرقیہ روما کے شہنشاہ جسٹی نین (Justinian) نے اس قحبگی کا سلسلہ جاری رکھا۔

بت پرست رومیوں میں یہ خیال پہلے ہی سرایت کر چکا تھا کہ بدکاری ایک ناپاک اور شرمناک فعل ہے۔ اگر کوئی کسبی آزاد طبقہ کی ہوتی تھی تو بھی اسے

دوسرے شہریوں کے سے حقوق حاصل نہ تھے۔ عدالت میں اسکی گواہی مستند نہ ہوتی تھی اور نہ وہ خرچی کے بارہ میں کسی پر نالش کرسکتی تھی۔

روم کے شہنشاہی زمانہ میں رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کسی قحبہ خانہ میں آنا جانا اچھی بات نہیں بلکہ باعث ننگ و عار ہے۔ شریف خاندان کے لوگ یہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ قحبہ خانے میں گھستے ہوئے کوئی انھیں دیکھے اور پہچان لے۔ وہ اگر جاتے تو رات کو جاتے اور پھر بھی منھ چھپا کر

شہنشاہ آغسطس (Augustus) کے زمانہ میں ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے کوئی رومی کسی موجودہ یا سابق کسبی سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ حتیٰ کہ ارکان دارالاعیان کے درجہ کے لوگوں کے لئے تو اسبات کی بھی اجازت نہ تھی کہ کسی کسبی کی لڑکی سے بھی شادی کرسکیں۔ لیکن اسبات کی اجازت تھی کہ دارالاعیان کا کوئی رکن اگر کسی کسبی کو بطور مدخولہ گھر میں ڈالنا چاہے تو ایسا کرسکتا ہے۔ بہت کم صورتیں ایسی تھیں جن میں کسی اعلیٰ مرتبہ کے شخص نے کسی کسبی سے نکاح کیا ہو۔ بطلیموس شاہ مصر سے تھائیس کسبی کی شادی کا ذکر ہم کرچکے ہیں۔ شہنشاہ جسٹی نین (Justinian) نے خود ایک عورت تھیوڈورا (Theodora) سے شادی کی تھی جو بچپن میں سوانگوں اور نقلوں کے اندر ایکٹریس کا کام کیا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ عورت اپنے فن میں بڑی استاد تھی اور اس نے قحبہ خانہ کی دوسری لڑکیوں کو بھی قحبگی کے گر اور کرتب سکھا دیئے تھے۔ اور پھر اسی تھیوڈورا نے شہنشاہ کے ساتھ ملکر انسداد قحبگی کی کوشش کی۔ لیکن جسٹی نین نے اس عورت سے نکاح کرنے کے قبل قسطنطین کا وہ قانون

منسوخ کر دیا تھا جبکی رو سے کسی بلند مرتبہ شخص کو سوانگ بھرنے والیوں و نقلیں کرنیوالیوں سے
سے نکاح کرنے کی اجازت نہ تھی۔ تھیوڈورا کو حکمراں ملکہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس نے
نظم و نسق سلطنت میں بہت اہم حصہ لیا۔

## فحاشی اور ہندوستان قدیم

قدیم روم۔ یونان فینقیہ۔ آشوریہ۔ بابل
فلسطین۔ اور مصر کی بے سر و پا روایات
یا خرافیات سے ناظرین کرام کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ فحش کی ابتدا مذہب کی آڑ میں
ہوئی تھی۔ اسی طرح ہندوستان قدیم کی دیومالا (Mythology) کے
مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی فحاشی کی ابتدا اسی نوع کی مذہبی روایات
سے ہوتی ہے۔ اگر ان روایات کا مطالعہ منظور ہے تو دیانند سرسوتی کی ستیارتھ
پرکاش ملاحظہ کیجئے جس میں بہت سے اسی نوع کے قصے درج ہیں اور جنکو پڑھنے
کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ ان روایتوں کو کیونکر ہندو قوم نے اسوقت تک گوارا کیا
اور ان کے ہوتے ہوئے ایک شخص ان کے مذہب و معاشرت اور تہذیب و اخلاق
کے متعلق کیا رائے قائم کر سکتا ہے۔

# فحاشی قرونِ وسطیٰ میں

قرونِ وسطیٰ سے مراد وہ زمانہ ہے جو سلطنت روما کے زوال سے شروع ہوکر کولمبس کی دریافتِ امریکہ پر منتہی ہوتا ہے اور اس دور میں موضوعِ زیرِ بحث کے لحاظ سے تین باتیں قابلِ اعتنا ہیں۔ ایک تو یوروپ کا دینِ مسیح قبول کرنا۔ دوسرے آتشک یا "آبلۂ فرنگ" کا ظہور۔ تیسرے علوم و فنون کا احیا اور کلیسائے مسیحی میں افتراق و انشقاق۔

تاریخ یوروپ کو تین علٰحدہ علٰحدہ نمایاں حصوں میں تقسیم کرنا تو یقیناً مشکل ہے کیونکہ بہت سی باتیں جو قدیم روما میں پائی جاتی تھیں انکا اثر قرونِ وسطیٰ میں بھی بدستور قائم رہا۔ اور بہت سے ادارے جو قرونِ وسطیٰ کی ابتدا میں ظہور میں آئے تھے وہ بعد کو احیاءِ علوم و فنون اور اصلاحاتِ مذہبی کے زمانہ میں بھی باقی رہے۔ رومیولس آگسٹولس (۴۷۶ء Romulus Augustulus) کے معزول ہونے یعنی ۴۷۶ء کے بعد سے امریکہ کی دریافت تک (۱۴۹۲ء) دس صدی کا زمانہ ایسا گذرا ہے جب حالات بہت تغیر پذیر تھے اور بعض مورخین اس زمانہ کی پہلی چھ صدیوں کو "دورِ تاریکی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور پچھلی چار صدی کے زمانہ کو "قرونِ وسطیٰ" سے درآنحالیکہ اسوقت بھی فنِ تعمیر و مصوری، ادب و فلسفہ میں جو جو ترقیاں ہوئیں وہ بہت کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔

**فحاشی اور اثرات مسیحیت**

جس طرح آجکل کے یورپین بچے بلحاظ قومیت انگریز فرانسیسی۔ یا جرمن پیدا ہوتے ہیں اسی طرح قرون وسطی میں زن و مرد رومن کیتھولک پیدا ہوتے تھے یعنی جس طرح آجکل کوئی "ولد الزنا فوضویت" (Anarchist) اپنے سیاسی خیالات کی وجہ سے خود کو حکومت کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ نہیں سمجھ سکتا اسی طرح وہ لوگ بھی مذہبی پابندیوں سے نہیں بچ سکتے تھے خواہ ان کے دل میں مذہب کی کوئی وقعت ہو یا نہ ہو۔ عیسائی ممالک میں جو معدودے چند غیر مسیحی خصوصاً یہودی اور مسلمان رہتے تھے انھیں کامل حقوق شہریت حاصل نہیں تھے۔ عموماً ان لوگوں سے اس وقت تک رواداری برتی جاتی تھی جب تک جذبۂ حرص و آز یا مذہبی تعصب و پرہیزگاری ان لوگوں کو قتل یا ملک سے خارج نہ کرا دیتی تھی۔

باینہمہ عہد نامۂ جدید (مجموعہ اناجیل) کے پڑھنے سے ہم کو اس بارہ میں بہت ہی کم معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ قرون وسطی کے عیسائی فی الحقیقت کس قسم کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سینگر نے نہایت صحت کیساتھ تحریر کیا ہے کہ :-

"تعلیم مسیحیت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پارسائی پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ حواریین مسیح پارسائی کو ایک اخلاقی اور مذہبی فرض کہتے تھے اور جس جوش و خروش کے ساتھ وہ بت پرستی کے خلاف وعظ کہا کرتے تھے اسی طرح وہ فحاشی کی بھی برائیاں بیان کیا کرتے تھے"

لیکن باینہمہ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی مذہبی جماعت قحبہ خانوں کی بھی سرپرستی کرتی تھی حتیٰ کہ بعض بڑے بڑے مقدس و متبرک مقامات میں بھی قحبہ خانے پائے

جاتے تھے

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اول اول مسیحیت پر "ایشینی" یہودیوں (Essenes) کی تعلیمات اور رسم و رواج کا بڑا اثر پڑا تھا۔ یہ یہودی فرقہ اشتراکیت پسند تھا سب لوگ مل جلکر رہتے تھے۔ اور اپنی زندگی ہاتھ پاؤں کی محنت سے بسر کرتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا یہ لوگ لذات نفسانی سے محترز رہتے تھے حتی کہ اپنی بیویوں سے بھی صحبت نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ان کی پارسائی اور سادہ روی سے ان پر اسرار آسمانی منکشف ہو جائینگے۔ اور اس طرح بہت جلد نزول مسیحا ظہور میں آئیگا۔ درحقیقت یہ لوگ اکثر سن رسیدہ اور معمر ہوتے تھے جن میں جذبات نفسانی کی طاقت زائل ہو چکی ہوتی تھی۔ لیکن یہودیوں کی عام تعلیم یہ تھی کہ شریعت موسوی کے مطابق شادی بیاہ کر کے نسل بڑھاؤ۔

اس شوق میں کہ یسوع مسیح کی آمد ثانی جلد از جلد ظہور میں آجائے ابتدائے زمانہ کے عیسائیوں کے دل ترک ازدواج پر مائل ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ یسوع نے اپنے معتقدین کو تنبیہ کی تھی کہ "جب تک تمہارا زہد و اتقا فقیہوں اور فریسیوں سے فائق نہ ہوگا تم ہرگز بہشت کی سلطنت میں داخل نہیں ہو سکو گے"۔ یہ ایشینی (Essenes) یہودی بھی فریسیوں (Pharisees) کی ایک شاخ تھے جو تمام عوائد و رسوم کے نہایت سختی کے ساتھ پابند تھے۔ یسوع نے جو وعظ پہاڑی پر کہا تھا۔ اس میں یہی نظر آتا ہے کہ:۔ "تم نے سنا ہوگا کہ پرانے زمانے کے لوگوں کی طرف سے کہا گیا کہ تو زنا نہ کر۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ جو شخص کسی عورت کی طرف بدنگاہ سے دیکھیگا وہ اپنے دل میں اس عورت

سے زنا کر چکا "

بایں ہمہ عہد نامہ جدید یعنی مجموعہ اناجیل ، سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع قوانین کی سختی کے خلاف تھے اور اس صورت میں وہ گویا وہ الشینیون کے حلقہ سے باہر تھے ۔ قرون وسطی کے بعض ادارات کے لئے یسوع کی وہ تعلیم جس میں گنہگاروں کو مزید گناہ سے بچانے کی ہدایت کی گئی ہے نہایت اہمیت رکھتی ہے :۔

" تم لوگوں کا کیا خیال ہے ؟ اگر کسی شخص کے پاس سو بھیڑیں ہیں اور ان میں سے ایک کہیں بھٹک جائے ، تو کیا وہ بقیہ ننانوے بھیڑوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں نہیں جاتا اور وہاں گمشدہ بھیڑ کو تلاش نہیں کرتا ؟ اور اگر وہ بھیڑ اسے مل جاتی ہے تو یقیناً میں تم سے کہتا ہوں ، کہ اسے اس بھیڑ کی اتنی خوشی ہوتی ہے کہ ان ننانوے بھیڑوں کی نہیں ہوتی جو گم نہیں ہوئی تھیں "

ہر چند اول اول جو لوگ عیسائی ہوئے تھے ان میں اکثر اسی یہودی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ اور انھیں لوگوں نے مسیحیت کی ابتدائی تاریخ کو نمایاں طور پر رہبانیت کے رنگ میں رنگا تھا ۔ تاہم یہ بات کہ یسوع انھیں الشینی یہودیوں میں سے تھے یا نہیں ایک بحث طلب مسئلہ ہے ۔ بہر حال اس میں کلام نہیں کہ یسوع بدکاری اور فحاشی کے خلاف تھے اور وہ قحبہ خانوں کے قیام کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور جس طرح قدیم زمانہ کے یہودی کسی فاحشہ کا نام سنتے ہی کانپ جاتے تھے ۔ اسی طرح یسوع بھی لرزہ براندام ہو جاتے تھے ۔

یسوع نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ خداوند کی خاطر لوگ اپنی بیویوں کو چھوڑ بیٹھیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ :۔ جو کوئی شخص اپنی بیوی کو حرامکاری کے سوا کسی وجہ

سے چھوڑ دے اور کسی دوسری عورت سے شادی کرے تو وہ زنا کرتا ہے۔ اور جو شخص اس چھوڑی ہوئی عورت سے شادی کریگا وہ بھی زنا کریگا" یہ عبارت یقینی ذو معنی ہے۔ کیونکہ اسکے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ کوئی مرد اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے مگر اسلئے نہیں کہ کسی دوسری عورت سے شادی کرے بلکہ بقیہ عمر مذہبی تجرد میں بسر کرنے کے لئے۔ مگر اس قسم کا نتیجہ نکالنے کے لئے ہمارے پاس کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ مسیح نے یہودی متفکرین کی ایک جماعت کا یہ قول قبول کرلیا تھا کہ جب مرد و عورت باہم ملکر ایک جسم ہوجائیں تو انھیں ہرگز علیحدہ نہ کیا جائے تاکہ ان سے زنا صادر نہ ہو۔

پادریوں نے اپنی رہبانیت و تجرد کے لئے حسب ذیل قول بھی نقل کیا ہے جو مسیح سے منسوب کیا جاتا ہے:۔ "سب مرد اس قول کو قبول نہیں کرسکتے سوائے ان کے جنھیں یہ بات کہی جاتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں بعض لوگ مخنث ہیں جو ماں کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوئے تھے۔ اور بعض مخنث ایسے ہیں جنھیں لوگوں نے ایسا بنا دیا ہے۔ اور ایسے بھی مخنث ہوں گے جنھوں نے بہشت کی بادشاہت کی خاطر خود کو خصی کرلیا ہے۔ اب جو اس قول کو مان سکتا ہو وہ مان لے"

چونکہ قرون وسطی کے عیسائی پادریوں نے بعض خاص صورتوں سے قطع نظر، خود کو جسمانی طور پر کبھی خصی نہیں کیا تھا اسلئے یہ الفاظ ہمارے موضوع کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ رومن کیتھولک کلیسا نے ابتدا ہی سے یہ بات منظور کرلی تھی۔ کہ کوئی مذہبی آدمی بیوی نہ کرے اور جائز بچے نہ جنوائے۔ لیکن اس حکم امتناعی کو صدیوں تک پس پشت ڈالدیا گیا تھا۔ اس "پادریانہ پارسائی"

کا خیال اواخر قرون وسطی میں بالکل فراموش ہوگیا تھا اور کبھی کبھی کسی جدید پیرو یا اولیا کی پیروی کے جوش میں ضرور اُبھر آتا تھا، لیکن جب کلیسائے رومن کیتھولک کیطرف سے اصلاحات مذہبی کا جواب دیا جانے لگا تو یہ خیال پھر اہمیت حاصل کر گیا اور اسکا سلسلہ ابھی تک اُن لوگوں میں جاری ہے۔

جب یسوع سے یہ سوال کیا گیا کہ جو عورت زنا کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے اس سے کیا سلوک کیا جائے تو بقول یوحنا یسوع نے یہ جواب دیا کہ:—

"وہ شخص جو تم میں معصوم یعنی بغیر گناہ کے ہے وہ سب سے پہلے اُس عورت کو پتھر مارے" یہ سنتے ہی تمام الزام لگانیوالے وہاں سے باہر نکل گئے۔ ایک بھی باقی نہ رہا جو اس گنہگار عورت کے خلاف گواہی دے۔ کیا اس زمانہ میں سلطنت یہودیہ کی اصلی حالت یہی تھی؟ کیا ان کے تمام مرد قانون اخلاق کی خلاف ورزی کرنیکے مجرم تھے؟ یا وہ یہ خیال کرتے تھے کہ بڑے سے بڑا نیک و پارسا آدمی بھی کسی نہ کسی طرح گناہ سے ملوث ہوجاتا ہے؟ چونکہ یوحنا کا بیان بالکل روایاتی معلوم ہوتا ہے اسلئے زیادہ قابل توجہ نہیں تاہم قرون وسطی کے نیک عیسائیوں کے نزدیک یہ تمام باتیں سچی اور تاریخی تھیں۔

پولوس کی تعلیم یسوع کی تعلیم سے بہت مختلف معلوم ہوتی ہے، مثلاً وہ خیال کرتا تھا کہ تمام بنی نوع انسان ذلیل ہوگئے ہیں، اسکے نزدیک گناہ اور شریعت موسوی دونوں ایک چیز تھیں۔ اس نے تمام "قوانین ربانی" کی تعمیل کرنیکی کوشش کی لیکن سب میں ناکامیاں پائیں۔ اسی باعث وہ آخر میں یہ خیال کرنے لگا کہ قانون شیطان کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ وہ صرف ایمان پر زور دیتا تھا اور کہتا تھا کہ ایمان

نکوکاری سے بھی افضل ہے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ اگر لوگ مسیح پر ایمان لے آئیں تو انکی روح میں جدید زندگی پیدا ہو جائیگی اور اس طرح ان کے گناہ معاف ہو جائینگے۔ پولوس کے نزدیک اگرچہ یہ تعلیم گناہ کے لئے فتوائے جواز نہیں تھی لیکن بعد کو بہت سے عیسائی اسکے یہی معنی لینے لگے۔

عیسائیوں کے مذہبی اجتماعات میں عورتوں کا رجحان طبیعت کسیقدر یہ ہوتا تھا کہ وہ مردوں کے برابر درجہ حاصل کریں۔ لیکن اس معاملہ میں پولوس کی رائے کچھ اور تھی۔ وہ کہتا ہے :۔" میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر مرد کا سر مسیح ہے اور عورت کا سر مرد ہے۔ اور مسیح کا سر خدا ہے۔ جو مرد اپنا سر ڈھانک کر عبادت کرتا ہے وہ اپنے سر کو بے عزت اور ذلیل کرتا ہے۔ اور ہر عورت جو اپنا سر ڈھکے بغیر عبادت کرتی ہے وہ اپنے سر کو ذلیل کرتی ہے"

پولوس نے مردوں کو یہ بھی سکھایا کہ وہ عورتوں کو ہاتھ نہ لگائیں اور بچے نہ پیدا کریں کیونکہ گوشت پوست کی تمام چیزیں جلد فنا ہو جائینگی۔ صرف روحانی چیزیں باقی رہجائینگی۔ شادی بیاہ محض اس خیال سے جائز قرار دیا گیا تھا کہ فحاشی بند ہو جائے۔ چنانچہ پولوس کہتا ہے کہ :۔" دوزخ میں جانے سے یہی بہتر ہے کہ انسان نکاح کرلے" حالانکہ اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ سب لوگ ناکتخدا اور پارسا بنے رہیں۔

عہد نامہ جدید درحقیقت مختلف مصنفین کی آراء کا مجموعہ ہے جو مطمح نظر اور تجربہ میں بہت کچھ فرق رکھتے تھے۔ اور اسی لیے اس میں بہت سی عبارتیں ایسی ہیں جنکے کئی کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ اور ہر قسم کی تعلیم کی تائید و حمایت میں بائبل کے

اسناد مل جاتے ہیں چنانچہ پولوس کے ایک خط میں لکھا ہے کہ :—

"میں نے تمکو ایک خط بایں ہدایت لکھا تھا کہ تم بدکاری کی صحبت میں نہ رہو۔ یہی نہیں کہ تم اس دنیا کے بدکاروں کے ساتھ نہ رہو بلکہ بندگان حرص و آز، بت پرستوں اور استحصال بالجبر کرنیوالوں کی صحبت میں بھی نہ رہو۔ ورنہ تم کو اس دنیا سے نکل جانا ہو گا۔"

گرسینٹ اگسٹائین کہتا ہے کہ :— "کسبیوں کے پیشہ کو نہ روکو ورنہ شہوت رانیاں تمام سوسائٹی کو تہ و بالا کر دیں گی۔"

۳۹۷ء میں کلیسائے مسیحی کی ایک مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک عیسائی کیلئے یہ بات مناسب ہے کہ وہ کسی ایک عورت کے ساتھ رہے خواہ وہ عورت اسکی بیوی ہو یا نہ ہو۔ آگسٹائین کا خیال یہ تھا کہ کسی مسیحی گرجا میں کسبی کو نہ آنے دیا جائے تاوقتیکہ وہ اپنا پیشہ ترک نہ کر دے۔ لیکن اس معاملہ میں قرون وسطی کے بہت سے علمائے دینیات نے اسکا تتبع نہیں کیا۔ پھر بھی سولھویں صدی میں ٹرنٹ کی مجلس نے اسی قسم کا حکم دیا۔

پانچویں صدی میں ایلویرہ (Elvira) کی مجلس نے کسبیوں اور قوادوں کو خارج از دین کر دیا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی اس مجلس نے یہ حکم بھی دیا کہ جو کسبیاں کسی عیسائی سے نکاح کر لیں انھیں عشاء ربانی میں شامل ہونے دیا جائے۔ اسکے بعد کی بہت سی مجلسوں نے ان کے وجود کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ ۱۴۳۱ء میں بمقام باسلے (Basle) ایک مقتدر دین مسیحی نے ایک مضمون پڑھا جسمیں یہ حجت پیش کی کہ یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے لوگوں کے اخلاق حسنہ قائم رہ

سکتے ہیں۔ اسکے بعد کی صدی میں یعنی دورِ جدید کے آغاز میں میلان کی مجلس نے ان کو حکم دیا کہ وہ ایک خاص قسم کا لباس پہنا کریں جس پر سنہری یا روپہلی کلابتوں یا ریشم کی کوئی کشیدہ کاری نہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ ایک محلہ میں رہا کریں۔ گرجاؤں کے قریب بود و باش اختیار نہ کریں۔ اور ہوٹلوں اور سراؤں میں بھی نہ آئیں۔

واضح ہو کہ قرونِ وسطیٰ میں کلیسائے مسیحی اکثر ایسے معاملات سے تعلق رکھتا تھا جنکا تعلق فی زمانہ صرف دنیاوی حکومت کے ساتھ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی عام طور پر نکاح و طلاق فحاشی و بدکاری کے مقدمات کی سماعت مذہبی عدالتیں کرتی تھیں۔

عیسائیوں میں بعض ایسے فرقے پائے جاتے تھے جن پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مذہب کے نام سے سیہ کاریاں کرتے ہیں۔ چنانچہ نکولائی (Nicolaites) فرقہ کے عیسائی یہ کہتے تھے کہ جو لوگ بخشش کے طلبگار ہوں انکے لئے گناہ کرنا لازم ہے۔ پیروانِ آدم (Adamites) اور مریدانِ قابیل (Cainites) کی طرح یہ بھی مذہبی اغراض کے لئے اشتراک فی النسواں کے قائل تھے۔ بہت سے فرقے اس امر پر اصرار کرتے تھے کہ جب کسی مرد یا عورت کو عوام کے سامنے بپتسمہ دیا جائے یا جب کوئی مرد یا عورت عبادت میں مصروف ہو تو اسے لازم ہے کہ کپڑے اتار ڈالے۔ شرم و حیا کی بھینٹ چڑھانیکا عقیدہ جو بہت سے مشرقی مذاہب میں اسقدر اہم تھا وہ بھی وقتاً فوقتاً بندگانِ مسیح میں پیدا ہو جاتا تھا۔

جب یورپ میں دینِ مسیحی پھیلا تو زمانۂ بت پرستی کے بعض عیاش

دیوتاؤں کو بھی فراموش نہیں کیا گیا اور ان میں سے بعض کو اولیاء اللہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ جو دن ان کی پوجا کے لئے مقرر تھے ان میں "لنگوں" کے جلوس نکالے جاتے تھے۔ سینٹ ویلنٹائن (St. Valentine) کو عشق و محبت کا سرپرست سمجھکر اسکی پرستش کی جاتی ہے۔ لیکن یہ تحقیقات نہیں کرتے کہ اس کی ابتدائی زندگی کس طرح گزری تھی۔ قرون وسطی میں تمام یوروپ کے اندر پرپاپس (Priapus) دیوتا کے بت موجود تھے جسکا حال اس سے قبل کسی جگہ لکھا جا چکا ہے ان تقریبوں میں نہایت فحش ناچ گانے "مقدس کنواری" (مریم صدیقہ) کے نام سے ہوتے رہتے تھے۔ بعض عیسائی قومیں ایسی بھی تھیں جن میں ایام بت پرستی کے دیوتاؤں کی اُنکے اصلی ناموں کے ساتھ پوجا کی جاتی تھی چنانچہ وینس، "بن دیویاں" اور "جل دیویاں" نہ صرف عیسائی شعراء کی نظموں بلکہ عوام کے خیالات میں بھی بدستور موجود تھیں۔

قرون وسطی کی کسبیاں عام طور پر "مریم کنواری" کی پرستش کرکے دعا مانگا کرتی تھیں کہ رات کو ان کی خوب کمائی ہو۔ یہ اس غرض کے لئے مذہبی تعویذ گنڈے بھی استعمال کرتی تھیں

قرون وسطی میں اس امر کی بھی کوشش کی گئی کہ ان عورتوں سے توبہ کرائی جائے چنانچہ تیرھویں صدی میں ایک جماعت ان کی ملک جرمنی میں ایسی قائم ہو گئی تھی اور اسکا نام "تائبات سینٹ مریم میگڈیلینی" تھا۔ اس طبقہ کی بیشمار "خواہروں" کے لئے تمام جرمن ریاستوں میں بہت سی "زنانہ خانقاہیں" تعمیر کی گئی تھیں جنکا خرچ کچھ تو ان عورتوں کی بھیک سے اور کچھ مختلف اسقفوں کے

عطیات سے چلتا تھا۔

ان توبہ خانوں میں کام کرنے پر بہت زور دیا جاتا تھا اور اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا کہ ان "بہنوں" کی طبیعت لذات نفسانی کی طرف مائل نہ ہو۔ جہاں ایک مرتبہ کوئی کسبی تائب ہو کر داخل خانقاہ ہو جاتی تھی تو پھر اسے بعد اختتام سال یا بعد مدت مقررہ ابتدائی خانقاہ سے باہر نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس طبقہ میں دوشیزہ لڑکیاں اور دیگر عورتیں بھی جنھوں نے کبھی یہ پیشہ نہیں کیا تھا داخل کر لی جانے لگیں اور ان عورتوں کو بجائے "تائبات یا خواہران میکڈیلینی" کے "سفید بہنیں" کہنے لگے۔

تیرھویں صدی میں ملک فرانس میں بھی "بنات اللہ" (Daughters of God) کا ایک طبقہ قائم کیا گیا۔ اسکے اغراض و مقاصد بھی یہی تھے کہ کسبیوں کو مذہبی زندگی میں لایا جائے۔ تمام یوروپ میں جگہ جگہ ایسے راہبہ خانے تعمیر ہو گئے تھے جن میں وہ گنہگار عورتیں داخل ہوتی تھیں جو تارک الدنیا ہونا چاہتی تھیں۔

بہت سی کسبیاں ایسی پناہگاہوں یا مکانوں میں داخل ہو جاتی تھیں جو خصوصیت کے ساتھ مذہبی نوعیت نہیں رکھتے تھے۔ ان مکانوں میں قدرتاً ایسی عورتیں آکر داخل ہوتی تھیں جنکے لئے سن رسیدگی کے باعث کام چلانا مشکل ہو جاتا تھا۔ میکڈیلینی خانوں کا خرچ وہ عیسائی اُٹھاتے تھے جو خود کو یسوع مسیح کے اسوۂ حسنہ کا پابند سمجھتے تھے۔ بعض اوقات مذہبی جوش میں مبتلا ہو کر ان گھروں میں کسبیاں بھی داخل ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب وہ اس زندگی کی یکسانیت سے گھبرا جاتی تھیں تو پھر باہر نکلکر اپنا پیشہ اختیار کر لیتی تھیں۔ ان باتوں کی وجہ سے بعض ادارات

ایسی کسبیوں کو اپنے ہاں داخل نہیں کرتے تھے جو پہلے داخل ہو کر نکل گئی تھیں، بہت سی عورتیں ایسی بھی پھرتی تھیں جو یہ کہکر بھیک مانگتی تھیں کہ وہ اپنی گنہگارانہ زندگی ترک کر دینا چاہتی ہیں اسی کے ساتھ فحاشی سے بھی اپنی آمدنی میں اضافہ کر لیتی تھیں۔

قحبہ خانوں کے سب سے اچھے سرپرست عموماً پادری اور راہب لوگ خیال کئے جاتے تھے۔ قرون وسطیٰ کے یوروپ میں شہروں اور قصبوں کے اندر ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور غالباً ان میں بہت ہی کم ایسے ہونگے جو حقیقی طور پر راہبانہ زندگی بسر کرنے پر مائل تھے۔ اور چونکہ یہ لوگ جائز طور پر شادی کر کے اپنی خواہشات نفسانی کو پورا نہیں کر سکتے تھے اسلئے یا تو وہ گھروں میں کوئی عورت ڈال لیتے تھے یا فحاشی کرتے تھے۔ بہت سے مقامات میں ایسے قانون رائج تھے جنکی بنا پر کوئی مذہبی آدمی قحبہ خانوں میں داخل نہ ہو سکتا تھا لیکن یہ لوگ بجائے وہاں جانے کے خود وہاں کی عورتوں کو اپنے پاس بلا لیتے تھے۔

گناہوں سے نجات پانے کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت سمجھی جاتی تھی کہ گنہگار اپنے بدن پر کوڑے کھائے۔ اس رسم سے پادری صاحبان کو کافی موقعہ مطلب برآری کا مل جاتا تھا۔ جو پادری "اقرار معصیت" سنتا تھا وہ اس بات پر ہمیشہ زور دیتا تھا کہ خفیف سے خفیف گناہ کیلئے بھی جسم پر تازیانے کھائے جائیں۔ عورتوں کا جسم چونکہ نازک ہوتا ہے اسلئے قحبی عموماً ننگا نگوں یا کمر کے پر گوشت حصہ پر لگائی جاتی تھی اور چونکہ سزائے تازیانہ سے گنہگار کی تذلیل مقصود ہوتی تھی، اسلئے بعض اوقات جسم سے کپڑا دور کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔

۲۹۹

خانقاہوں اور راہبہ خانوں میں راہبوں اور "کنواریوں" پر نہ صرف بدکاری کی وجہ سے کوڑے پڑتے تھے بلکہ محض "جلال ربانی" ظاہر کرنے کے لئے بھی ایک دوسرے پر بھی کوڑے برساتے تھے۔ گیارہویں صدی میں ایک راہب ڈامیانی (Damiani) نے تازیانہ زنی کے لئے ایک خاص مذہبی طبقہ قائم کیا تھا جس میں ہر طبقہ کے آدمی شامل ہو کر اپنے جسموں پر کوڑے مارتے ہوئے بصورت جلوس نکلتے تھے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی مصیبت مثلاً قحط یا وبا نازل ہوتی تھی تو ہزاروں آدمی ان مظاہروں میں شریک ہو جاتے تھے اور بڑی بیدردی سے ایک دوسرے پر کوڑے برساتے تھے۔ یہ لوگ کوڑے کھاتے کھاتے کچھ ایسے مشاق ہو جاتے تھے کہ وہ اپنے جسموں پر ہر قسم کی سزا برداشت کر لیا کرتے تھے اور جب ان لوگوں کا مذہبی جوش بھڑک اٹھتا تھا تو وہ یہودیوں اور مفروضہ ملحدوں کو مار ڈالتے تھے۔

اسی سلسلہ میں فرقہ مریمیہ بھی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ قرون وسطیٰ کے بہت سے متفکرین ایسے گذرے ہیں جو عورتوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ وہ پولوس کے ہمخیال تھے کہ عورت مرد سے کم درجہ پر ہے اور اسکی یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ابتدائی گناہ کی ذمہ دار حوّا تھیں۔ اُسوقت عورتوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا ایک ملکوتی اور دوسری شیطانی۔ یعنی عورتیں یا تو شیطان کا آلۂ کار ہیں یا مریم کی کنیزیں ہیں۔ کسبیاں قسم اول میں اور راہبہ عورتیں قسم دوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ جو عورت کسی کی معشوقہ ہوتی تھی وہ تو گو یا کنیز مریم نظر آتی تھی مگر گھر کی غریب بیوی بیچاری شیطانی قوتوں کی مالک ٹھہرائی جاتی تھی۔

Digitized by commisionedwriting.com for the IdeaMines collective.

الغرض ان خیالات میں خوب مضحکہ انگیز ترقی ہوئی۔ عام خیال یہ تھا کہ عشق و محبت ایک روحانی اور آسمانی جذبہ ہے۔ اور نکاح ایک مقدس معاہدہ ہے لہذا اسکا تعلق کسی ناپاک شہوت نفسانی یا کسی ایسے جذبہ سے نہ ہونا چاہیے جسکی بنیاد خواہشات جسمانی پر ہو۔

بہت سے شعراء کا خیال یہ تھا کہ عورت کو اگر کوئی چاہے تو فقط دوسرے چاہے۔ لہذا کسی دوسرے مرد کی بیوی پر عاشق ہونا اور عاجزانہ طور پر اُس کی خدمت کرنا مناسب اور اچھا سمجھا جاتا تھا۔ جرمنی اور فرانس کے شعراء اس بات کی تصویر نہایت نفاست اور عمدگی سے کھینچتے تھے کہ کوئی بھلا آدمی کسی حسینہ کے سامنے دست بستہ دو زانو بیٹھا ہے۔ اسکی محبت قطعی بے لوث ہے، اور وہ اس مہ جبین کی ہر خدمت غلاموں کی طرح بجالاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ایک کھیل تھا اور اصلی مقصد یہ تھا کہ عورت کا شوہر جب تک کوئی ناشائستہ حرکت نہ دیکھے اس وقت تک اس قسم کی عشقبازی پر معترض نہ ہو۔ بہ ظاہر اس طریقہ پر عورت کی پرستاری قطعی بے لوث اور صحیح سمجھی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہی "عشقبازی" طبقہ امراء میں زناکاری بنگئی۔

ہر چند یہ حقیقی "عشقبازی" بڑے لوگوں کا کھیل تھا۔ لیکن اسکا اثر طبقہ اوسط اور کسانوں پر بھی ہوا۔ یعنی مرد اپنی عورتوں کو بخیال ادب آموزی زدوکوب کرتے تھے اور پھر خود ہی "مقدس کنواری" یا وینس (عشق و محبت کی دیوی) کے نام سے اپنی معشوقہ و دلنواز کے ہاتھوں جوتیاں کھاتے تھے۔ قرون وسطی میں رفتہ رفتہ یہ خاص فن بنگیا تھا اور تکلیف و تذلیل ہمیشہ تازیانہ ہی کے ذریعہ سے نہ ہوتی تھی

بلکہ اظہار عشق و محبت کا ایک معمولی طریقہ یہ بھی تھا کہ مرد اپنی محبوبہ کا ایک پھٹا ہوا کثیف کرتہ خود پہن لیتا تھا۔

قرون وسطی کی سحر و ساحری میں بھی مختلف قسم کے جنسی یا شہوانی عناصر شامل تھے۔ اول ہر وہ عورت جسے دیکھکر جذبات نفسانی مشتعل ہو جاتے تھے اس میں شیطانی قوتیں سمجھی جاتی تھیں۔ عام خیال یہ تھا کہ انسان کا جسم ناپاک اور اسکی روح پاک ہے۔ لہذا جس عورت کو دیکھکر شہوت بھڑکے وہ ضرور بالضرور شیطان کا آلۂ کار ہے۔ جب کوئی مقدس راہب کسی عورت کو دیکھ لیتا تھا تو فوراً بھاگ جاتا تھا تاکہ شیطان کے مکر و فریب میں نہ پھنس جائے۔ اس زمانہ میں بھی یونان کے ایک جزیرہ میں راہبوں کا ایک صومعہ ہے جہاں عورت کو اندر جانے نہیں دیا جاتا۔ اور کچھ دن پیشتر تو یہ حالت تھی کہ بلیاں اور دوسرے مادہ جانور اس جزیرہ سے باہر نکال دیئے جاتے تھے۔

قرون وسطی میں جن سحر پیشہ لوگوں پر مقدمات چلاکر انھیں زندہ جلا دیا گیا تھا ان میں مرد جادوگر بہت کم تھے۔ ایسی بڑھیا عورتوں سے جو کروہ صورت ہوں، لوگ بہت ڈرتے تھے کیونکہ انکی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ دور ہی سے لوگوں کو زہر دیدیتی ہیں، چھری مار دیتی ہیں، اور لوگوں پر موہنی کر کے انھیں دام محبت میں گرفتار کرلیتی ہیں۔ ایسی عورتیں سوسائٹی کے اس طرز عمل سے واقعی اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھنے لگتی تھیں اور رات کو جنگلوں میں جمع ہو کر جلسہ کرتیں، اور مختلف قسم کی خلاف وضع فطری حرکتیں کرتیں۔ اس زمانہ میں بہت سی عورتوں کو جادوگرنی سمجھکر جو قطعی بے ضرر تھیں زندہ جلا دیا گیا۔

۳۰۲

گرچہ یہ بتانا دشوار ہے کہ سحر و ساحری اور حرامکاری میں اصلی تعلق کیا تھا لیکن جو کچھ بھی تعلق ہوگا وہ نہایت اہم ہوگا۔ ڈاکٹر سینجر کا خیال ہے کہ پادری اور راہب لوگ اکثر ہفتہ میں ایک دن ناشائستہ حرکات کے لئے وقف کر دیتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ ان محافل میں جاکر کسبیاں بھی شہوت رانی کے مختلف طریقے سیکھتی تھیں اور دوسروں کو سکھاتی تھیں۔

قرون وسطی کے اندر دیووں اور عفریتوں کا جو عقیدہ تھا بسا اوقات اس سے بھی خوب مقصد برآری ہوتی تھی۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ رات کے وقت لوگوں کے گھروں میں عفریت آتے ہیں اور اکثر دوشیزہ لڑکیوں سے ملتفت ہوکر انھیں حاملہ کر دیتے ہیں۔ درآنحالیکہ یہ عفریت انسانوں کے علاوہ اور کوئی نہ ہوسکتے تھے

## مجلسی و معاشری حالات

یوروپ میں قرون وسطی کی زندگی کا مدار زیادہ تر زراعت و فلاحت پر تھا۔ اگرچہ بعض مصنوعات میں بھی کافی ترقی ہوگئی تھی لیکن یہ چیزیں عموماً چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں بنتی تھیں۔ لوگ گاؤں ہی میں زیادہ تر بود و باش رکھتے تھے۔ اور عموماً ایک ہی مزرعہ میں ضرورت کی تمام چیزیں پیدا کرلی جاتی تھیں۔

کسان لوگ اپنے تعلقہ دار یا زمیندار کو اپنا محافظ و نگہبان خیال کرتے تھے اور اس حفاظت کے معاوضہ میں ہر ہفتہ دو تین دن تعلقدار کی خدمت مفت کیا کرتے تھے۔ اس خدمت کے سلسلہ میں انکا ایک فرض یہ بھی تھا کہ جب وہ اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے تھے تو تعلقہ دار کو ایک خاص رقم ادا کرتے تھے۔ یہ رقم غالباً زمیندار کے اس حق کا معاوضہ تھا جو عروس کی شب اولیں پر اسکو حاصل تھا

رفتہ رفتہ زمینداروں کی قوت اسقدر بڑھ گئی کہ وہ غریب کسان کی لڑکی سے بھی لطف حاصل کرتے اور رقم بھی وصول کر لیتے۔

چونکہ اس وقت فن زراعت نہایت ہی ابتدائی حالت میں تھا اسلئے ان بیچارے زرعی غلاموں کے پاس شاذ و نادر ہی اتنی دولت جمع ہوتی تھی کہ وہ آزادی حاصل کر سکیں۔ علاوہ ازیں ان کی اراضی کا کچھ حصہ (خصوصاً جنگل اور چراگاہ) مشترکہ ہوتا تھا اور ان کا بہت سا وقت میدان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں لگ جاتا تھا۔

یہ اپنی غربت کی وجہ سے نہ سامان تعیش پر کچھ صرف کر سکتے تھے، نہ کہیں باہر سیر و سیاحت کے لئے نکلتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ انکی اخلاقی حالت شہری لوگوں سے بہتر ہوتی تھی۔

قرون وسطیٰ کے اوائل میں یورپ کے اندر معدودے چند شہر تھے۔ اور جو تھے بھی تو ان میں سے اکثر رومیوں کے بسائے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ جب کاروبار اور تجارت کو ترقی ہوئی تو بہت سے مقامات نے بڑھتے بڑھتے اہمیت حاصل کر لی۔ ورنہ پندرھویں صدی عیسوی تک یورپ بھر میں ایک درجن سے بھی کم ایسے شہر موجود تھے جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زائد ہوگی۔ اسوقت لندن کی آبادی ۳۵ ہزار۔ وائنا کی ۵۰ ہزار خیال کی جاتی تھی۔ پیرس اور اطالیہ کے بعض شہر کسیقدر بڑے تھے۔ اور مشرق میں قسطنطنیہ اور بعض دیگر شہر واقعی بڑے شہر تھے جن کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ لہذا ان بڑے شہروں کی معاشرتی حالت اُن شہروں سے قطعی مختلف تھی جن سے اس وقت ہمارا

خاص تعلق ہے۔

مغربی یورپ کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں سوداگروں اور اہل حرفہ کی پنچائتیں خاص اختیارات رکھتی تھیں اور جن لوگوں کی شہر کے اندر دوکانیں ہوتی تھیں وہ ان میں سے کسی نہ کسی جماعت سے ضرور تعلق رکھتے تھے۔ سوداگروں کی پنچائتیں مذہبی و معاشرتی فرائض انجام دیتی تھیں اور بازار کا اہتمام بھی انھیں کے سپرد تھا۔

تقریباً ہر پیشہ اور حرفہ میں یہ دستور تھا کہ چند سال کے لئے لڑکوں کو معاہدہ پر رکھ لیا جاتا تھا اور ان کو کوئی اجرت نہیں دی جاتی تھی۔ میعاد شاگردی وامید واری گذرنے کے بعد وہ لڑکا روزانہ کچھ اجرت پانے لگتا تھا۔

پھر چونکہ عموماً اجرتی کاریگر کو اسقدر آمدنی نہ ہوتی تھی کہ بیچارہ شادی کرکے بال بچوں کی پرورش کرسکے، اسلئے ان میں سے اکثر تمام عمر ناکتخدا رہتے تھے۔ اور یہی وہ لوگ تھے جن سے تجربہ خانوں کی رونق قائم تھی۔ یہ لوگ صفائی پسند اور پاکیزہ طبع نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ کیچڑ میں لوٹنے اور ہر قسم کی بدبو اور عفونت میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ بجز اسکے جو شرابخانوں یا عام قحبہ خانوں میں حاصل ہوسکے ان کے لئے عیش و تفریح کا کوئی سامان نہ تھا۔

قرون وسطیٰ میں طویل العمری کے لئے جسمانی طور پر طاقتور ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں نے حفظان صحت کا نام تک نہ سنا تھا۔ ملکوں ملکوں میں وبائیں پھیل جاتی تھیں۔ اور لوگ باقاعدہ جنگوں یا آپس کے جھگڑوں میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ اسی لئے عموماً مردوں سے عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ اور چونکہ مذہبی عقائد کی بنا پر یا اقتصادی مشکلات کے خیال سے اکثر مرد مجرد رہتے تھے اسلئے عورتوں

# ۳۰۵

کی بھی بڑی تعداد کو مجبوراً ناکتخدا رہنا پڑتا تھا۔ پھر بعض عورتیں یا تو ترک دنیا کر کے کسی خانقاہ میں داخل ہو جاتی تھیں یا پیشہ اختیار کر لیتی تھیں۔ قرون وسطی کے کارخانوں یا شرابخانوں میں عورتوں کو اجرتیں بھی کم ملتی تھیں۔ ادنیٰ درجہ کی عورتوں کی عصمت و عفت کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی تھی اور ہر چند زنا سب سے بڑا گناہ خیال کیا جاتا تھا، لیکن یہی گناہ عام تھا۔

قرون وسطی کے قحبہ خانوں کو جن لوگوں سے زیادہ آمدنی ہوتی تھی وہ تین جماعتوں سے متعلق ہوتے تھے۔ راہبوں کی جماعت۔ کاریگروں کا طبقہ۔ اور طلبہ ہر چند اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ طلبہ بچے رہیں اور اوقات مقررہ پر انکو اپنی اقامتگاہوں میں موجود رہنا پڑتا تھا۔ مگر یہ تمام احتیاطیں انھیں فحاشیوں سے باز نہ رکھ سکتی تھیں۔

قرون وسطی کے لوگوں میں بعض قحبہ خانوں کے خلاف تھے اور بعض انکو اخلاقی لحاظ سے ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن پیشہ ور عورتوں کو عام طور پر ذلیل سمجھنے کے باوجود اتنی اجازت تھی کہ وہ تقریبوں میں شریک ہو کر اپنے تحائف پیش کریں۔ کبھی کبھی بادشاہ اور امرا بھی قحبہ خانوں کو عزت بخشتے تھے اور جب کوئی معزز مہمان آجاتا تھا تو اسکو اجازت ہوتی تھی کہ وہ جس قحبہ خانہ میں چاہے بغیر روک ٹوک چلا جائے۔ شہنشاہ سجسمنڈ (Sigismund) جو پندرھویں صدی میں گذرا ہے اسکی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جس شہر میں گیا وہاں کے قحبہ خانہ کی ضرور سیر کی۔

پیشہ ور عورتوں کو دوسری شریف عورتوں سے ممیز کرنے کے لئے یہ قاعدہ مقرر تھا

کہ پیشہ ور عورتیں زیور اور قیمتی لباس پہنکر پبلک میں نہ نکلا کریں۔ انکے لئے حکم تھا کہ وہ کوئی مقررہ نقاب ٹوپی، یا عبا کسی مخصوص وضع قطع کی یا کوئی مقررہ نشان استعمال کریں۔ یہودیوں، بدعتی عیسائیوں، جذامیوں اور دیگر ذلیل قوموں کے افراد کو بھی عام گذرگاہوں یا بازار میں ایک خاص قسم کا نشان استعمال کرنا پڑتا تھا۔

ملکی قوانین کی رو سے اس طبقہ کے لوگوں کو چوروں اور آوارہ لوگوں کی قسم میں رکھا جاتا تھا۔ اور جو سرکاری ملازم قحبہ خانوں کی حفاظت کیا کرتے تھے وہ اجنبی عورتوں کی طرف اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات ان کو پکڑکر انکا منھ کالا کرتے اور کوڑے مار کر نکال دیتے تھے۔

قرون وسطی کی مذہبی خانقاہیں چونکہ فحاشی میں بہت بدنام ہوگئی تھیں اور وہاں کسی پارسا لڑکی کا پہونچ جانا گویا بے آبرو ہوکر نکلنا تھا۔ اسلئے کلیسا کی طرف سے ان کے خلاف احکام امتناعی جاری کئے گئے لیکن یہ سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔

مذہبی تہواروں میں بھی کسبیاں بڑا حصہ لیتی تھیں۔ بعض اوقات مقامی حکام اپنے مہمانوں کے سامنے انکا رقص دیکھتے تھے اور اسکے عوض میں انھیں کھانا شراب اور پھولوں کے ہار دیئے جاتے تھے۔ یہی حال قدیم روما میں تھا۔ بعض اوقات قرون وسطی کے لوگ شادی بیاہ کی تقریب میں مہمانوں کی تفریح کے لئے کسبیاں بھی اجرت پر بلا لیا کرتے تھے۔

جب کوئی بادشاہ یا اسقف اپنی قلمرو میں دورہ کرتا تھا تو اسکے ہمراہ متعدد کسبیاں بھی ہوتی تھیں۔ اور مقدس سلطنت روم کے زمانہ میں جب امراء جمع

ہوتے تھے تو کسبیاں ان سے پہلے ہی موقعہ پر پہونچ جاتی تھیں۔
مذہبی مجاہدین اور سپاہیوں کے گرد بہت سی کسبیاں جمع ہو جاتی تھیں اور کوئی فتح حاصل ہوتی تھی تو فوجیوں کو شراب اور عورت بطور مال غنیمت مفت دیجاتی تھی۔

قرون وسطی کی آخری دو تین صدیوں میں پبلک حماموں نے بھی قحبہ خانوں کا درجہ اختیار کر لیا تھا۔ انگلستان میں تو بہت پہلے سے حماموں کے اندر کسبیاں رکھی جاتی تھیں اور غالباً یہ رواج رومیوں نے جاری کیا تھا۔ لیکن براعظم یورپ میں یہ رواج اسوقت جاری ہوا جب صلیبی جنگوں کے بعد بہت سے لوگ بازنطینی اور عربی تمدن دیکھکر واپس آئے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ یورپین کسبیوں کو مشرقی سلطنت روم، عرب اور شمالی افریقہ میں فروخت کر دیا جاتا تھا اور وہاں سے عربی کنیزیں وینس اور خود اکے قحبہ خانوں کے لئے خرید کر لائی جاتی تھیں۔ مغربی شہروں میں بردہ فروشی نے اسقدر اہمیت کہیں اختیار نہیں کی تھی جسقدر قسطنطنیہ، قاہرہ اور بغداد میں

اس عہد کی تقریباً تمام کسبیاں جاہل ہوتی تھیں۔ اور بعض اوقات ایسے ملکوں میں بھیجدی جاتی تھیں جہاں کی زبان وہ بہت کم سمجھتی تھیں۔ یہاں انکو پورے قانونی حقوق حاصل ہوتے تھے۔ اور انکا مالک ان سے جو چاہے کام لے سکتا تھا۔

فحاشی سے شراب کا تعلق ہمیشہ رہا ہے اسی لئے قرون وسطی کی کسبیاں پہلے شرابخانوں ہی میں جمع ہوا کرتی تھیں۔ لیکن جب قحبہ خانے جداگانہ قائم ہو گئے

توشہ خانوں سے انکا تعلق کم ہوگیا۔ قدیم زمانہ کی طرح اوائل قرون وسطی میں بھی قحبہ خانے اکثر بازاروں ہی میں ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کو وہاں سے ہٹا کر نواح شہر میں جگہ دیگئی رات کے وقت ان کے مکان کے دروازے پر ایک سرخ لالٹین لٹکا دیجاتی تھی اور دن میں کوئی خاص نشان نصب کر دیا جاتا تھا۔ ان علامتوں کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوں وہ بھی دیکھکر پہچان لیں کہ یہ بازار کس قسم کا ہے۔

بعض اوقات یہودیوں کے محلہ میں قحبہ خانے بنا دیے جاتے تھے جس سے یہ لوگ سخت چلتے تھے۔ یہودیوں کو ان قحبہ خانوں میں جانے کی اجازت نہیں تھی بہت سے اضلاع میں کسی یہودی کا عیسائی عورت سے یا عیسائی کا یہودن سے ملتفت ہونا اسقدر سخت جرم قرار دیا گیا تھا کہ مرتکبین کو زندہ جلا دیا جاتا تھا اسی وجہ سے یہودیوں کو حکم تھا کہ وہ کوئی امتیازی نشان استعمال کریں تاکہ شناخت ہو سکے۔ قرون وسطی میں یہودیوں کی شادیاں اوائل عمر میں ہی ہو جایا کرتی تھیں اسلئے گمان غالب ہے کہ بہت ہی کم یہودی ایسے ہوتے ہونگے جو اپنی بیویوں کے سوا کسی غیر عورت سے واسطہ رکھتے ہونگے۔

قرون وسطی کے اواخر میں پبلک قحبہ خانوں کے نظام میں تغیر و تبدل پیدا کر نیکا میلان شروع ہو گیا تھا چنانچہ اطالیہ اور جنوبی فرانس میں چند قحبہ خانے نہایت پُر تکلف طیار کئے گئے جن میں خوبصورت اور شاندار حمام بھی تھے۔

اور میونسپلٹیوں نے بہت سے قحبہ خانے اپنے ہاتھ میں لے لیے جنکا انتظام وہ اپنے تنخواہ دار ملازموں سے کرتے یا ٹھیکہ پر دیدیتے۔ بہت سے شہروں میں

۳۰۹

قحبہ خانوں سے باہر جو پرائیویٹ ٹھکانے ہوتے تھے ان پر سخت ٹیکس لگائے جاتے تھے تاکہ سرکاری قحبہ خانوں کو اُن سے نقصان نہ پہونچے۔

چونکہ قحبہ خانوں میں رہنے والی عورتیں سرکاری ملازم ہوتی تھیں اور حکومت کو ان کی کمائی کا ایک حصہ ملتا تھا اسلیئے ان کو بعض رعائتیں بھی حاصل تھیں اور پولیس ان کی پوری حفاظت کرتی تھی قحبہ خانوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات بھی مقرر تھے اور احکام میں یہ صراحت بھی ہوتی تھی کہ کن کن لوگوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ حکومت کی طرف سے ایسے قواعد وضوابط بھی رائج تھے جن کے ڈر سے کوئی شخص دھوکا دیکر کسبیوں کی اجرت مار نہیں سکتا تھا اور نہ مالک قحبہ خانہ کے نامعقول مطالبات کی وجہ سے کسبیوں کے کپڑے فروخت کیے جا سکتے تھے۔ ارباب حکومت اسکی بھی نگرانی کرتے تھے کہ انکو دونوں وقت کھانا معقول دیا جاتا ہے یا نہیں۔

بہت سی میونسپلٹیوں نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا تھا کہ شہر کی کوئی دوشیزہ لڑکی قحبہ خانوں میں داخل نہ کی جائے۔ لیکن قحبہ خانوں کے مالک کسی دوسرے شہر سے خوبصورت لڑکیاں لا سکتے تھے۔

قرون وسطی میں چالیس برس کی عمر والوں کو سالخوردہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیئے قحبہ خانوں میں کوئی عورت اس عمر کی نہیں رہ سکتی تھی۔

اگرچہ ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن گرجاؤں میں آنیکی اجازت انکو بلجاتی تھی۔ اور گرجا کے لیئے موم بتیاں خریدنے اور عشاء ربانی کے مصارف کے لئے ان سے اکثر چندہ بھی لیا جاتا تھا۔

قرون وسطی کے لوگ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ وہ گندگی اور توہمات میں مبتلا ہیں۔ جب کام ہوتا تھا تو وہ کر لیتے تھے لیکن فرصت کے وقت وہ نہایت بدتمیزی سے لہو و لعب اور عیش و عشرت میں مشغول ہو جاتے تھے اور جانوروں سے زیادہ انکی حیثیت نہ رہتی تھی

اگرچہ علماء و فضلا، کسبیوں کو ادنیٰ مخلوق قرار دیتے تھے۔ لیکن پھر بھی گرجاؤں میں ان کی نشست مقرر تھی اور تہواروں میں پارسا لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاتی تھیں۔

ایک بات پبلک قحبہ خانوں میں یہ بھی ہوتی تھی کہ کسبیوں کو دن بھر میں کوئی نہ کوئی مقرر کام ضرور کرنا پڑتا تھا، مثلاً سینا پرونا یا کاتنا۔

ہر چند اس امر کی بہت کوشش ہوتی تھی کہ فحاشی صرف قحبہ خانوں تک محدود رہے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اور خانگی طور پر بھی فحش برابر جاری رہا۔ اس جماعت میں ہر قسم کی عورتیں ہوتی تھیں، لیکن خصوصیت کے ساتھ مشاطہ گری کرنے والیاں، حمام میں نہلانے والیاں اور سلائی کا کام کرنے والیاں اس میں زیادہ مبتلا تھیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض عورتیں بازاروں کی سڑکوں پر حسن فروشی کرتی پھرتی تھیں اور ان کی وجہ سے نہ صرف سرکاری قحبہ خانوں کو نقصان پہنچ جاتا تھا، بلکہ شہر میں جرائم کی تعداد بھی بڑھ جاتی تھی اور قتل وغیرہ کی واردات بھی نسبتاً زیادہ ہونے لگتی تھیں۔

بعض اوقات شہروں میں سرکاری قحبہ خانوں کے آس پاس لوگ اپنا

ذاتی قحبہ خانے بھی خفیہ طور پر قائم کر لیتے تھے۔ اور ہر چند حکومت ان کو قائم نہ رہنے دیتی تھی، لیکن فحاشی کو صرف سرکاری قحبہ خانوں تک محدود رکھنے میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی اور نہ فحاشی کا سدباب اس طرح کبھی ممکن ہے۔

ناچ گھر جہاں عموماً شراب فروخت ہوتی تھی کھلے قحبہ خانے کی صورت رکھتے تھے۔ لیکن پندرھویں صدی تک ان ناچ گھروں کو چنداں اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی کیونکہ اسوقت نہ بڑے بڑے شہر پائے جاتے تھے اور نہ لطف وتفریح کا شائستہ نظام قائم ہوا تھا، البتہ مشرق کے بڑے بڑے شہروں میں قدیم یونان وروم کی طرز کے میخانے پیدا ہو گئے تھے جن میں "تعلیم یافتہ" کنیزیں بزم نشاط گرم کیا کرتی تھیں۔

حماموں میں اکثر وبیشتر عورتیں ہی ملازم ہوتی تھیں۔ جو دلالوں، حجاموں اور پیشہ وروں کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ اواخر قرون مظلمہ میں بھی ایسے ادارات فحاشی بہت آراستہ وپر تکلف ہوا کرتے تھے اور عورتیں بھی حسن وجمال دیکھکر ملازم رکھی جاتی تھیں، لیکن قرون وسطی کی فحاشی کی خصوصیت خاصہ اسکی ارزانی تھی۔

قرون وسطی میں ہر میں بھی بکثرت تھیں اور ان میں بہت ایسی تھیں جو درحقیقت اصلی بیویوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ جب پادریوں کے لئے یہ بات ناممکن ہو گئی کہ وہ عورتوں سے جائز طور پر نکاح کر سکیں تو وہ کنیزوں اور ماؤں سے تعلق رکھنے لگے اور ان سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اسکی نگہداشت بالکل جائز اولاد کی طرح ہوتی تھی اور بعض اوقات تو انھوں نے ترقی کر کے حکومتیں تک کی ہیں

جو احکام قحبہ خانوں کے متعلق جاری ہوتے تھے ان میں اس امر کی بھی صراحت ہوتی تھی کہ کسی مرد کو آستین پکڑ کر قحبہ خانہ میں نہ کھینچا جائے اور نہ کسی کی ٹوپی اُتاری جائے۔ الغرض حکومت کے احکام ہر قسم کی تفصیلات پر حاوی تھے اور جس طرح سرکاری بازاروں اور منڈیوں کی نگرانی ہوتی ہے اسی طرح اُس زمانہ میں قحبہ خانوں کی نگرانی ہوتی تھی۔

احکام کی خلاف ورزی کرنے والی کسبیوں کو جو سزائیں دی جاتی تھیں ان میں ایک سزا یہ بھی تھی کہ اس کو پکڑ کر شکنجہ کے اندر کس دیتے تھے یا کسی چھکڑے میں لاد کر باجہ کے ساتھ تشہیر کرتے تھے۔ اور لوگ ساتھ ساتھ شور و غل مچاتے اور آوازے کستے جاتے تھے۔ بعض مقامات میں اس طریقۂ تشہیر میں کسی قدر تفاوت ہو جاتا تھا یعنی چھکڑے میں لادنے کے بجائے اسکو دُم کی طرف منھ کر کے گدھے پر سوار کر کے شہر میں گھماتے تھے اور اسپر سڑی گلی ترکاریاں اور کیچڑ تک پھینکتے تھے۔

اگر کوئی بدمعاش کسی باعصمت عورت کو اُڑا لاتا تھا تو اسے بعض جگہ تو پھانسی دیدیجاتی تھی یا زندہ آگ میں جلا دیا جاتا تھا۔ مختلف جرائم پر کسبیوں اور ان کے ساتھیوں کو سزائے تازیانہ دی جاتی تھی۔ یا ان کا کوئی عضو کاٹ دیا جاتا تھا۔ یا کچھ دنوں کے لئے جیلخانہ میں ڈال دئے جاتے تھے۔ یا ان پر جرمانہ کر دیا جاتا تھا۔ اکثر اوقات گرم لوہے سے داغنے کی بھی سزا دیجاتی تھی۔

قحبہ خانوں میں حفظان صحت کا خیال تو رکھا جاتا تھا لیکن ناپاک بیماریوں کا کوئی لحاظ نہ ہوتا تھا۔ البتہ اگر کسی عورت کی نسبت کسی بیماری کا شبہ ہوتا تھا تو اُسے شفاخانہ بھیج دیتے تھے۔ اور جنکی گود میں بچے ہوتے تھے انھیں بھی شفاخانہ

بھجوایا جاتا تھا۔ کسی جذامی عورت کو قحبہ خانہ میں داخل نہ کیا جاتا تھا۔

## قرونِ وسطیٰ کے انگلستان میں فحاشی

جب رومیوں نے برطانیہ کو فتح کر لیا تو انھوں نے دیکھا کہ ملک میں اجتماعی شادیوں اور دیگر قسم کے تعلقات زناشوئی کا رواج تو موجود ہے لیکن کوئی قحبہ خانہ نہیں پایا جاتا۔ ڈاکٹر سینجر Sanger کا قول ہے کہ اسوقت اہل برطانیہ کے اوضاع و اطوار بہت ناشائستہ تھے۔ یہ لوگ بالکل گنوار تھے اور اُن کے یہاں یہ عام دستور تھا کہ شادی کے روز تمام دُلہنیں قطعی برہنہ رہتی تھیں البتہ اینگلو سیکسن قوم کا قانون اخلاق زیادہ سخت تھا اور اگرچہ اُن لوگوں میں بھی نکاح کا کوئی ناص قانون مقرر نہ تھا۔ لیکن وہ زناکاری پر نہایت سخت سزا دیتے تھے۔ جب یہ لوگ انگلستان آئے تو ان کے بعض سرداروں میں کثرت ازدواج کا رواج تھا۔ لیکن اس عورت کو جو عصمت کی ناقدری کرتی تھی یا اُس مرد کو جو کسی غیر عورت کے ساتھ ملتفت ہوتا تھا سخت سزا دیجاتی تھی۔ بدچلن بیوی کو بعض اوقات خودکشی کر لینے کا موقعہ دیا جاتا تھا جسکے بعد اسکی لاش پھونکدی جاتی تھی۔ لیکن اگر وہ عورت خودکشی نہیں کرتی تھی تو اسے سخت عقوبت دیجاتی تھی۔ بلکہ عورتوں کا ایک مجمع کثیر جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور چھرے ہوتے تھے اس عورت پر حملہ کرکے تکا بوٹی کر دیتی تھیں اور اسکے چاہنے والے کو بھی قتل کر دیا جاتا تھا۔

جو لوگ شادی کرنا چاہتے تھے وہ عورتوں کے والدین سے اپنی بیویاں خرید لیا کرتے تھے۔ شادی شدہ عورت کے بال تراش دیے جاتے تھے تاکہ عورت

میں کشش کم ہو جائے۔

شاہ کیمبنوٹ کے ایک قانون کی رو سے زانیہ کے ناک کان کاٹ ڈالے جاتے تھے لیکن بعد میں ایک رقم معاوضہ مقرر کر دی گئی تھی جو زانیہ کے شوہر کو دلائی جاتی تھی۔ لیکن اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ فحاشی بڑھنے لگی اور تعزیر کا طریقہ پھر جاری کرنا پڑا گو تعزیر کی صورت بدلی ہوئی تھی یعنی مجرم کو بادشاہ کا غلام بننا پڑتا تھا، سخت و مشقت کرنی پڑتی تھی بادشاہی فوج میں خدمت کرنے پر اُسے مجبور کیا جاتا تھا۔ شاہ ایڈگر نے ایک قانون جاری کیا جسکی رُو سے زنی و زانیہ دونوں کو ہفتہ میں تین دن صرف روٹی اور سادہ پانی پر گذر کرنا پڑتا تھا اور یہ سلسلہ سات برس تک جاری رہتا تھا

رومیوں نے لندن اور انگلستان کے بعض دیگر شہروں میں قحبہ خانے قائم کر دئے تھے۔ اور ان میں سے غالباً ایک دو قرون وسطی تک جاری رہے۔ انگلستان کے حماموں کے اندر قحبہ خانے قائم کرنے کا فخر بھی رومیوں ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ انگریزی کا لفظ "اسٹو" ( Stew ) جو وسطی زمانہ کے لفظ "اسٹوون" ( Stewen ) سے بنا ہے "غسل" ہی کے معنی رکھتا ہے۔ اور قرون وسطی میں انگلستان کے اندر سرکاری حمام سب سے بڑے قحبہ خانے ہوتے تھے۔

بارھویں صدی میں بعہد ہنری دوم قحبہ خانوں کے انتظام کے متعلق ایک قانون پاس ہوا۔ جسکی رو سے تعطیلات کے ایام میں کوئی عورت حماموں کے اندر رہنے نہیں دی جاتی تھی۔ اور نہ حمام میں سامان اکل و شرب فروخت

## ۳۱۵

کرنیکی اجازت تھی۔ بہت سے قواعد اسی قسم کے تھے جنکا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے یعنی کسی مرد کو جبراً گھسیٹ کر قحبہ خانہ میں نہیں لے جا سکتے تھے۔ کوئی راہبہ یا کنواری عورت قحبہ خانوں کے اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ جس عورت کو "سوزاک" کی تکلیف ہوتی تھی اسے قحبہ خانہ میں نہ رہنے دیا جاتا تھا۔ ہنری دوم کے اس قانون کی توثیق چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہوئی۔

نویں صدی میں بہت سے علما مسیحی اس بات پر مُصر تھے کہ ملک کی کسبیوں سے جسقدر آمدنی ہو اسکا دسواں حصہ کلیسا کو ملنا چاہیئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد کلیسا والوں نے اس کا مطالبہ ترک کر دیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس رقم کا ملنا محال تھا اسوجہ سے کہ بعض فقہا گنا ہگاری سے جلب منفعت کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن آیندہ زمانہ کے مقننوں نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں قحبہ خانوں سے آمدنی حاصل کرنا بُرا نہیں سمجھا۔ سموئیل پیپیز (Samuel Pepys) کے زمانہ میں دو قحبہ خانوں کی آمدنی ڈیوک آف یارک کو ملا کرتی تھی۔

جب ڈین (Danes) قوم نے انگلستان پر حملہ کیا تو وہ بھی انگریزی اخلاقیات جنسی کو کوئی ترقی نہ دے سکے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ڈین لوگ روزمرہ اپنے بالوں میں شانہ کیا کرتے اور دیگر طریقوں سے اسقدر اپنے آپ کو سنوارتے کہ اینگلو سیکسن قوم کی عورتوں کے لیئے دل کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس زمانہ میں ایک قانون یہ تھا کہ جو کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی بیوی سے زنا کرے اسے ایک مقررہ رقم بطور تاوان "شوہر مظلوم" کو دینی پڑے گی۔ علاوہ ازیں اس شوہر کے لیئے دوسری عورت بھی بہم پہونچانی پڑے گی۔ اس سے صاف ظاہر

ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کسبیاں ضرور موجود تھیں۔ اور فحاشی کوئی بڑا جرم خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اگر کسی کسان کی بیوی کی عصمت دری کر دی جاتی تھی تو اسکے شوہر کو بیس روپیہ کے قریب تاوان دلا دیا جاتا تھا۔ اور اگر کسی شریف یا امیر کی بیوی سے زنا کیا جاتا تھا تو اسکا تاوان زیادہ سے زیادہ دو تین سو روپیہ تک ہوتا تھا لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اس قانون کے باعث زنا میں ترقی نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ معاوضہ وغیرہ کی الجھنوں میں پھنسنے سے زیادہ آسان یہ تھا کہ آدمی کسی پبلک قحبہ خانے میں چلا جائے۔

نارمن (Norman) حملہ آور ڈین قوم سے بھی زیادہ شائستہ تھے۔

چنانچہ نارمن لوگوں کی فتح کے بعد انگلستان میں نظام جاگیر داری کو بہت زور ہو گیا اور اسی کے ساتھ ملک کو تجارتی و حربی اہمیت بہت حاصل ہو گئی چونکہ اس عہد میں براعظم یورپ کا انگلستان سے بہت کچھ تعلق ہو گیا تھا اسلئے اس دور کا اثر بہت سی صورتوں میں فحاشی پر بھی ہوا

قانون جاگیر داری کی رو سے اگر کوئی شخص رعایا میں سے کسی تعلقدار کی بیوی سے ناجائز تعلق پیدا کرتا تھا تو ضبطی زمین کی سزا دیجاتی تھی لیکن اگر خود تعلقدار اپنے سے کم درجہ شخص کی بیوی کی آبروریزی کرتے تھے تو ان کو کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ بعض اوقات مقتدایان دین قانون جاگیر داری کے خلاف عدل و انصاف اور درستی اخلاق کا تقاضہ کرتے تھے۔ لیکن چونکہ کلیسا والوں کے خیالات چنداں بلند نہ تھے اور وہ خود بھی بتلائے معصیت رہتے تھے اسلئے انکا اثر عیاشی

تعلقداروں اور نوابوں کے خلاف بہت کم پڑتا تھا۔ ولیم رفس (William Rufus) کے عہد میں اس مسئلہ پر بہت بڑا جھگڑا پیدا ہوا کہ کلیسائے مسیحی کے اسقف کسی شخص کو زنا کے جرم میں بلا اجازت بادشاہ سزا دے سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن آخرکار بہت سے مقتدایان دین نے یہی پسند کیا کہ بادشاہ کے خلاف جھگڑا کرنا مناسب نہیں۔

انگلستان میں بعہد ہنری سوم یہ مسئلہ پیش ہوا کہ جو بچے شادی سے قبل پیدا ہوں لیکن بعد میں انکے والدین شادی کرلیں تو وہ بچے جائز شمار ہونگے یا ناجائز۔ اسکے متعلق مذہبی اور ملکی قوانین میں اختلاف تھا۔ ملکی قانون کی رو سے ایسے بچے ناجائز تھے۔ لیکن اسقفوں کا فتویٰ یہ تھا کہ وہ اپنے والدین کے جائز وارث ہیں اور انکو جائز اولاد کے دیگر حقوق بھی حاصل ہیں۔ اور چونکہ جائز و ناجائز اولاد کا جھگڑا مذہبی عدالتوں میں پیش ہوتا تھا اسلئے اسقفوں کی رائے غالب رہی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ "آزمائشی ازدواج" کے طور پر اپنے گھروں میں بلا نکاح عورتیں رکھنے لگے۔

## قرون وسطیٰ کی جرمنی میں فحاشی

قوم قوط مغاربہ کے قانون کی رو سے اگر کوئی آزاد لڑکی یا مخدا عورت شہر کے اندر مبتلائے فحاشی ہوتی تھی تو اسکو پکڑکر ۳۰ کوڑے مارتے تھے۔ اور اگر کسی لڑکی کے والدین اسکی فحاشی پر راضی ہوتے تھے تو انکو بھی سزائے تازیانہ دیجاتی تھی یہی قانون ان کنیزوں اور ملازم عورتوں پر عائد ہوتا تھا جو پیشہ کرتی تھیں۔

لیکن قرون وسطیٰ میں جرمنی نے اس باب میں بہت رواداری سے

۳۱۸

کام لیا کیونکہ دیگر بلاد یوروپ کی طرح یہاں کے امرا اور اسقف بھی قحبہ خانوں سے جلب منفعت کرتے تھے چنانچہ شہر مینز (Mainz) میں پندرھویں صدی کے اندر تمام قحبہ خانوں کے مہتمم ارباب کلیسہ ہی ہوا کرتے تھے۔

پندرھویں صدی میں شہر اولم (Ulm) کی میونسپلٹی نے اپنے قحبہ خانے لوگوں کو ٹھیکہ پر دیدیئے۔ اور ٹھیکہ داروں نے وعدہ کیا کہ وہ وفاداری سے شہر کی خدمت انجام دینگے۔ کوئی مال مسروقہ اپنے گھروں میں نہ رکھینگے ہنگامے اور بلوے بھی نہ ہونے دینگے اور ہر قحبہ خانہ میں ہمیشہ چودہ صاف ستھری اور تندرست عورتیں رکھا کرینگے۔ انکو حکم تھا کہ کسبیوں کو مقررہ قیمت کی خوراک دیجائے۔ جو دن گوشت کے مقرر تھے اُس روز انکو گوشت کی دو چیزیں دی جاتی تھیں۔ جمعہ کے دن اور ایام صیام کے زمانہ میں۔ گوشت یا بھنے ہوئے کبابوں کی جگہ انڈے اور مچھلی دیجاتی تھی۔ اگر کوئی کسبی باہر سے کھانا منگانا پسند کرتی تھی تو مہتمم قحبہ خانہ اسے تقریباً چھ آنہ ادا کرتا تھا جو عموماً گھر کے کھانے کی قیمت ہوتی تھی۔ مہتمم کے لئے یہ بھی لازم تھا کہ وہ قحبہ خانہ کی کسبیوں کے ہاتھ بشرط طلب شراب فروخت کریں۔

شہر اولم کے ہر قحبہ خانہ میں نقدی کا ایک صندوقچہ ہوتا تھا۔ جسکی ایک کنجی مہتمم کے پاس، دوسری ایک کسبی کے پاس اور تیسری خزانچی کے پاس رہتی تھی۔ ہر روز کی آمدنی تمام کسبیاں اسی صندوقچہ میں داخل کرتی تھیں۔ جسکا ایک تہائی حصہ قحبہ خانہ کے مالک کو ملتا تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص زیور وغیرہ دے جاتا تھا تو وہ عورت ہی کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔

پندرھویں صدی کے آخر میں شہر ہیمبرگ میں تمام قحبہ خانے ایک

## ۳۱۹

خاص محلہ میں محدود کردئے گئے تھے۔ اور ہرچند اسوقت یہ قحبہ خانے میونسپلٹی کی ملکیت نہیں تھے لیکن میونسپلٹی کی طرف ان پر ایک خاص ٹیکس ضرور عائد کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں کارخانوں، وغیرہ میں بھی بغیر لائسنس بہت فحاشی ہوتی رہتی تھی۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں جرمنی کے اندر یہ میلان پیدا ہوا کہ کہ اخلاق عامہ سے کلیسا کی نگرانی موقوف کردیجائے اور نہایت سخت قوانین اس باب میں نافذ کئے گئے، چنانچہ زانیہ اور دلالہ دونوں کو کبھی کبھی سزائے موت بھی دی گئی۔ مگر عام سزا یہی تھی کہ اسکا سر مونڈکر تمام عمر چہرہ پر ایک نقاب پہننے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

لیکن چونکہ گھر کی بیویوں کی عصمت و عفت کی بہت کچھ قدر کیجاتی تھی اسلئے فحاشی کا رواج بڑھا اور اس حد تک اسے ضروریات زندگی میں داخل کرلیا گیا کہ اگر کسی قرضخواہ کو اس بات کی ضرورت پڑتی تھی کہ وہ قرضدار پر نالش کرنے کے لئے گھر سے باہر کسی سرائے میں قیام کرے تو اسے حق حاصل تھا کہ وہ اپنی رقم مطلوبہ میں قیام سرائے کے مصارف فحاشی بھی شامل کرلے۔ برلن دائنا اور دیگر بلاد جرمن کے سرکاری حساب کتاب میں ایسی رقمیں بھی پائی جاتی ہیں جو سفراء اور دیگر معزز مہمانوں کی تفریح طبع کے لئے عورتوں کو اجرت میں دی گئی تھیں۔ اگرچہ فحاشی صرف ناکتخدا لوگوں کیلئے جائز خیال کی جاتی تھی۔ لیکن ان معزز مہمانوں میں جنکی اس طرح عزت افزائی اور خاطر مدارات کیجاتی تھی۔ بہت کم ایسے ہوتے تھے جنکی بیویاں موجود نہ ہوں۔

قرون وسطی کی جرمن معاشرت میں سفری رقاصائیں بھی بہت کچھ اہمیت رکھتی تھیں۔ اکثر صورتوں میں یہ عورتیں اپنے پیشہ کے علاوہ یوں بھی کمائی کرتی تھیں۔ حروب صلیبیہ کے بعد ممالک مشرق سے بہت سی ناچنے والیاں جرمنی اور یوروپ کے دیگر مغربی ممالک میں آئیں جنکے ناچ سخت ہیجان انگیز ہوتے تھے۔ زراعت پیشہ طبقہ کی عورتوں نے بھی بہت جلد ناچ سیکھ لئے اور پھر یہ رقص ان اضلاع میں بھی پھیل گیا جہاں وہ مشرقی رقاصائیں نہیں پہونچی تھیں۔

## قرون وسطی کے فرانس میں فحاشی

گال[1] اور فرینک[2] اقوام میں فاحشہ عورتوں کے لئے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ یہانتک کہ سنگساری کی بھی سزا موجود تھی لیکن ان سزاؤں کا موقعہ شاذ ونادر ہی کبھی پیدا ہوتا تھا کیونکہ ان قوموں میں کوئی باقاعدہ شہری زندگی نہیں پائی جاتی تھی۔ اگرچہ رومی فتوحات تک ان ممالک میں کوئی باقاعدہ ادارہ فحاشی کا نہ تھا لیکن بلا نکاح تعلقات جنسی کے واقعات اکثر دیکھے جاتے تھے خصوصاً اسوقت جب کوئی زبردست فتح حاصل ہوتی تھی یا جب کوئی سالانہ جشن منایا جاتا تھا۔

---

[1] گال قوم قدیم ملک گال کی باشندہ تھی۔ اور ملک گال (Gaul) میں وہ لوگ شامل تھے جنھیں آجکل فرانس بلجیم کہتے ہیں علاوہ ازیں اس ملک میں کچھ حصہ ہالینڈ۔ سوئزرلینڈ اور جرمنی کا بھی شامل تھا۔

[2] فرینک (Franks) ایک جرمن نژاد قوم تھی جسنے چھٹی صدی میں ملک فرانس کو فتح کیا

رومیوں کے عہد میں شہر مشالیا (موجودہ مارسیل Massilia) بہت کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ فروغ تجارت کی وجہ سے وہاں کے قحبہ خانوں میں خوب چہل پہل رہتی تھی۔ علاوہ ازیں رومی فوجیں بھی اپنے ساتھ ہزاروں عورتیں لے آئے تھے جو پیشہ ور تھیں۔

فرینک قوم کے سردار اکثر ایک سے زیادہ عورتیں پاس رکھتے تھے انمیں ایک تو اصلی بیوی ہوتی تھی اور باقی اسکی مدخولہ یا حرمیں ہوتی تھیں۔ الغرض دسویں اور گیارھویں صدی تک پیشۂ فاشی کم جاری ہوا تھا۔

شہنشاہ شارلمین (Charlemagne) کے قوانین میں فاشی قطعی ممنوع تھی۔ راہبوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بدچلنی کی زندگی چھوڑدیں اور راہبہ عورتوں کو یہ تنبیہہ تھی کہ وہ "کسبی۔ چور اور قاتلہ" ہونا چھوڑدیں۔ تمام کسبیوں اور قحبہ ساتوں کو کوڑے مارے جانیکا حکم تھا۔

لیکن امرا اور پادریوں کو حرمین رکھنے کی اجازت تھی۔ پادریوں کو نکاح کرنیکی بھی اجازت تھی لیکن شہنشاہی قوانین کی عبارت اور زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نکاح کے جھگڑے کو خود پسند نہیں کرتے تھے۔

قرون مظلمہ کے اعلیٰ طبقات میں ازدواجی وفاداری روز بروز مفقود ہوتی جاتی تھی، جسکی ابتدا بادشاہوں کی طرف سے ہوئی۔ اور پھر طبقۂ امرا اور مقتدایان دین نے بادشاہوں کی تقلید کی چنانچہ بڑے بڑے گرجاؤں پر سنگتراشی کے ذریعہ سے اکثر ایسے مناظر کندہ کئے جانے لگے تھے جنھیں فی زمانہ ہرگز پبلک میں نہیں لایا جاسکتا۔

تیرھویں صدی میں لوئی سینز دہم نے انسداد فحاشی کی بے سود کوشش کی ۱۲۲۵ء میں لوئی نہم (سینٹ لوئی) نے جو زیادہ متقی و پرہیزگار بادشاہ تھا، ایک فرمان جاری کرکے تمام کسبیوں اور چکلہ داروں کو ملک سے نکال دیا۔ اور جو لوگ پھر پیرس واپس آگئے تھے انھیں سخت سزائیں دیگئیں۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ کیونکہ دوسری عورتوں نے بہت جلد ان کی جگہ لے لی، اور شرابخانوں میں فحاشی کا چرچا بڑھ گیا۔ علاوہ ازیں چاروں طرف سے شکایتیں ہونے لگیں کہ لوگوں سے بیویوں اور بیٹیوں کی عزت آبرو بچانا ناممکن ہوگیا ہے۔

مجبوراً وہ فرمان دو سال بعد منسوخ کرنا پڑا اور کسبیوں کا اہتمام ایک سرکاری عہدیدار کے سپرد کردیا گیا۔ اسکا کام یہ تھا کہ جو عورتیں قواعد مقررہ کی خلاف ورزی کریں انھیں گرفتار کرکے سزا دے۔ اسکے ساتھ شہر پیرس کے ایک خاص محلہ میں کسبیوں کو محدود کردیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ بیش قیمت لباس اور زیور نہ پہنیں۔

بڑھاپے میں شاہ سینٹ لوئی نے اپنے بیٹے کو جو بعد میں فلپ سوم کے نام سے بادشاہ ہوا طلب کرکے حکم دیا کہ وہ ۱۲۵۴ء کا فرمان پھر جاری کردے لیکن اسکے نفاذ کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

قرون وسطی کے فرانسیسی لٹریچر میں بہت سے حوالے ایسے ملتے ہیں کہ میزبان نے اپنی بیوی مہمان کے نذر کردی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے فرانس میں عورت کی حالت کسقدر ذلیل تھی۔ چونکہ ابتداء میں نکاح کے لئے عورتیں خریدی جایا کرتی تھیں اسلئے بطور مہمان نوازی کسی مہمان کو ایک

۳۲۴

دوران کے لئے اپنی بیوی دیدینے کا خیال عجیب نہ سمجھا جاتا تھا۔

قرون وسطیٰ کے بعض مشہور واعظین بدکاریوں کے خلاف بہت کچھ وعظ کہا کرتے تھے اور ان لوگوں کے وعظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں گرجا گھر بھی قحبہ خانوں کا کام دیتے تھے۔ ان وعظوں میں راہبوں، گرجاؤں کے پادریوں، اور اسقفوں کو جو پارسائی کے عہد و پیمان پر قائم نہیں رہتے تھے، سخت نمائش کی گئی ہے۔ بقول ان واعظین کے بہت سے راہبہ خانے درحقیقت حرم سرائیں تھے جن میں ہر قسم کی خلاف فطرت حرکتیں ہوا کرتی تھیں۔

قدیم مورخین کے قول کے مطابق قرون وسطیٰ کی بہت سی رسمیں عام قانون اخلاق سے متجاوز تھیں۔ مثلاً ۲۸ دسمبر کو جب "یوم معصومین" (Innocents' Day) منایا جاتا تھا تو مردوں کو بہت سویرے لڑکیوں کی خوابگاہوں میں داخل ہونے کی اجازت تھی۔ اگر اسوقت بھی لڑکیاں سوتی تھیں تو مردوں کو اجازت تھی کہ وہ انھیں گدگدائیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر کھلا ہوا گندہ مذاق ہوتا تھا۔ بلکہ یہ بات پُر لطف خیال کی جاتی تھی کہ جب دولہا اور دُلہن تنہا ہوں تو انھیں روزن دیوار سے جھانکا جائے۔ ہندوستان میں بھی یہ دستور کہیں کہیں پایا جاتا ہے

شہنشاہ شارلمین کے قوانین میں بعض ان مسیحی فرقوں کے لئے بھی سزائیں مقرر تھیں جو عیاشی کیا کرتے تھے۔ اسکے بعد کی صدیوں میں سحر و ساحری اور مذہبی تازیانہ زنی کا بھی لوگوں کے اخلاق پر بہت کچھ اثر پڑا۔ مذہبی شہسواروں کے فرقہ ٹمپلرز (Templars)، کا فرانس کے بادشاہ فلپ چہارم نے

استیصال کر دیا تھا اور اس فرقہ کے بہت سے آدمیوں کو اس الزام میں سزائے قتل دیگئی تھی کہ وہ خلاف فطرت حرکتوں میں مبتلا تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بادشاہ نے یہ عمل رعایا کی درستی اخلاق کے خیال سے نہیں بلکہ حرص و آز سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ تاہم اس امر کا ثبوت واقعی موجود تھا کہ اس فرقہ کے لوگ خلاف فطرت جرائم کے مرتکب ہوا کرتے تھے۔

اس زمانہ میں کسبیوں سے زیادہ تعرض نہ کیا جاتا تھا، لیکن انکو یہ حکم ضرور تھا کہ وہ اپنے لباسوں پر نشانات مقررہ لگائیں تاکہ انکے پیشہ کی شناخت ہو سکے۔ شہر اویجنان میں تمام کسبیاں سیاہی مائل لباس میں بائیں بازو پر ایک سفید قوس یا کمان لگا لیا کرتی تھیں۔ اور اگر لباس کا رنگ ہلکا ہوتا تھا تو اس قوس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا تھا۔ پیرس میں بھی اسکی پابندی ہوتی تھی۔ علاوہ اسکے ان کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ بازاروں میں باریک لباس، ریشمی پوشاک اور زیور وغیرہ پہنکر نہ نکلیں۔ اگر کوئی عورت ممنوعہ لباس پہنکر نکلتی تھی تو اسکا لباس وہیں پشت کی طرف سے چاک کر دیا جاتا تھا۔ اور نیلام کر کے اسکا روپیہ سرکاری خزانہ میں داخل ہو جاتا تھا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں پیرس کے اندر بعض کسبیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ اور بعض کو شہر میں تمام دن برہنہ گشت کرانے کے بعد شام کو ان کے بال جھلس دئے گئے سرعام تازیانہ زنی اور گوش تراشی بھی کبھی کبھی ہوتی تھی۔

فرانس کے بہت سے صوبجات میں تعلقداروں نے کسبیوں پر ٹیکس لگانا شروع کر دیا تھا اور شہر تولوز میں ایک یونیورسٹی اور ایک بہت بڑا قحبہ خانہ

قائم کیا گیا۔ جسے لوگ "بڑا راہبہ خانہ" (Grand-Abbey) کہتے تھے۔ تمام پیشہ ور عورتیں جو اپنا کام جاری رکھنا چاہتی تھیں، وہ قحبہ خانہ کے اندر رہنے پر مجبور تھیں ان کی تنخواہیں بھی مقرر تھیں اور انکے ذریعہ سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ میونسپلٹی اور یونیورسٹی میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

جب شاہ چارلس ششم شہر تولوز میں گیا تو تمام سرکاری کسبیاں اسکا خیر مقدم اور سلام کرنے حاضر ہوئیں۔ اس وقت انھوں نے درخواست کی کہ انھیں اپنے بازو پر سفید فیتہ پہننے سے معاف کیا جائے کیونکہ اس سے انکا پیشہ ظاہر ہو جاتا ہے اور لوگ انکی بے عزتی کرتے ہیں۔ بادشاہ نے انکی خواہش کے مطابق فرمان جاری کر دیا۔ لیکن اس سے تولوز کے لوگ ناخوش ہوئے اور اگر کوئی کسبی امتیازی نشان کے بغیر باہر پھرتی تھی تو اسے غضبناک مجمع کے ہاتھوں پٹنے کا خطرہ ہوتا تھا۔ اس سے عاجز آکر انھوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ وہ قحبہ خانہ کے اندر ہی رہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی اور بلدیہ کی آمدنی بیحد گر گئی۔ مجبور ہو کر انھوں نے بادشاہ سے اپیل کی۔ اب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ لوگوں نے فرمان شاہی کو ٹھکرا دیا ہے۔ لہذا اس نے اپنا خاص حکومتی نشان قحبہ خانہ کے دروازہ پر لگوا دیا۔ مگر اسپر بھی اہل تولوز مصر رہے کہ کسبیاں امتیازی نشان ضرور استعمال کریں۔

آخر کار کسبیاں اس قحبہ خانہ سے چلی گئیں اور شہر کے دوسرے حصہ میں جا کر رہنے لگیں جہاں انھوں نے بدمعاشوں کی ایک جماعت کو اپنی حفاظت کے لئے رکھ لیا۔ ایک صدی بعد شہر تولوز نے کسبیوں کے لئے ایک "شہر یا دل گھر"

Green House، تعمیر کر دیا جو بہت عرصہ تک قائم رہا۔

قرون وسطی کے فرانس میں بعض ساہوکاروں نے بھی چکلے قائم کرلئے تھے۔ چنانچہ اہل لومیارڈی کو کئی پروانے قحبہ خانہ رکھنے کے حاصل تھے۔ جسمیں دلکش حمام بھی موجود تھے۔ یہ قحبہ خانے کئی پشت تک جاری رہے۔

فرانس کے جنوبی صوبجات میں انسداد فواحش کی بہت کچھ کوششیں کی گئیں لیکن ناکام رہیں۔ بعض اوقات کسبیوں اور انکے چاہنے والوں کو برہنہ تن بازاروں میں نکالا جاتا تھا۔ کٹنیوں کو آہنی قفس میں بند کرکے دریا میں غرق کر دیا جاتا تھا، لیکن یہ مشغلہ بند نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

۳۲۷

# عہد جدید اور فحاشی

**تمہید** اکثر مورخین سولھویں صدی کو قرون وسطی اور عہد جدید کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں جو دماغی اور معاشری ترقیاں ہوئیں وہ اسقدر اہم نہیں تھیں جتنی سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی ترقیاں ثابت ہوئیں۔ ۱۶۰۰ء کے یوروپ کے تمدن میں جسقدر باتیں قرون وسطی کی موجود تھیں وہ ہمارے زمانہ میں نہیں ہیں۔

بہرحال موضوع زیر بحث کے لحاظ سے وہ دس برس جو ۱۵۰۰ء سے پہلے گذرے اور بیس سال اسکے بعد کے خاص اہمیت رکھتے ہیں ۱۴۹۲ء میں کولمبس (Columbus) نے جزائر غرب الہند دریافت کئے اور منجملہ دیگر چیزوں کے دنیائے جدید نے یوروپ کو آتشک بھی عطا فرمائی۔ ۱۵۱۷ء میں لیوتھر (Luther) نے شہر وائٹمبرگ کے ایک گرجا کے دروازہ پر اپنے پچانوے دعاوی چسپاں کئے اور ۱۵۲۹ء میں جون کالون "ایمان لایا"۔ ۱۵۰۰ء تک فن طباعت کافی ترقی کرچکا تھا، جسکے ذریعہ سے تمام یوروپ میں ..... یونانی زبان پھیل گئی۔ جب ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کرلیا تو بازنطینی علماء و فضلاء تمام مغربی یوروپ میں منتشر ہوکر پھیل گئے۔

احیاء علوم و فنون (Renaissance)، اصلاحات مذہبی

(Reformation) اور اکتشافات امریکہ نے یورپ کے عوام کی معاشرت میں تغیر تو ضرور پیدا کیا لیکن یہ تغیرات بہت دھیمی رفتار سے ہوئے۔ اور عام طور پر قرون وسطی کی طرز معاشرت ۱۵۰۰ء سے بھی آگے بہت عرصہ تک قائم رہی یعنی جو حالت کسبیوں کی ۱۳۰۰ء میں تھی تقریباً وہی حالت ۱۷۰۰ء میں بھی رہی، اور سچ پوچھئے تو ان کی یہی حالت غالباً ۱۳۰۰ء ق۔م میں بھی تھی۔ لیکن ہمارا تعلق ان تغیرات عمرانی و اقتصادی سے ہے جو اجزاء تاریخ ہوتے ہیں۔ ۱۵۰۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان جو زمانہ گذرا اس میں لوگوں کی قدامت پرستی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور اٹھارھویں صدی کے اواخر میں فرانس کے اندر ایک زبردست بیداری کا امکان پیدا ہو گیا جس نے انیسویں صدی میں ایک عظیم انقلاب صنعت و حرفت میں پیدا کر کے اس کے اثرات کو بہت زیادہ مستحکم کر دیا۔

**آتشک** محققین کے نزدیک ابھی تک یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا کہ آتشک کی ابتداء کہاں اور کیونکر ہوئی۔ بعض شہادتیں اس نظریہ کی موید ہیں کہ جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اسوقت تک مرض آتشک اہل یورپ کو معلوم نہیں تھا۔ اور بہت ممکن ہے کہ جو لوگ کولمبس کے ساتھ گئے تھے ان میں سے بعض ۱۴۹۳ء اور ۱۴۹۴ء میں یہ بیماری جزیرہ ہائٹی (Hainti) سے لائے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں تمام یورپ میں آتشک کی بیماری دھڑلے پھیل گئی۔ جب چارلس ہشتم، شہر نیپلز میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ لوگ ایک بیماری میں مبتلا ہیں جسے وہ "مرض الافرنج" (French Malady)

یعنی فرانسیسی بیماری کہتے ہیں۔ اور ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بیماری فرانسیسی سپاہیوں کی لائی ہوئی ہے۔ لیکن درحقیقت اس مرض کے ذمہ دار وہ ہسپانوی سپاہی تھے جو چارلس کی فوج میں ملازم تھے۔

بلاد اطالیہ کی "یہ فرانسیسی بیماری" بہت جلد سواحل شمالی افریقہ اور انگلستان میں پہونچی اور وہاں "ہسپانوی بیماری" کے نام سے مشہور ہوئی۔ پرتگال میں اسکا نام "مرض قسطلانہ" تھا۔ اور سواحل شام و فلسطین پر اسکا نام "آبلۂ فرنگ" یا مسیحی بیماری مشہور ہوا۔ اور جب یہ ناپاک بیماری اقصائے مشرق میں پہونچی تو وہاں "مرض پرتگیزی" کہلانے لگی۔ یہ بات بہت جلد ظاہر ہوگئی تھی کہ یہ خوفناک بیماری مجامعت سے پیدا ہوتی ہے خصوصاً جب کسبیوں سے واسطہ رکھا جائے۔ چنانچہ ۱۵۰۰ء سے قبل ہی اس انکشاف کی بنا پر بعض مقامات میں قحبہ خانے بند کر دئے گئے۔ اور بہت سے شہروں میں احکام جاری ہوگئے کہ جو کسبیاں مبتلائے آتشک ہوں وہ اپنا کام بند کر دیں۔

اس جدید مرض متعدی کا علاج کرنے پر اطباء عام طور سے راضی نہ ہوتے تھے۔ اور جن اطباء نے اپنے پیشہ کی عزت و شان کا خیال نہ کرکے آتشک زدہ مریضوں کا علاج بھی کیا تو وہ مرض کو شفا دینا تو کجا اسکی رفتار کو بھی نہ روک سکے اس مرض کے معالجہ میں عموماً چوب چینی استعمال کی جاتی تھی۔ ۱۴۹۶ء میں بمقام وینس اور ۱۴۹۷ء میں بمقام پیرس بہت جلد آتشک خانے تعمیر کر دئے گئے

اگرچہ آتشک زدہ کسبیوں کے خلاف احکام جاری کرنا بہت اچھی بات تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ ارباب حل وعقد کو معلوم بھی نہ ہونے پاتا تھا کہ کون آتشک زدہ ہے اور کون نہیں۔ اسکے بعد ضرورت ہوئی کہ قحبہ خانوں کی کسبیوں کا معائنہ کرایا جائے اور جن پر آتشک زدہ ہونیکا شبہ ہو انھیں شہر بدر کر دیا جائے، لیکن اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شہر سے باہر جاکر اپنا پیشہ کرنے لگتی تھیں اور بیماری کو پھیلاتی تھیں ۱۵۰۱ء تک ہسپانیہ کے شہر ولینشیاد Valencia میں طبی معائنہ کا ایک نظام قائم ہوگیا تھا۔ ہر عورت کو جو قحبہ خانہ میں داخل ہونا چاہتی طبیب سے ایک سند حاصل کرنا پڑتی تھی اور میونسپلٹی کے اسپتال میں ایسی گندی بیماریوں کے لئے ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا۔ جب سرکاری طبیب کسی کو آتشک زدہ خیال کرتا تھا تو اسکا علاج اسی جگہ ہوتا تھا۔ قحبہ خانے کے منتظموں کو حکم تھا کہ اگر کسی پر آتشک کا شبہ ہو جائے تو فوراً رپورٹ کریں۔ لیکن فی الحقیقت یہ طبی قیود بے سود ثابت ہوئیں۔

پیرس کے ارباب حل وعقد نے ۱۶۱۴ء تک کوئی اسپتال ایسا نہیں کھولا تھا جو آتشک زدہ مریضوں کے علاج کے لئے موزوں ہو۔ اس سے پہلے آتشک زدہ کسبیوں کو بغرض معالجہ ہر جگہ داخل کر لیا جاتا تھا اور آتشک زدہ مردوں کو بھی بڑے اور چھوٹے شفاخانوں میں داخل کر لیتے تھے۔

اٹھارھویں صدی تک بھی پیرس کی کسبیاں سرکاری طور پر علاج کرانے سے گریز کرتی تھیں کیونکہ شفاخانوں میں ایک تو کھانا اچھا نہیں ملتا تھا دوسرے طرز بود و ماند بھی سخت ناپسندیدہ تھا اور ایک ہی کمرہ میں آٹھ آتشک زدہ

عورتیں سویا کرتی تھیں علاوہ اسکے علاج بھی داخل ہونے سے مہینوں بعد تک شروع نہ ہوتا تھا۔ ان کو علاج کے لئے نمبروار انتظار کرنا پڑتا تھا اور جب تک کسی کا نمبر آتا تھا اسوقت تک بیماری ناقابل علاج ہو جاتی تھی۔ نہانے دھونے کے لئے کوئی سہولت نہ تھی۔ پلنگ کی چادریں بھی بہت کم تھیں اور جو تھیں بھی وہ برسوں دھوبی کا منہ نہ دیکھتی تھیں۔

عہد جمہوریت میں بہت سی اصلاحات جاری ہوئیں یعنی ایک نیا شفاخانہ ایسے مریضوں کیلئے تعمیر کیا گیا جس میں چمن اور غسلخانے بھی تھے اور علاج میں بھی کافی سہولتیں تھیں مردوں کیلئے علٰحدہ شفاخانہ بنا دیا گیا، اور عورتوں کیلئے علٰحدہ ۱۸۰۳ء تک پیرس کی کسبیاں باقاعدہ طبی معائنہ کے لئے مجبور کی جاتی تھیں وہ معائنہ کنندہ کو ایک خاص فیس ادا کیا کرتی تھیں اور یہ حضرت معائنہ کرنیکی زحمت گوارا نہیں فرماتے تھے۔ اسلئے بعد میں طبی معائنہ میں سختی کی گئی اور اچھے اچھے اطبا کی خدمات اس کام کے لئے حاصل کی گئیں۔

جب آتشک کی بیماری تمام یورپ میں وبا کی طرح پھیل گئی تو اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ انفرادی حیثیت سے اس ناپاک مرض کی رفتار کو کیونکر روکا جائے بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے شایع کرکے نوجوانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ قحبہ خانوں سے پرہیز کریں۔ لیکن اسکا اثر کچھ نہ ہوا۔

الغرض ۱۵۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک انسداد آتشک کی جو کوششیں بھی ہوئیں وہ اکثر ناکام رہیں اور اس سلسلہ میں قحبہ خانوں کا کوئی معقول انتظام اور سکانہ فحاشی کو دنیا سے مٹایا جا سکا

## اصلاحات فرقۂ پروٹسٹنٹ

جب ۱۵۱۱ء میں مارٹن لیوتھر شہر روما گیا تو وہ پکا رومن کیتھولک تھا لیکن جو کچھ اُس نے وہاں دیکھا اُسی نے اُسکو پروٹسٹنٹ بنا دیا۔ اس زمانہ میں دو باتیں خاص طور پر دنیا میں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ بڑے بڑے مذہبی عہدے فروخت کئے جاتے ہیں۔ دوسرے جو لوگ پاپائے اعظم کے عزیز یا رشتہ دار ہوتے ہیں ان سے خاص مروت کی جاتی ہے۔ لیکن ان سب باتوں سے زیادہ جس چیز نے اسکی طبیعت پر اثر کیا وہ یہ تھی کہ پاپائے اعظم کے مقدس دربار میں حد درجہ فحاشی ہوتی تھی۔ اسوقت شہر روما کسبیوں سے اور عہدہ داران کلیسا کی آشناؤں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور مذہبی جوش و خروش قطعی مفقود تھا۔ اس نوجوان جرمن پادری نے دفعتاً کوئی جدید مسلک جاری نہیں کیا بلکہ سب سے پہلے اسنے وہ اسباب پیش کئے جنکی بنا پر وہ کلیسا سے باغی ہوا تھا۔ اسنے ۱۵۱۷ء تک جبکہ ٹٹزیل (ایک اعلیٰ عہدہ دار کلیسا) نے پادریوں کے حقوق فروخت کرنے شروع کئے اپنا یہ عقیدہ علی الاعلان ظاہر نہیں کیا کہ "نجات صرف دین سے حاصل ہو سکتی ہے"۔ اسکے دو سال بعد اس مصلح نے اعلان کر دیا کہ پاپائے اعظم اور اسکی کونسل معصوم نہیں ہیں۔ ۱۵۲۵ء میں (اور یہی بات ہمارے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے) لیوتھر نے کیتھرینا فان بورا سے نکاح کر لیا جو راہبہ تھی اور لیوتھر کی طرح ہمیشہ پارسا رہنے کا عہد و پیمان کر چکی تھی وہ کہتا تھا کہ جس طرح کھانا، پینا اور سونا فطری باتیں ہیں اسی طرح عورت اور مرد کا ملنا بھی حسب اقتضائے فطرت ہے۔ ایک روز اس نے بیان کیا

کہ :۔ "اصول ازدواج تمام مخلوقات میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ جانور تو درکنار پھول تک نر و مادہ سے خالی نہیں ہیں" لہذا پادریوں کا تجرد سخت تعجب بات ہے۔

لیوتھر کا عقیدہ تھا کہ مرد عورتوں سے افضل ہیں۔ وہ نہایت شد و مد کیساتھ کہتا تھا کہ عورت کو لازم ہے کہ اپنے شوہر کی مرضی کے تابع رہے۔ ریاست ہیسی (Hesse) کے بادشاہ فلپ کا قول یہ تھا کہ طلاق دیکر عورتیں چھوڑنے سے یہ بہتر ہے کہ مرد کثرت سے عورتیں رکھے۔ جو شادی شدہ عورتیں لاولد رہتی تھیں وہ ان کو یہ صلاح دیا کرتا تھا کہ وہ بچے جننے کے لئے خفیہ طور پر کوئی دوسرا خاوند رکھ لیں۔ لیوتھر کا عقیدہ یہ تھا کہ جبتک عورت کے اولاد نہ ہو وہ مکمل نہیں ہوتی قرون وسطیٰ کے اس عقیدہ کی لیوتھر سخت مخالفت کرتا تھا کہ عورتیں قابل نفرت ہیں اور ناپاک اور گنہگار ہیں۔ مگر اسے اس خیال سے ہرگز اتفاق نہ تھا کہ مخاشی ایک ناگزیر معصیت ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر خوب جانتا تھا کہ ایک جوان آدمی بالطبع خواہ کتنا ہی شہوت پرست کیوں نہ ہو لیکن وہ اگر چاہے تو مجرد رہ سکتا ہے۔ اسی لئے وہ قحبہ خانوں کے خلاف کھلم کھلا وعظ کہا کرتا تھا۔ ۱۵۶۲ء میں جب بلدیۂ نورمبرگ کے ارباب حل وعقد نے شہر کا قحبہ خانہ بند کیا تو انھوں نے ایک وجہ تو یہ بتائی کہ اسکے سبب سے آتشک پھیلتی ہے اور دوسری وجہ یہ ظاہر کی کہ بعض پروٹسٹنٹ پادریوں کے وعظ و نصیحت نے انھیں ایسا کرنے پر مائل کیا اسی طرح جب قحبہ خانوں کے خلاف لگاتار وعظ ہوئے تو ۱۵۲۳ء میں شہر اولم کا قحبہ خانہ بند کر دیا گیا اور فرینکفرٹ اور دیگر بلاد میں بھی اسکا تتبع کیا گیا مگر یہ انتظامی احکام زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے۔

۳۳۴

لیوتھر راہبوں اور ننوں کو نصیحت کرتا تھا کہ وہ نکاح کرلیں جسکا سبب یہ تھا کہ تجرد کی زندگی میں وہ بہت زیادہ گناہ کے مرتکب ہوتے تھے ورنہ یونتواس کے نزدیک میاں بیوی کے تعلقات بھی ناجائز تھے اگران میں لذت نفس شامل ہو جائے

پروٹسٹنٹ فرقہ کی بعض انتہاپسند جماعتیں جو لیوتھر کے زمانہ میں پیدا ہوگئی تھیں وہ بلاقید نکاح عورتوں سے جنسی تعلقات رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک انکا معیار اخلاق بمقابلہ کیتھولک یا پیروان لیوتھر کے زیادہ بلند تھا۔ وہ کہتے تھے کہ انفرادی حیثیت سے کسی قسم کی ملکیت یا جائداد رکھنا فرمان یسوع کے قطعی خلاف ہے۔ فرقہ موراویہ (Moravians) میں جنھیں "اخوان متحد" (United Brothers) بھی کہتے تھے عام رواج تھا کہ عورت اور مرد کا جوڑا بذریعہ قرعہ اندازی ملاتے تھے کیونکہ انکے یہاں یہ تعلیم تھی کہ انسان کو ہرگز حصول انفرادیت کی کوشش نہ کرنا چاہیئے۔

لیوتھر کے علاوہ ایک اور شخص کالوین فرانس میں پیدا ہوا۔ اول اول اسے مذہبی تعلیم دلائی گئی تھی لیکن بعد کو اسکے والد نے اس پر زور دیا کہ وہ پیشۂ وکالت اختیار کرے۔ چونکہ اس زمانہ میں اہل کلیسہ سخت بدچلن تھے اسلئے کالوین اکیس سال کی عمر میں پیشہ وکالت ترک کرکے اصلاح کلیسا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مگر جب اہل کلیسا نے اسے بہت پریشان کیا تو وہ ترک وطن پر مجبور ہوگیا اور جنیوا پہونچکر اسکا اثر اور زیادہ بڑھگیا۔ اور سیاسی سردار بھی بنگیا۔ کالوین ایک ہنرخشک آدمی تھا۔ اسکا سب سے پہلا خیال یہ تھا کہ فحاشی کا استیصال کیا جائے۔

اس نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس نے تھیٹر بند کرا دیئے۔ بہت سے تہوار موقوف کر دئے۔ اور ہر قسم کے جشن شادمانی کے خلاف فتویٰ دیدیا۔ جان ناکس (Knox) نے جو کالوین ہی جیسا خشک مزاج آدمی تھا کالوینیت کی تبلیغ اسکاٹلینڈ میں کی جہاں اسکا نام (Pres by terianism) ہوا۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ کالوین اور ناکس جیسی طبیعت انکے تمام مریدوں کی بھی ہوتی۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ جب لوگوں کی رنگ رلیاں بند کر دی گئیں تو ملک میں دیگر قسم کے افعال شنیعہ کی وبا پھیل گئی اور فحاشی خفیہ طور پر ہونے لگی۔

**دور احیاء علوم و فنون**

قرون وسطیٰ کے فنون لطیفہ کا تعلق تمام تر کلیسا ہی سے تھا۔ بڑے بڑے گرجا۔ مقدس تصویریں، پادریوں کے مجسمے وغیرہ سب مشہور و معروف مصوروں اور ماہرین فنون لطیفہ ہی کے رہین منت تھے۔ عریاں تصاویر اور بتوں کا تعلق بھی زیادہ تر کلیسا ہی سے تھا۔

اس دور کا آغاز اطالیہ سے ہوا اور تمام یورپ میں پھیل گیا۔ سولھویں صدی میں جو انگریز سیاح اطالیہ سے اپنے وطن کو واپس آتا تھا تو جدید تہذیب سے پوری طرح آراستہ ہو کر آتا تھا۔ اسے لاطینی و یونانی ادبیات کا شوق ہوتا تھا۔ اسے فلورنس، روم اور وینس کی تصاویر، بت تراشی اور فن شعر میں درک ہوتا تھا۔ علم مجلس میں بھی طاق ہوتا تھا اور اپنے احباب میں اطالوی عیش پسند امراء کی رنگ رلیوں کے حالات بیان کرتا تھا۔ اسوقت اطالیہ کی آزادی و

وخوش عیشی کا یہ عالم تھا کہ دسترخوان پر جو ظروف تقرئی رکھے جاتے تھے اُن پر بھی عریاں و فحش تصویریں منقوش ہوتی تھیں۔

احیاء علوم و فنون کے زمانہ میں اطالیہ کے اندر بہت کم کسبیاں اچھی تعلیمیافتہ تھیں لیکن کسقدر ادبیات اور موسیقی کی تعلیم ان کو ضرور دیجاتی تھی ان میں سے بعض اپنی حاضر جوابی اور شیوا بیانی کیلئے مشہور تھیں۔ لیکن یہ باتیں انہی کے لئے مخصوص نہ تھیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں مصر کی عورتوں میں بھی بہت آزادی پیدا ہوگئی تھی اور بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی اور خوش لباسی میں وہ کسبیوں سے کسی طرح کم نہ تھیں۔

اُسوقت ایک دو کسبیاں شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی ممتاز تھیں اور ایسی تو اکثر تھیں جو مصوروں اور بت سازوں کے سامنے بیٹھکر اپنے خوبصورت جسم کا نمونہ پیش کیا کرتی تھیں۔

اعلیٰ طبقہ کی کسبیوں میں روزانہ غسل کرنیکا بھی شوق پیدا ہوگیا تھا۔ اور وہ پانی میں قیمتی عطر اور خوشبوئیں ڈالکر نہایا کرتی تھیں۔ سولھویں صدی میں اطالوی کسبیاں سنہرے بال پسند کرنے لگیں۔ اسلئے جن کے بال قدرتاً سنہرے نہیں ہوتے تھے وہ اپنے بالوں کا رنگ مختلف طریقوں سے اڑاکر سنہرا بنایا کرتی تھیں۔

زیادہ مشہور اور اونچے درجہ کی کسبیاں لباس اور زیور پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کیا کرتی تھیں۔ اور جو زیادہ صاحب استطاعت تھیں وہ خواتین دربار کا سا بیش قیمت لباس پہنتی تھیں۔ عموماً یہ عورتیں غازہ، سفیدہ اور

خضاب در نگ استعمال کرتی تھیں جسکا مقصد زیب و زینت نہیں بلکہ اپنے معائب چھپانا ہوتا تھا۔

قرون وسطی میں کسبیوں کی جو نشانات امتیازی استعمال کرنے پڑتے تھے وہ رفتہ رفتہ غائب ہو گئے تھے اور لباس کی یکرنگی و یکسانی میں سب عورتیں برابر تھیں۔ قیمتی لباس، ریشمی کپڑے، نفیس زیور کا ہر جگہ ہر طبقہ میں رواج ہو گیا تھا اور آرائش و زیبائش معاشرت کا ضروری جزو ہو کر رہ گئی تھی۔

واضح ہو کہ انگریزی لفظ "کورٹی زن" (Courtezan) (کورٹ + زن = درباری عورت) غالباً فرانسیسی لفظ "کورٹی زین" (Courtisane) (کورٹ + زین = زینت دربار) سے نکلا ہے۔ جسکے معنی ہیں "درباشاہی کی عورت"۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ بالواسطہ یا بلاواسطہ اطالوی لفظ "کورٹی زیانہ" (Courtegiana) سے نکلا ہو جو سولھویں صدی میں اونچے درجہ کی کسبیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درباشاہی کی عورتیں کس اخلاق کی ہوتی تھیں ان درباری عورتوں میں کسی درباری کی بیوی بھی ہوتی تھی جو اپنے بادشاہ یا شہزادہ پر "ضرورت سے زیادہ مہربان" ہوتی تھی۔ کسی کسان کی بیٹی بھی ہوتی تھی جسکے حسن و جمال پر شاہی توجہ ہوئی اور وہ فرش سے اٹھکر عرش پر پہونچگئی یہ پُر لطف اور شائستہ فاشی قدیم یونانی یا رومی فاشی کا تتمہ نہ تھی بلکہ قرون وسطی کی اُن ترقی یافتہ فاشیوں کی ایک دلفریب صورت تھی جنہے قرون وسطی کی آخری صدیوں میں درباشاہی، درباپاپائے اعظم یا دربار امراء و شہزادگان

کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ دولت کے دریا بہتے ہوئے اطالیہ میں چلے آتے تھے۔ تکلفات اور عیش پرستیوں کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ متعدی بیماری طبقۂ اعلیٰ سے گذر کر طبقۂ اوسط و ادنیٰ میں بھی پھیل گئی اور اطالوی تہذیب فرانس۔ انگلستان۔ بلجیم۔ ولندیز اور جرمنی پر بھی مسلط ہوگئی۔

اگرچہ وقتاً فوقتاً تدابیر انسداد کی جاتی تھیں لیکن باینہمہ استلذاذ بالمثل قرون وسطیٰ کے اطالیہ میں نہایت استحکام کے ساتھ جڑ پکڑتا جاتا تھا۔ حسن پرستی زن و مرد دونوں کا مشغلہ تھا اور ابتداء ہی سے اوارہ اطالوی کسبیوں کا مقابلہ کرنے لگے تھے آخر کار شہر وینس میں کسبیوں نے مجبور ہو کر مردوں کا لباس پہنا اور لڑکوں کی طرح بال بنانے شروع کر دئے تاکہ لوگوں کے اس ذوق کو بھی تسکین پہونچے۔

اطالیہ سے یہ علت فرانس میں پھیلی اور شاہ ہنری ہشتم اس باب میں بہت مشہور ہوگیا۔ لوئس چہاردہم کے زمانہ میں دربار کے اندر ایک "کلب" ہی اس مقصد کے لئے قائم ہوگیا۔ انگلستان میں جب دور ملوکیت دوبارہ قائم ہوا تو وہاں کے طبقۂ امراء میں بھی اسکا شوق عام تھا۔

## معاشری و صنعتی تغیرات

سولھویں صدی کے اوائل میں اہل یورپ کی اکثریت زراعت و فلاحت میں مصروف رہتی تھی۔ لوگ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے کبھی کبھی پھیری والے بساطی یا ناچنے گانے والوں کی ٹولیاں گاؤں میں آجاتی تھیں۔ گاؤں والوں کی دنیا انکا وہی چھوٹا سا کھیت اور انکے ارد گرد کی قابل کاشت

# ۳۳۹

آراضی تھی۔ ان کے خیال میں سب سے بڑی عظمت و جلال والی چیز قریب ترین قصبہ کا بڑا گرجا تھا۔ جسے غالباً انھوں نے کبھی دیکھا نہ تھا بلکہ صرف اسکا حال سُن لیا تھا۔ لیکن قصبہ اور شہر کے باشندوں کا مطمح نظر اسقدر محدود نہ تھا۔ ان کی ملاقات بڑے بڑے سیاح تاجروں سے ہوتی رہتی تھی۔ مذہبی زیارتوں اور حروب صلیبیہ کی وجہ سے مختلف اقوام و ملل کے لوگوں سے ربط و ضبط پیدا ہوگیا تھا لیکن ان لوگوں میں سولھویں اور سترھویں صدی تک قومیت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ طلبہ کی مشترکہ زبان ضرور لاطینی تھی اور ہر جگہ شریعت عیسوی کا زور شور تھا جسکی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ اخلاقیات جنسی کو تابوتکیت کی طرح توڑ دیا جاتا تھا۔

قرون وسطی میں جسقدر یکسانیت و ہم آہنگی نظر آتی تھی عہد جدید میں اسی قدر اختلاف و تضاد دکھائی دیتا ہے۔ بعض مقامات بلحاظ تجارت و صنعت بہت جلد ترقی کر گئے اور بعض کی حالت وہی رہی جو قرون وسطی میں تھی۔ اب لوگ ہر چیز کو طمانیت کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور تمام مغربی اور وسطی یوروپ میں پاپائیت کی جگہ مختلف مذہبی اور فرقہ وارانہ جماعتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ باہر سے قہوہ اور چائے آنے لگی تھی اور ان کے آتے ہی ملک میں قہوہ خانے کھلنے شروع ہو گئے تھے جو بعد کو قحبہ خانوں کا کام دینے لگے۔ وینس اور پیرس کی عورتوں کے لئے ممالک دور دراز سے عطریات آنے لگے۔ امریکہ سے تمباکو بھی آپہونچا۔ جسکے آتے ہی تمام یوروپ خصوصاً بلاد جرمن میں تمباکو کی دوکانیں کھل گئیں اور کسبیوں کو سگرٹ نوشی کا شوق ہوگیا، چنانچہ اسی وجہ سے

ابتک تمباکو پینے والی عورتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

قرون وسطی میں بھی منشی چیزوں کا استعمال ہوتا تھا لیکن سولھویں صدی سے تو شراب کا استعمال نمایاں طور پر بہت بڑھ گیا کیونکہ کاریگروں اور مزدوروں کے پاس بھی اسباب تعیش کے لئے روپیہ کافی موجود تھا۔

جس زمانہ کا ہم حال بیان کر رہے ہیں اس زمانہ میں شرابخانوں اور شراب کے گوداموں کا فحاشی سے بیحد تعلق ہو گیا تھا اور اٹھارھویں صدی میں ایسے میخانے جہاں لطف رقص و سرود بھی حاصل ہوتا تھا بہت ترقی کر گئے تھے

تجارت و حرفت کی ترقی سے ملک میں بڑے بڑے شہر پیدا ہونے لگے چودھویں صدی کے لندن کی آبادی صرف ۳۵ ہزار تھی لیکن ۱۶۰۰ء میں ڈھائی لاکھ ہو گئی، ۱۷۰۰ء میں سات لاکھ اور ۱۸۰۰ء میں دس لاکھ کے قریب ہو گئی۔ پیرس جو قرون وسطی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا، اسوقت اسکی آبادی ایک لاکھ نفوس تھی۔ جو ۱۷۰۰ء میں ۵ لاکھ ہو گئی اور انقلاب فرانس کے وقت یہی آبادی سات لاکھ کے قریب تھی۔ اسی طرح وائنا کی آبادی جو ۵۰ ہزار تھی ۱۸۰۰ء تک چوگنی ہو گئی۔ شہر ہیمبرگ عہد وسطی میں ایک اہم تجارتی شہر تھا اور اس وقت اسکی آبادی تقریباً ۱۰ ہزار ہوگی مگر یہی آبادی ۱۸۰۰ء تک ایک لاکھ ہو گئی۔ الغرض جو مقامات قرون وسطی میں محض چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے وہ ۱۸۰۰ء تک بڑے بڑے شہر بن گئے تھے۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ قوم کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا، بلکہ

دراصل گاؤں کی آبادی شہروں میں آگئی تھی۔

دور جدید کی ابتدائی صدیوں میں جوں جوں صنعت وحرفت، زراعت و فلاحت اور کاروبار و تجارت کو ترقی ہوتی گئی فحاشی بھی بڑھتی رہی کیونکہ انقلاب فرانس کے بعد بہت سے قیود رفع ہو گئے تھے اور قرون وسطی کے آئین و قوانین اور حرفتی پنچائتیں بھی رو بہ زوال تھیں۔

سولھویں صدی میں اسپین کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی خصوصاً اسوجہ سے کہ اسے نئے نئے ملک مل گئے تھے۔ ایک زمانہ میں یہاں کی نصف آبادی کی بسر اوقات تجارت وحرفت خصوصاً اونی اور ریشمی کپڑوں کی صنعت پر تھی۔ لیکن اسے بھی زوال ہو گیا کیونکہ مذہبی تعصبات سے مجبور ہو کر عیسائیوں نے ملک سے تمام مسلمانوں اور یہودیوں کو نابود کر دیا تھا اور یہ مشہور صنعت وحرفت انہی لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ تجارت اور حرفت میں جو کچھ ترقی ہوئی بھی ہے تو وہ حال ہی میں ہوئی ہے۔ بہت سے اطالوی شہروں کو جو قرون وسطی کے آخری زمانہ میں عروج پر تھے انھیں سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں زوال ہو گیا۔

عہد جدید کی ابتدائی صدیوں میں انگلستان اور یورپ کے نشیبی ممالک یعنی بلجیم اور ولندیز نے بہت جلد ترقی کی۔ بعد ازاں جرمنی خصوصاً ریاست پروشیا کو اہمیت حاصل ہوئی۔ جوں جوں قرون وسطی کی بیڑیاں کٹتی گئیں سائنسداں لوگ دل لگا کر کام کرنے لگے۔ ان لوگوں کے اکتشافات بہت جلد ایجادات و اختراعات جدیدہ کی بنیاد بنے گئے۔ یہ کانکی ترقیاں ہونے لگیں

جنھوں نے شہروں کی کایا پلٹ دی۔

انگلستان میں جو حرفتی انقلاب واقع ہوا وہ اٹھارھویں صدی کے آخری دس اور انیسویں صدی کے ابتدائی بیس سال کے اندر رونما ہوا۔ بعد ازاں یہ حرفتی انقلاب تمام یورپ امریکہ اور ایشیا تک وسعت پذیر ہو گیا۔ اس زمانہ میں مختلف قسم کی ترقی یافتہ مشینیں وجود میں آئیں۔ ذرائع نقل و حمل میں ترقی ہوئی، اور بڑے بڑے کارخانے تعمیر ہو گئے۔ مشینوں کی ایجاد سے حرفت کی یہ حالت ہو گئی کہ گاؤں کا ایک کسان یا شہر کا ایک کاریگر بہت سے آدمیوں کا کام جو پرانی وضع کے بھدے اوزاروں سے کام کرتے تھے، تن تنہا کر لیتا تھا۔ اس سے نہ صرف کامیاب سرمایہ داروں کے گھروں میں دولت کے انبار لگ گئے بلکہ عوام بھی مالدار ہو گئے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ قرون وسطیٰ کے بادشاہ کو بھی اتنا سامان راحت و آرام حاصل نہ تھا جتنا عہد جدید کے ایک گداگر کو حاصل ہو گیا۔ لیکن اس انقلاب کا ابتدائی زمانہ کاریگروں کے لئے نہایت سختی کا زمانہ تھا۔ کیونکہ مشینوں کی ایجاد نے ان کو بالکل نادار بنا دیا تھا اور انکی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔

مثلاً ایک جلاہے کو لیجئے کہ جب یہ خود کام کرتا تھا تو اسکے کارخانہ میں دو چار کاریگر بھی تھے، جن میں ہر شخص فی ہفتہ قمیص کے قابل دو تھان اتارتا تھا لیکن جب مشینیں چل گئیں جنکے ذریعہ سے ایک ناتجربہ کار بچہ بھی ایک ہفتہ میں ایسے تھان دس سے لیکر بیس تک اتارنے لگا تو قدرتی بات تھی کہ تھانوں کی قیمت ارزاں ہو جائے۔ لیکن اس مفعت عامہ سے اس غریب

جلاہہ کی کمر ٹوٹ گئی جسکا کاروبار بالکل تباہ ہوگیا اور مجبور ہوکر اپنے لڑکوں کو
دو چار آنے کی مزدوری پر کسی کارخانہ میں بھیجنا پڑا رہگئیں لڑکیاں سو جبتک
باپ کا کام اچھا چلتا تھا دنیا بھر کی نعمتیں حاصل تھیں لیکن اب بقدر کفاف
بھی انھیں میسر نہ تھا اسلئے وہ نہایت آسانی سے مکار کٹنیوں کے پھندے
میں پھنس جاتی تھیں اگر وہ کسی کارخانہ میں جاکر کام کرتیں تو وہاں بھی کوئی
عزت نہیں کرتا تھا، سرمایہ داروں کو جنکے گھر دولت کے انبار لگ گئے تھے
بہت بڑی سیاسی طاقت بھی حاصل ہوگئی تھی اسلئے انیسویں صدی کے
اوائل میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا جسکی رو سے گداگروں
کی اولاد کو کام کرنے پر مجبور کیا گیا اور پانچ پانچ چھ چھ سال کے لڑکوں اور لڑکیوں
کو روزمرہ تیرہ چودہ گھنٹہ تک مشینوں پر رکھا جانے لگا۔ مشینوں اور کارخانوں
کے نگران کار مزدوروں اور کاریگروں سے وہی برتاؤ کرنے لگے جو گرفتار شدہ
غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کارخانے صبح ۶ بجے کھلتے تھے اور اگر کسی جلاہہ
کی لڑکی رات کو دیر تک سوتی رہی یا بجائے ۶ بجے کے چھ بجکر دو منٹ پر پہونچی
تو ان کو چابک سے مارا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے جدید انگلستان میں چونکہ
کارخانوں کے مہتموں کو مزدوروں کے علیحدہ کردینے کے اختیارات حاصل تھے
اسلئے کام کرنیوالوں کے لئے اور زیادہ دشواریاں پیدا ہوگئیں۔ اسکے اور نتائج
بھی پیدا ہوئے ہوں لیکن ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جو لڑکیاں وہاں کام کرتی تھیں
انکا چال چلن خراب ہوگیا اور قحبہ خانے اُن سے آباد ہونے لگے۔

۱۸۴۸ء میں "لندن ٹائمز" کا ایک نامہ نگار شہر کے ایک محتاج خانہ

کا معائنہ کرنے گیا۔ اس نے دیکھا کہ تمام بچے تندرست اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ لیکن لڑکیاں وہاں موجود نہ تھیں۔ نامہ نگار نے مہتمم سے دریافت کیا کہ لڑکیاں کیا ہوئیں تو اُس نے جواب دیا کہ چودہ سال کی عمر میں لڑکیوں کو بطور خادمہ کام کرنے کے لئے باہر بھیج دیا جاتا ہے، لیکن سکا نتیجہ یہ ہوا کہ نوے فیصدی انہیں سے کوچہ گرد کسبیاں بنگئیں کیونکہ زمانۂ حاضر میں یوروپ کے اکثر ممالک میں قحبہ خانوں کی اہمیت بہت کچھ زائل ہو گئی ہے اور آزادانہ اِدھر اُدھر پھر کر فحاشی کرنے کے مواقع بہت حاصل ہو جاتے ہیں۔

قرونِ وسطیٰ میں انگلستان کے اندر حماموں نے قحبہ خانوں کا کام بہت زمانہ تک دیا اور یہ سلسلہ اٹھارھویں صدی تک جاری رہا لیکن سنہ ۱۸۰۰ء میں بعض ممالک میں ساحلوں پر تفریح گاہیں قائم ہو گئیں جو اس مشغلہ کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔

اسی طرح تھیٹر بھی بہت دنوں تک یہ خدمت انجام دیتے رہے، چنانچہ شیکسپیر کے زمانہ میں بھی انگلستان کے لئے تھیٹر قحبہ خانوں کے قریب ہی ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تھیٹر کی زندگی معیوب سمجھی جاتی تھی اور اسٹیج پر کوئی عورت کام نہیں کرتی تھی۔ تماشائی بھی اکثر مصنوعی چہرے لگا کر آیا کرتے تھے اور اس طرح کسبیوں کو بھی مصنوعی چہرے لگا کر تھیٹر میں جانے کا موقع مل جاتا تھا۔ جب انگلستان میں دوبارہ ملوکیت دوبارہ قائم ہو گیا تو تھیٹروں اور پیشہ ور عورتوں میں اور زیادہ تعلق پیدا ہو گیا۔ یعنی عورتیں بھی تھیٹروں میں زنانہ پارٹ کرنے لگیں، جن میں اکثر کا چال چلن اچھا نہیں ہوتا تھا۔ سترھویں اور اٹھارھویں

صدی میں فرانس کے اندر مشتبہ چلن کی ایکٹرسیں بہت مشہور تھیں اور تھیٹروں کی غلام گردشوں اور گیلریوں میں کسبیوں کا ہجوم ہو جاتا تھا۔

## فرانس ۱۵۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک

فرانسیس اول کے عہد میں (۱۵۱۵ء سے ۱۵۴۷ء) تک فرانس اور خصوصاً دربار شاہی پر اطالوی اثرات بہت زیادہ قائم تھے اور لوئی چہاردہم کا جانشین ہنری دوم تو حد درجہ رنگیلا فرمانروا تھا اور اسکے دربار میں عیش و نشاط کی غیر فطری صورتیں بھی ممنوع نہ تھیں۔

کیتھرائن ڈی میڈلیائی (Catherine De Medici) جسکا آئندہ تین سلطنتوں میں بہت کچھ اثر رہا، اپنے ساتھ اطالیہ سے سیکڑوں کسبیاں فرانس میں لے آئی تھی اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ان عورتوں سے سیاسی کام لیا کرتی تھی یعنی اُن کو حکم تھا کہ وہ مدبرین دربار سے ملکر انکے راز معلوم کرتی رہیں۔

چارلس نہم کے عہد میں ایک قانون پاس کیا گیا کہ پیرس کے تمام قحبہ خانے توڑ دیئے جائیں اور خلاف ورزی قانون کے لئے سزائے چوب زنی یا گرم لوہے سے داغ دینا مقرر کیا گیا۔ اس سے وہ قحبہ خانے تو بند ہو گئے جن میں کھلم کھلا فحاشی ہوتی تھی لیکن خفیہ طور پر یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ ۱۶۳۵ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس میں اُن مردوں کے لئے جو کسبیوں کے ذریعہ سے کسب معاش کرتے تھے سترھویں صدی میں بعض فرامین ایسے جاری کئے گئے جنکی رو سے اُن مردوں کو سزائے جرمانہ دیجاتی تھی جو قحبہ خانوں میں آتے جاتے

تھے، لیکن سوائے ایک مرتبہ کے عملاً ان فرامین کا نفاذ کبھی نہیں ہوا
پولیس کو بہت وسیع اختیارات دیدئے گئے تھے، اور کئی بار پولیس نے
ان اختیارات سے کام لیکر پیرس کی پیشہ ور عورتوں کو گرفتار کرکے فرانس کی
امریکائی نوآبادیات میں بھیجدیا جن میں سے بعض نے تو خوشحال لوگوں سے
نکاح کرلیا لیکن بعض نے اپنے پیشہ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا
لوئی چہاردہم کے زمانہ میں تقریباً بیس برس تک پیرس کے لوگوں کے
اخلاق غنیمت رہے یعنی علانیہ فحاشی تقریباً مفقود ہوگئی اور تھیٹروں میں بھی بیہودہ
مذاق قطعی بند ہوگیا تھا۔ لیکن لوئی پانزدہم کی کمسنی کے زمانہ میں جب ریجنسی
برسر اقتدار تھی پھر دور فحاشی شروع ہوا اور جب لوئی پانزدہم بڑا ہوگیا تو اس نے
حد درجہ رنگین زندگی بسر کرنی شروع کی چنانچہ اس بادشاہ نے اپنے لئے ایک
خاص عیش خانہ تعمیر کرایا اور پوری طرح داد عیش دی
اسکے بعد لوئی شانزدہم اور اسکی ملکہ نے درستی اخلاق میں سختی سے کام لیا
لیکن باینہمہ بہت شہزادوں اور بڑے بڑے اُمرا نے لوئی چہاردہم اور
لوئی پانزدہم کی جوانی کی روایات کو بدستور قائم رکھا اور پرائیوٹ عیش خانے
جنھیں "خورد محل" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا منہدم نہ ہو سکے اور بعد کو یہ ایک
فیشن ہوکر رہگیا۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں جب ایک جرمن سیاح
پیرس کی سیر کرنے گیا تو یہ بات دیکھکر حیران رہگیا کہ کتنی بڑی تعداد آدمیوں کی فحاشی
کے ذریعہ سے بسر اوقات کرتی تھی۔ بہت سے والدین اپنی لڑکیوں کو فحاشی پر
مجبور کرتے تھے کیونکہ لوئی پانزدہم کے گماشتے حسین، نوجوان اور نوخیز لڑکیوں

کے لئے بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے تھے اور اسی کے ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ کسی لڑکی کا بادشاہ کی معشوقہ بننا کوئی ذلت کی بات نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اسی زمانہ میں تعزیری قوانین بھی فحاشی کے خلاف جاری تھے، لیکن انکا نفاذ صرف غربا کے خلاف ہوتا تھا اور امرا اور رؤسا عملاً مستثنیٰ تھے۔

اٹھارھویں صدی کے قحبہ خانوں میں فرانسیسی، ہسپانوی، دولندیزی اور جرمن تمام اقوام و ملل کی لڑکیاں پائی جاتی تھیں یہاں تک کہ حبشی لڑکیاں بھی رکھی جاتی تھیں قحبہ خانوں کی بعض لڑکیاں اوسط درجہ کے اچھے گھرانوں کی ہوتی تھیں، اور بعض راہبہ خانوں سے بھگائی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان قحبہ خانوں کو خوب شہرت دیجاتی تھی۔ اور ان کے ایجنٹ غیر ملکی یا اجنبی سیاح کے سامنے ایک کارڈ پیش کر دیتے تھے جس پر قحبہ خانہ کا پتہ اور وہاں کی خصوصیات درج ہوتی تھیں۔

قحبہ خانوں کے منیجر چونکہ سامان خورد و نوش اور شرابیں بھی فروخت کرتے تھے، اسلئے ان کو بڑی معقول آمدنی ہوتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ قحبہ خانے قمار خانے بھی بنجاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ جس عیش خانہ کا نام پیلے رائل (Palais Royal) ہے وہاں ہر شب ڈیڑھ ہزار عورتیں جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ اس جگہ تھیٹر بھی تھے قہوہ خانے بھی تھے، فیشن ایبل دوکانیں بھی تھیں اور آراستہ کمرے بھی تھے جن میں عورتیں رہتی تھیں بہت سے خوش وضع لوگوں نے اس مقصد کے لئے باقاعدہ کلب بنا رکھے تھے۔

استیصال ملوکیت کے بعد فرانس میں جو دور آزادی کا آیا اس میں جمہوریت نے جسقدر آزادی اس پیشہ کو دیدی اتنی بادشاہوں نے بھی کبھی نہ دی تھی۔ چونکہ اس زمانہ میں لوگوں کی زندگی ہر وقت خطرہ میں تھی اسلئے لوگ یہ سمجھکر کہ چند روزہ زندگی میں جسقدر مزے اُڑائے جاسکتے ہیں، اڑالئے جائیں، بری طرح شہوت رانی میں مبتلا ہوگئے تھے۔ ایک مرتبہ کسبیوں پر الزام عائد کیا گیا کہ یہ طرفداران ملوکیت میں سے ہیں کیونکہ جو بڑی بڑی رقمیں انھیں بادشاہ یا امرار کے ہاتھوں ملتی تھیں وہ دور جمہوریت میں کہاں نصیب ہوسکتی ہیں لیکن آخر کار فتح کسبیوں ہی کو حاصل ہوئی اور حکومت کی طرف سے اجازت ہوگئی کہ جہاں چاہیں پھریں اور جو چاہیں کریں لیکن ۱۷۹۵ء میں یہ طریقہ جاری ہوا کہ ان کے نام درج رجسٹر کئے جانے لگے اور انکا باقاعدہ معائنہ باوقات مقررہ ہونے لگا پھر بعد کو یہ قاعدہ بہت جلد تمام بلاد یورپ میں جاری ہوگیا

بعض مورخین لکھتے ہیں کہ ۱۸۱۰ء میں بمقام پیرس تقریباً بیس ہزار کسبیاں موجود تھیں ۱۸۳۲ء میں شہر کے اندر ایسے قحبہ خانے جو سرکاری رجسٹروں میں درج تھے ۲۲۰ تھے۔ اور ایسی عورتوں کو بازاروں، گرجاؤں، اسکولوں یا طلبہ کی اقامتگاہوں کے قریب رہنے کا حکم نہیں تھا۔ ہر قحبہ خانہ ایک عورت کے اہتمام میں ہوتا تھا جسکا نام پولیس میں درج رہتا تھا۔ یہ عورت وہ ہوتی تھی جو کبھی خود بھی پیشہ ور رہچکی تھی لیکن کسی جرم میں سزایاب نہیں ہوئی تھی۔ اسکو حکم تھا کہ وہ قحبہ خانہ کی ہر عورت کا رجسٹر رکھے اور منجملہ دیگر امور کے یہ بھی لکھا کرے کہ سرکاری طبیب نے اسکا معائنہ کن تاریخوں میں کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بھرتی کرنے کا خاص میدان (Hospital-Du-Midi) تھا جہاں امراض متعدیہ میں مبتلا ہونے والی عورتوں کا علاج ہوتا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں کسبیوں کی بہت بڑی بین الاقوامی تجارت بھی پائی جاتی تھی جسکا تعلق لڑکیوں کی خرید و فروخت سے تھا

۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۰ء میں پیرس کی کسبیوں کو تنخواہ کچھ نہیں ملتی تھی، بلکہ صرف کھانا کپڑا اور رہنے کو مکان ملتا تھا۔ اگر انھیں کوئی چھوٹا موٹا زیور یا کوئی اور سامان تعیش درکار ہوتا تھا تو وہ مہتممہ سے قرض لے لیا کرتی تھیں۔ اور چونکہ یہ ان سے کبھی ادا نہ ہو سکتا تھا اسلئے وہ بیچاریاں غلام بنی ہوئی قحبہ خانہ میں پڑی رہتی تھیں۔ چھوٹی عمر کی لڑکیوں کو قحبہ خانہ میں داخل کرنے سے قبل انکے والدین کی اجازت لینی پڑتی تھی۔

## انگلستان ۱۵۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک

سولھویں صدی کے اندر انگلستان میں کئی بار انسداد فحاشی کی کوشش کی گئی۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیکسپیر کے زمانہ میں عورتوں کو بجرم فحاشی تازیانے مارے جاتے تھے لیکن پھر بھی ان کی تعداد کافی تھی۔ (ملاحظہ ہو ہنری چہارم حصہ دوم

عیسائیوں کے فرقۂ پیورٹن (Puritans) نے کسبیوں کے خلاف نہایت تشدد آمیز آئین و قوانین اختیار کئے یعنی ۱۶۰۰ء میں ایک قانون وضع ہوا جسکی رو سے قرمساقوں کو سر عام کوڑے مارے جاتے تھے

یا انھیں شکنجہ میں کس دیا جاتا تھا۔ یا تو ہاگرم کرکے ان کی پیشانی پر حرف B داغ دیا جاتا تھا، یا انھیں تین سال کی قید کردیجاتی تھی اگر ایسا شخص دوبارہ ماخوذ ہوتا تھا تو اسکو قتل کردیا جاتا تھا۔

جب شاہ چارلس دوم آوارۂ دشت غربت ہوکر واپس آیا تو اسکے رنگیلے سربازوں نے یہ تمام طریقے درہم برہم کردیئے اور پھر رنگ رلیاں شروع ہوگئیں لیکن طبقہ متوسط پر اسکا بہت کم اثر پڑا۔

چارلس کے بعد جیمس دوم تخت نشین ہوا جو یقیناً پارسا تو نہ تھا لیکن چارلس کی طرح عیش کوش بھی نہ تھا۔ اسکے بعد جارج سوم کا زمانہ آیا جو بہت محتاط تھا لیکن جارج چہارم ایسا نہ تھا بلکہ وکٹوریا کے زمانہ میں عصمت و عفت کا بڑا لحاظ تھا اور وہ فحاشی کے رواج کو بہت ناپسند کرتی تھی

**جرمنی سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک**

یہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ جب مذہب "لیوتھر" کو عروج ہوا تو سولھویں صدی کے اندر سلطنت روم کے بہت سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ حصوں میں انسداد فحاشی کے متعلق سخت قوانین جاری کئے گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انکا مقصد خاص طور سے ارباب کلیسہ کے اخلاق کو درست کرنا تھا۔ سنہ ۱۵۳۳ء میں چارلس پنجم نے ایک فرمان جاری کیا کہ قحبگی کے رواج دینے والوں کو کوڑے مار کر یا کان کاٹکر ملک سے باہر نکال دیا جائے جرمنی میں بھی اسی قسم کے احکام جاری ہوئے لیکن نتیجہ کچھ نکلا۔

سترھویں صدی میں ہیمبرگ اور دیگر بلاد جرمنی میں ایسے کارخانے

قائم کئے گئے جن میں نقص امن کا باعث ہونے والی کسبیاں قید رکھی جاتی تھیں
اس سے پہلے ان عورتوں کو یا تو شہر سے نکال دیتے تھے، یا کوڑے مارے جاتے
تھے، یا انھیں شکنجہ میں کس دیا جاتا تھا۔ قید خانوں میں ان سے سوت کتوایا
جاتا تھا۔ یا کوئی دوسرا سخت کام لیا جاتا تھا۔ لیکن فحاشی موقوف نہ ہوئی
سترھویں صدی میں بعض بعض جگہ انکو پنجروں میں بند کر دیا جاتا یا لکڑی
کے گھوڑے پر بٹھا کر شہر میں گشت کرایا جاتا تھا۔ شہر وائنا میں بھی اس غرض
کے لئے ایک قفس بنایا گیا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سزائیں انکو شرم
وغیرت دلانے اور رسوا کرنے کے لئے دیجاتی تھیں انکا اثر الٹا پڑتا تھا کیونکہ
پھر انکے لئے کوئی اور صورت زندگی کی باقی ہی نہ رہتی تھی۔

انقلاب فرانس کی وجہ سے جرمنی میں فحاشی کا اور بھی زیادہ زور
ہو گیا کیونکہ فرانس سے جو امرا، فرار ہو کر جرمنی میں پناہ گزیں ہوئے وہ اسی
طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو اس طبقہ کے بڑے قدردان تھے۔ کہتے ہیں کہ جب
ان لوگوں نے شہر کوبلینز (Coblenz) میں قدم رکھا تو شہر کا ہر بوڑھا خانہ
قحبہ خانہ بنگیا۔ اور چند روز میں وادی دریائے رہائن کے تمام شہروں میں
آتشک کی بیماری پھیل گئی جسکا نام "تارکان وطن کا تحفہ" رکھا گیا۔

جو لوگ فرانس سے ہجرت کرتے وقت بہت کم روپیہ اپنے ساتھ لائے
تھے یا خالی ہاتھ تھے ان سے محنت مزدوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اسلئے ان میں
بہت سے دلال بنگئے۔ شہر ہیمبرگ میں فرانسیسیوں نے وہ شائستہ طریقے
قحبہ خانوں میں جاری کئے جو اس سے پیشتر خواب وخیال میں بھی نہ آئے تھے

## ۳۵۲

اسی زمانہ کا ایک مصنف تحریر کرتا ہے کہ :۔ "شرابخانے بارہ دری بنگلے ۔ اور ہماری لڑکیاں بیگمات بنگئیں ۔ الغرض ان بدچلن پناہ گزینوں نے ہم سبکو "مدنستعلیق" کردیا ۔ عیاشوں کے گروہ بلا روک ٹوک ہمارے دلپسند بازاروں میں تیز گامیاں دکھانے لگے ۔ شرم وحیا اور شرافت و نجابت منہ پھیر کر بھاگ گئیں اور جو چند بھلے آدمی رہگئے تھے وہ دیکھ دیکھکر افسوس کرتے تھے "

۱۸۰۷ء میں شہر ہیمبرگ کے ارباب حل وعقد نے فحاشی کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا اور کسبیوں پر ٹیکس لگاکر انکو حکم دیا گیا کہ اپنے نام پولیس کے رجسٹر میں درج کرائیں ۔ اور بہ اوقات مقررہ باقاعدہ معائنہ کرائیں ۔ ٹیکس کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ نفاذ احکام کے مصارف نکالکر میونسپل اسپتال میں خرچ ہوتی تھی ۔ ۱۸۳۴ء میں ہیمبرگ کے ڈائرکٹر سررشتۂ پولیس ہڈوالکر نے "نیلی کتاب" کے نام سے ایک مجموعۂ ضوابط جاری کیا جسکی رو سے ہر کسبی خواہ وہ علٰحدہ کمرہ میں رہتی ہو یا قحبہ خانہ میں خود کو پولیس میں درج رجسٹر کراتی تھی اور ہر ایسے گھر میں جہاں فحاشی ہوتی تھی کم از کم ایک عورت ضرور رکھنی پڑتی تھی جو درج رجسٹر ہو ۔ اور پولیس کو پورا اختیار بھی حاصل تھا ۔ جو عورتیں بطور مدخولہ یا حرم رکھی جاتی تھیں انھیں بھی رجسٹر میں درج کرانا پڑتا تھا لیکن وہ باقاعدہ طبی معائنہ کے لئے مجبور نہ تھیں ۔ بیس برس سے کم عمر کی لڑکیوں کو جو پہلے سے پیشہ نہیں کرتی تھیں انھیں درج رجسٹر ہونے سے باز رکھا جاتا تھا بشرطیکہ وہ پہلے سے آبرو باختہ نہ ہوں اور اس پیشہ کے سوا اور کوئی ذریعہ انکی معاش کا نہ ہو ۔ پچیس سال سے کم عمر کی کسی عورت کو بشرطیکہ وہ

۳۵۳

بحیثیت ایک کسبی کے درج رجسٹر نہ ہو کسی قحبہ خانہ میں خادمہ کی حیثیت سے نہیں رکھا جاتا تھا دس برس سے زیادہ عمر کے بچوں کو بھی قحبہ خانہ میں رہنے کی اجازت نہ تھی۔ بازاروں یا سڑکوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بلانا ممنوع تھا۔ اور کسی کسبی کو رات کو گیارہ بجے کے بعد کسی مرد کو ساتھ لے لیکر باہر شہر میں پھرنا ممنوع تھا بیس برس سے کم عمر کے مردوں کو قحبہ خانہ میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ کسی قحبہ خانہ میں گانے بجانے یا جوا کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں اور شرابوں کی فروخت کے لئے خاص لائسنس لینا پڑتا تھا۔ تمام درج رجسٹر عورتیں ہفتہ میں ایک بار ضرور اپنا طبی معائنہ کراتی تھیں۔

۱۷۸۶ء کے بعد سے ریاست پروشیا میں "معصیت ناگزیر" سمجھکر فحاشی کی طرف سے چشم پوشی کی جانے لگی۔ پھر ۱۷۹۲ء میں جدید قانون جاری کیا گیا۔ جسکی رو سے کسبیوں کو چہرہ پر غازہ ملنا یا جاذب نظر لباس پہننا ممنوع قرار دیا گیا۔ جو عورتیں اول اول پیشہ اختیار کرنا چاہتیں انھیں اپنا نام پولیس کے رجسٹر میں درج کرانا پڑتا تھا۔ اطبا تمام ایسی عورتوں کو امراض شنیعہ کی علامت بتا دیتے تھے تاکہ وہ خود اپنے اندر یا آنے جانے والوں میں انکو پہچان سکیں۔ خلاف ورزی قانون کی صورت میں بڑی سی بڑی سزا تین سال کی قید تھی اور جیلخانہ میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے وقت کوڑے لگائے جاتے تھے۔ جو والدین یا استانیاں اپنی لڑکیوں یا شاگردوں سے پیشہ کراتی تھیں انھیں کارخانہ میں چھ سال کے لئے بند کر دیا جاتا تھا۔ جو مرض شنیعہ میں مبتلا ہو کر پبلک قحبہ خانوں میں آتے تھے اور ان سے کسی کسبی کو بیماری

لگ جاتی تھی تو انھیں علاج کا تمام خرچ دینا پڑتا تھا۔ سزائے جرمانہ یا قید علٰحدہ دیجاتی تھی۔

۱۸۰۸ء میں برلن کے اندر پچاس قحبہ خانے موجود تھے جن میں ۲۳۰ کسبیاں رہتی تھیں۔ علاوہ ازیں ۲۰۳ ایسی درج رجسٹر تھیں جو الگ مکانوں میں رہتی تھیں۔ اسوقت شہر کی آبادی غالباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔

۱۸۱۴ء میں جب برلن کے قحبہ خانے بند کر دیے گئے تو شہر میں بڑا جوش پھیلا کیونکہ پرائیوٹ طور پر فحاشی بہت بڑھ گئی تھی اور اسی کے ساتھ آتشک بھی آخر کار فحاشی کو قانوناً پھر جائز تسلیم کر لیا گیا اور وہی پرانا طریقہ پولیس کی نگرانی کا دوبارہ جاری ہو گیا۔

۳۵۵

# اخلاق جنسی

## ماضی ـــــ حال ـــــ مستقبل

**ماضی** شہوانیات یا جنسیات (Sexology) کے طالبعلم پر یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ اخلاق کا مفہوم مختلف قوموں اور زمانوں میں ہمیشہ مختلف رہا ہے یعنی اگر کوئی بات کسی قوم میں کسی وقت معیوب رہی ہے تو دوسری قوم میں اسکو مستحسن سمجھا گیا ہے بلکہ خود ایک ہی قوم نے مختلف زمانوں میں مختلف معیار اخلاقیات کا قائم کیا ہے۔ آج اہل یوروپ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے عورت کے احترام و اقتدار قائم کرنے میں غیر معمولی حصہ لیا، لیکن انھیں لوگوں پر ایک زمانہ وہ بھی گزر چکا ہے جب عورت ان کے نزدیک بھیڑ بکری سے زیادہ کوئی بلند چیز نہ تھی، اور ایک جائداد منقولہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ اسوقت بھی حسب بیان سر لوبک (Lubbock) آسٹریلیا میں اسکی تقریباً یہی حالت ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر اسکو مارنا، حد درجہ وحشیانہ سلوک اسکے ساتھ کرنا معمولی بات ہے، اور اگر بدقسمتی سے وہ کچھ حسین ہوئی تو اور قیامت ہے۔ افریقہ کا حال لٹورنیو (Letourneau) نے لکھا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی ملکیت سمجھی جاتی ہے اور مرد کو اختیار ہے

۳۵۶

کہ اس سے باربرداری کے جانور کا کام لے۔ اسی طرح ہمالیہ کے حصوں میں آریہ ہندوؤں نے تبتی قوموں کی طرح اشتراک فی النسواں اختیار کر رکھا ہے اور بازار کی دوسری جنسوں کی طرح عورت کی بھی خرید و فروخت انکے یہاں رائج ہے۔ وہ اپنی لڑکیوں کو بھی فروخت کر دیتے ہیں اور متعدد بھائی صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کر لیتے ہیں جسے وہ حسب موقعہ و ضرورت دوسروں کو بھی کرایہ پر دیدیتے ہیں۔

نیوزیلینڈ میں لڑکی کا نکاح کرتے وقت باپ یا بھائی اسکے شوہر سے کہتا ہے کہ "دیکھو اگر تم اس سے مطمئن نہ ہو تو تمھیں اختیار ہے چاہے فروخت کر دو، چاہے مار ڈالو یا کھا جاؤ، الغرض تم اسکے مالک و مختار ہو"

پھر یہ حال صرف اُن قوموں کا نہیں جو اب بھی جاہل و وحشی سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ان پر بھی گزر چکا ہے جو آج تہذیب و شائستگی کی علمبردار بنی ہوئی ہیں چنانچہ روما کے قرون اولیٰ میں بھی بیوی محض ایک لونڈی کی حیثیت رکھتی تھی اور مقدس کاٹو (Cato) کے اس تاریخی واقعہ سے غالباً ناظرین آگاہ ہونگے کہ اُسنے اپنی بیوی مارشیا (Marcia) اپنے ایک دوست ہارٹن سیس (Hortensius) کو اُدھار دیدی تھی اور پھر اسکی موت پر واپس لیلی۔ الغرض انکے یہاں بیوی کی کوئی جداگانہ حیثیت نہ تھی اور بازار کی دوسری معمولی جنسوں کی طرح اسکا لین دین ہو سکتا تھا

خود انگریزی قانون میں کسی وقت اس امر کی اجازت پائی جاتی تھی کہ ہر شوہر اپنی بیوی کو لکڑی سے زدوکوب کر سکتا ہے بشرطیکہ لکڑی انگوٹھے سے زیادہ

۳۵۷

موٹی نہ ہو۔

اسوقت ماں، بیٹی، بہن یا اسی طرح کی کسی اور قریبی رشتہ کی عورت سے نکاح کرنا ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن عہد عتیق میں اسکو معیوب نہیں جانتے تھے۔ اسٹرابو Strabo، کا بیان ہے کہ ۶۶ سال قبل مسیح عربوں میں اپنی بہنوں اور ماؤں کے ساتھ تعلق جنسی رکھنا کوئی امر قبیح نہیں سمجھا جاتا تھا، کیونکہ عہد قدیم میں تعلق جنسی محض ضرورتاً آبادی بڑھانے کے لئے پیدا کیا جاتا تھا اور اس میں کوئی خیال لذت و بدمستی کا شامل نہ تھا۔ چنانچہ تمام ابتدائی مذاہب میں اسکا کچھ نہ کچھ شائبہ پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے یہاں برہما کا اپنی بیٹی سرسوتی سے شادی کرنا، مصریوں میں آمون کا اپنی ماں سے نکاح کرنا، اوڈین کا اپنی لڑکی فریگا Frigga سے قبالۂ عقد میں لے آنا، جوپٹر کا اپنی بہن جونو Juno، سے شادی کر لینا، صنمیات کے کھلے ہوئے واقعات ہیں۔

اجتماعی تعلق بھی کسی زمانہ میں بہت عام تھا۔ ہیروڈوٹس نے ماساگیٹ Massagetae، قوم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے یہاں ایک شخص ایک عورت سے شادی کرتا ہے لیکن پوری جماعت اس سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ رواج اور اقوام میں بھی پایا جاتا تھا یہانتک کہ مصریوں اور یونانیوں میں بھی اسکو برا نہ جانتے تھے۔ چنانچہ بابل میں یہ مذہبی دستور تھا کہ لڑکی مائلیتا دیوی کے معبد میں جاکر اپنی عفت و دوشیزگی قربان کر دیتی تھی اور اسی نوع کی رسمیں آرمینیا، ثائر، اور سڈون میں بھی پائی جاتی تھیں،

لبیان کی لڑکیاں شادی سے قبل تمام مصارف نکاح اسی طرح کماتی تھیں اور فرشیا میں بھی یہی رواج پایا جاتا تھا۔

اسوقت بھی جزائر مارکوئساس (Marquesas Islands) میں جو جزائر فلپائن کا حصہ ہیں اور بعض افریقی قبائل میں اس طرح کا دستور موجود ہے۔ حال کی بات ہے کہ جزائر بلیرک (Balearic Islands) میں عام طور پر یہ رواج قائم تھا کہ شب زفاف میں پہلے دلہن کے تمام مرد اعزہ ترتیب عمر کے لحاظ سے مستفید ہوتے تھے اور پھر سب سے اخیر میں دولھا کو جانے کی اجازت ملتی تھی۔

ملابار میں کلیمر قوم کے لوگ اپنی بیویوں کو بارآور بنانے کے لئے مذہبی پوجاریوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور سنی گمبیا (Senigambia) میں اس خدمت کو سردار قبیلہ انجام دیتا ہے۔ بعض قوموں میں اس غرض کے لئے مخصوص بت بنائے جاتے ہیں۔ اور "حق شب اولیں" (Jus primae Noctis) کا معاملہ یوروپ کے ازمنہ وسطی میں بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔

یونانی تہذیب کی انتہائی ترقی کے زمانہ میں سیفو (Sappho) اور اسکے شاگردوں کا غیر فطری استلذاذ بالنفس میں مشغول رہنا اور سقراط و فلاطون کا بھی مردوں کے لئے اس حرکت کو مناسب و جائز قرار دینا ——

الغرض عہد قدیم میں اخلاق انسانی خواہ وہ جنسیات سے متعلق ہوں یا زندگی کے کسی اور شعبہ سے زیادہ تر مذہبی خیالات کے زیر اثر قائم ہوئے اور دماغ

انسانی نہ ان کے اسباب پر غور کر سکا اور نہ انجام و عواقب پر۔ لیکن بعد کو جب عقول انسانی نے ترقی کی تو اسنے کچھ نظریے بھی بنائے، دستور العمل بھی مرتب کیا اور علمی و فنی حیثیت سے اسقدر قدم بڑھایا۔ اور اس باب میں زیادہ تر ہم اسی مسئلہ پر روشنی ڈالینگے کہ اہل یورپ جو تہذیب و شائستگی کے بڑے مدعی ہیں اور جو اپنے آپ کو عورت کا بڑا محسن سمجھتے ہیں اس باب میں کیا کیا اور آج کیا ہو نیوالا ہے۔

## توریت اور اخلاق جنسی

موجودہ عیسوی اخلاق جنسی توریت کے بیان کئے ہوئے اخلاق پر قائم ہے جس میں انجیل کے بیانات اور دیگر تعبیرات و تفسیرات کے مطابق کچھ حذف و اضافہ کر لیا گیا ہے توریت میں اخلاق جنسی کی ابتدا اس اصول کی بنا پر ہوتی ہے کہ مرد عورت کے درمیان تعلق جنسی افزائش نسل کے خیال سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ توریت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے زائد بیویاں کرنے کا رواج اسوقت قائم تھا اور رائج تھا دو بیویاں رکھنا توریت سے ثابت ہے۔ لیکن اسقف اعظم کو صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت تھی۔ بعد کو بادشاہوں کے لئے بھی یہی حکم نافذ کیا گیا بلکہ سونے اور چاندی کی چیزیں بھی ممنوع الاستعمال قرار دیگئیں لیکن بادشاہوں نے نہ اسکی پرواہ کی نہ اسکی۔ چنانچہ داؤدؑ کا متعدد بیویاں رکھنا اور سلیمانؑ کا ۳۰۰ کنیزیں رکھنا توریت سے ثابت ہے قریب رشتہ کی عورتوں سے تعلق زناشوئی قائم کرنا بھی توریت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ ابراہیمؑ کا اپنی سوتیلی بہن سارہ سے نکاح کرنا توریت میں لکھا ہوا ہے

اور لوائٹ د تعا نے رسوم کے، قوم کا قانون ایک مرد کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی بیوہ سے شادی کرے۔ ابراہیمؑ کے ایک بچہ ان کی بیوی کی خادمہ سے بھی ہوا اور یعقوبؑ نے دو بہنوں سے شادی کی اور انکی دو کنیزوں سے بھی انکے اولاد ہوئی۔

عبرانی قانون میں بیوی، شوہر کی ملکیت ہوتی تھی اور وہ شوہر کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہ کر سکتی تھی۔ طلاق کا رواج تھا لیکن صرف مرد کی طرف سے باپ کے اختیارات اولاد پر غیر محدود ہوتے تھے یہاں تک کہ وہ انکو ہلاک بھی کر سکتا تھا (لیکن عمل ہلاکت زیادہ تر لڑکیوں ہی تک محدود رہتا تھا)۔ وہ لڑکیوں کو فروخت بھی کر سکتا تھا اور ان پر شوہروں کو وہی حق حاصل ہوتا تھا جو کسی جائداد پر حاصل ہوتا ہے۔ عام معاشرت میں عورت کی عصمت و عفت کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھی، کیونکہ شادی شدہ عورت و مرد کے ناجائز تعلق پر تو قتل تک کی سزا متعین تھی لیکن دوشیزہ ہونے کی حالت میں عورت سے کوئی باز پرس نہ ہوتی تھی ——— لوطؑ کا جو قصہ توریت میں درج ہے اس سے پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی عصمت کا خیال اس وقت اسقدر ضعیف تھا کہ مہمانوں کے سامنے انھیں پیش کر دیا جاتا تھا ——— الغرض یہ تھا عورت کا مرتبہ اور اخلاق جنسی عہد عتیق کا جس پر عیسویت نے اپنے اخلاق کی بنیاد قائم کی۔

**انجیل اور اخلاق جنسی**

مسیح نے جو تعلیم اخلاق جنسی کی پیش کی وہ اور زیادہ عجیب و غریب تھی کیونکہ احتیاط کی وہ حد جو انھوں نے بیان کی کسی طرح قابل عمل نہ تھی۔ آپ نے فرمایا کہ: "اگر کوئی شخص کسی عورت

کو بُری نگاہ سے دیکھتا ہے تو گویا وہ اسکے ساتھ ارتکاب معصیت کا مجرم ہوتا ہے"
اسی طرح طلاق کے متعلق انکا یہ ارشاد تھا کہ "جو شخص بغیر الزام عصمت فروشی کے
کسی عورت کو طلاق دیتا ہے وہ گویا اسے فحش پر مجبور کرتا ہے اور جو کوئی دوبارہ
مطلقہ عورت سے شادی کرتا ہے، وہ بھی حرامکاری کا مجرم ہوتا ہے" ظاہر ہے کہ
عملی دنیا میں یہ دونوں باتیں ناممکن العمل ہیں۔ نہ اسقدر احتیاط ممکن ہے اور
نہ اسقدر ضبط۔ کسی عورت کو دیکھکر بُرا خیال دلمیں لانا اگر واقعی اسی قسم کی
فحاشی ہے جس میں ایک شخص کی گردن جدا ہو جانا چاہیئے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ
کسی وقت دنیا میں مرد کے وجود کو باقی نہ رہنا چاہیئے تھا اور اگر طلاق کے لئے
صرف عورت کی عصمت فروشی ہی جائز سبب ہو سکتا ہے تو معاشرت کے
اطمینان کی پھر کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ مرد و زن کی باہمی جدائی کے اور بھی
سیکڑوں سبب ہو سکتے ہیں جنکا لحاظ حسب تعلیم مسیح ہونا نہ چاہیئے۔ پھر یہ تعلیم
اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ تعلق جنسی کی مخالفت میں اس حد تک غلو سے کام
لیا جاتا ہے کہ "خدائی سلطنت" کا دعویدار صرف مخنثوں، ہیجڑوں اور نامردوں
ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔ اسکے بعد پال نے جو درس پیش کیا اس سے بھی عورت
کی غیر اہمیت ثابت ہوتی ہے کیونکہ شوہروں کی اطاعت اُن پر فرض قرار دیگئی اور
کلیسہ میں خاموش رہنے کا انکو حکم دیا گیا، کیونکہ شوہر عورتوں کے جسم کا نجات دہندہ
ہے جس طرح مسیح روح کے نجات دہندہ تھے۔ پیٹر کی تعلیم بھی اس باب میں کچھ
زیادہ بلند نہ تھی، کیونکہ اس نے بدرجۂ مجبوری شادی کو پسند کیا ورنہ وہ رہبانیت
مطلق کا قائل تھا۔

ابتدائی عیسویت میں عورت ناپاک سمجھی جاتی تھی اور دنیا میں تباہی لانیکا باعث اسی کو قرار دیا جاتا تھا۔ ٹرٹولین (Tertullian) عورت کو دوزخ کا دروازہ بتاتا ہے اور ہیرونمس (Hieronymus) شادی کو بری عادت قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اوریجنس (Origenus) نکاح کو معصیت بتاتا ہے اور ٹامس اکوناس (Thomas Aquinas) اخیر تیرھویں صدی میں عورت کو ایک مضرت رساں پیداوار سے تعبیر کرتا ہے۔

الغرض یہ دور اس قسم کی تعلیم ہے جو انیس صدیوں سے یوروپ کی مہذب دنیا کے سامنے پیش کی جارہی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس تعلیم پر کس حد تک عمل کیا گیا یا کیا جا سکتا تھا۔ اسکا جواب وہاں کے موجودہ اخلاق کو سامنے رکھکر بہ آسانی دیا جا سکتا ہے

ظاہر ہے کہ جس تعلیم میں انسانیت کا اعلیٰ معیار مردوں کے لئے ننگ و ننگ ہو اور جو عورت کو "دوزخ کا دروازہ" "مضرت رساں پیداوار" اور نجس و ناپاک وجود بیان کرکے مردوں کے سر منڈھنا چاہتا ہو اور جو طلاق کا سد باب کرنیوالا ہو، وہ کیا معیشت و معاشرت کی ترقی کا باعث ہو سکتی ہے اور اسے دنیا کیونکر قبول کر سکتی تھی۔

**موجودہ اخلاق جنسی** اپٹن سنکلیر (Upton Sinclair) اپنی مشہور کتاب "صحیفۂ حیات" (The Book of Life) میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس عیسوی تعلیم کا عملی نقطۂ نظر سے کیا حشر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ "ادارۂ نکاح اس میں

شک نہیں کہ نہایت بلند تعلیم پر مبنی ہے لیکن صحیح معنی میں نہ کبھی اس پر عمل ہوا، نہ ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل بھی یہی دیکھا گیا اور اب تو عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اب جو چیز نکاح کی جگہ رائج ہے اسے ہم شادی و فحاشی دونوں کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔"

اسوقت کی جنسی و شہوانی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ

"آجکل کی عورت اور تعلیم یافتہ مردوں کی جماعت نکاح سے قبل جس طرح زندگی بسر کرتی ہے وہ مسیحی تعلیم کے لحاظ سے خواہ کچھ ہو لیکن سوسائٹی کے نزدیک وہ "تفریحات اندرون خانہ" سے زیادہ اہم نہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس سے قبل فحاشی و عصمت فروشی کا تعلق زیادہ تر عورت سے تھا لیکن اب اسی حد تک مردوں سے ہے، چنانچہ آپ مغرب کے ہوٹلوں میں دیکھینگے کہ شام ہوئی اور عورتوں کے دھاوے مردوں پر شروع ہوئے۔ گویا کہ یہ ایک جدید دور ہے جسے اخلاق جنسی کے لحاظ سے "مردانہ عصمت فروشی" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اسوقت دولت کا ایک بڑا مصرف صرف اخلاق کی بیجا آزادی اور عورت کی عصمت کی ارزانی کو صفر کی حد تک کھینچ لانا ہے۔ مغرب کی کھیتی جماعت کا فی حصہ اپنے اوقات کا اس خیال میں صرف کرتی ہے کہ مسیح کی تعلیم رہبانیت کا انتقام کن کن جدید صورتوں سے لیا جائے، چنانچہ نیویارک کے ایک ڈاکٹر کا بیان ہے کہ اسنے پندرہ سال میں ۹۰۰ ایسی لڑکیوں کو دیکھا جنکی انتہائی کمسنی کیباوجود عصمت دری کی گئی، یہانتک کہ ان میں سے بعض ۹ ماہ کی تھیں! غربا کی جو حالت ہے وہ اس سے زیادہ خراب ہے اور ناقابل بیان

اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اسپر غور کرکے اصلاح کرنی چاہی، لیکن کامیاب نہ ہوئے اور کامیابی کسی طرح ممکن نہیں کیونکہ ان تمام خرابیوں کی ذمہ داری اولاً تو اس ابتدائی تعلیم پر عائد ہوتی ہے جس نے عورت کے درجہ کو پست کرکے غلامی کی حیثیت سے مرد کے سامنے پیش کیا اور دوسری اس اصول پر کہ ایک وقت میں ایک ہی شادی کرنا چاہئے۔

مسیحی تعلیم کہتی ہے کہ اگر مرد و عورت میں سے کسی کو شریک زندگی نہ ملسکے تو اسے چاہئے کہ خدا پر بھروسہ کرکے خاموش بیٹھ جائے کیونکہ وہی انسانی ضرورتوں کا پورا کرنے والا ہے۔ یقیناً تعلیم اچھی ہے لیکن ایک حاجتمند کو صرف خدا کے بھروسہ کی تعلیم دینا اور عملاً اسکی مشکلات کو دور نہ کرنا کبھی مفید نہیں ہوسکتا اور اسکا نتیجہ وہی ہوتا ہے جیساکہ ایک حبشی نے کہا تھا کہ یہ کیا بات ہے جب میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ بار الٰہا ایک دوڑتی ہوئی مرغی میرے پاس بھیجدے تو یہ دعا کبھی قبول نہیں ہوتی اور جب یہ دعا کرتا ہوں کہ مجھی کو اسکے پیچھے دوڑا دے تو فوراً قبول ہوجاتی ہے۔

مذہب واصول مذہب سے انحراف کا بڑا سبب اس قسم کی قنوطی تعلیم بھی ہوا کرتی ہے، کیونکہ ایک خاص حد تک تو انسان صبر و ضبط سے کام لیکر قانع رہ سکتا ہے، لیکن اسکے بعد وہ اپنی خواہشات سے مجبور ہوکر کھل کھیلتا ہے اور تعلیم ہی کو لغو سمجھنے لگتا ہے۔

## مستقبل کا اخلاق جنسی

ارباب نظر سے مخفی نہیں کہ دنیا کی آزادی کے ساتھ ساتھ اخلاق جنسی میں بھی بڑی آزادی پیدا ہوگئی

ہے اور عورت کی ذہنی و علمی ترقی نے اسکے اخلاق کا مفہوم بھی بڑی حد تک بدلدیا ہے۔

تقریباً ایک صدی قبل عورت کی مجبوری کی داستان یہ تھی کہ نہ اسکو تعلیم دیجاتی تھی نہ سیاسی حقوق اسکو حاصل تھے، نہ وہ تجارت کرسکتی تھی نہ کوئی فن سیکھ سکتی تھی اور نہ قانون کی نگاہ میں وہ مردوں کے برابر خیال کیجاتی تھی —— لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ وہ مردوں کے دوش بدوش علوم وفنون حاصل کرتی ہے، ہر قسم کے پیشہ و تجارت میں برابر کا حصہ لیتی ہے، ملازمتیں کرتی ہے، رائے دینے کا مساوی حق رکھتی ہے، الغرض وہ سب کچھ کرتی ہے جو ایک مرد کرسکتا ہے۔ اسلئے اگر اسکا اخلاقی معیار بدل جائے تو حیرت نہ کرنا چاہیئے۔

وہ دور جب مرد اسپر حکومت کرتا تھا اور اسکی حیثیت ایک کنیز سے زیادہ نہ تھی گزر گیا ہے، وہ اب خود مرد پر حکمراں نظر آتی ہے اور آزادی کے ساتھ جو جی میں آئے کر بیٹھتی ہے۔ اسکے یہاں نہ کوئی اخلاقی قانون ہے، نہ معاشری پابندی۔ اسکی حالت اس طائر کی سی ہے جو عرصہ تک قفس میں مقید رہنے کے بعد دفعتاً آزاد کر دیا جائے اور شوق پرواز سے کسی ایک جگہ چین سے نہ بیٹھنے دے وہ اگر کسی مرد سے شادی کرتی ہے تو اس خیال سے نہیں کہ تمدن و معاشرت کا نظام اسکا مقتضی ہے بلکہ صرف اس ارادے سے کہ اس طرح وہ اپنی آزادی کے لئے زیادہ وسیع بہانے پیدا کرسکے گی۔ نہ اُسے اولاد کی ضرورت ہے نہ شوہر کی، نہ اُسے کسی سرپرست کی حاجت ہے نہ رہبر و قاید کی۔ وہ ایک سیلاب،

ہے جو بند کو توڑکر چار و نطرف پھیل گیا ہے اور جسکا روکنا اب کسی طرح ممکن نہیں ۔
اسلئے سوال یہ ہے کہ جب ابتدا آزادی میں یہ حالت ہے تو آیندہ کیا ہوگا اور
عورت کی دوسری مستقبل میں کس معاشرت کو اختیار کریگی ۔ اسکا بہترین جواب
یوروپ کے مشہور انشاپرداز ایچ ۔ جی ویلز ( H. G. Wells )
نے اپنے ناول "انسان خدا کا مماثل" ( Men like Gods )
میں دیا ہے کہ کرۂ ارض کا ایک شخص کسی دوسرے کرہ میں پہونچگیا جو بقدر تین ہزار
سال زیادہ ترقی یافتہ تھا اور یہاں اسکو دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ وہاں نہ کسی
کے جسم پر کپڑے کا تار ہے اور نہ غیرت وحیا کا کوئی مفہوم، نہ وہاں شادی کا
جھگڑا ہے، نہ کسی اور پابندی کا ۔ یعنی انسان بظاہر دیکھنے میں تو انسان ہے،
لیکن ہے حقیقتاً حیوان سے بدتر

عورت کی اس آزادی کا جو اقتصادی اثر دنیا پر پڑتا ہے وہ بھی نظر انداز
کرنے کے قابل نہیں کیونکہ بفرض محال اگر عورت نے کسی نہ کسی طرح بچہ جن دیا تو
اسکی پرورش کون کریگا نہ اس لحاظ سے کہ ابوبیت کی تعیین دشوار ہوگی بلکہ اس
بنا پر کہ عورت کو اتنی فرصت کہاں اور ہنگامۂ عالم میں اسکی شرکت تربیت
اولاد کی اجازت کیونکر دے سکتی ہے ۔ اسلئے دنیا میں "اشتراکیت" کا پھیلنا
یقینی ہے کیونکہ آیندہ نسلوں کی بقاء و حفاظت صرف اسی طرح ممکن ہے کہ باشرکت
رد و کد کے موجودہ نظام کی مانند بچوں کی پرورش وغیرہ کلیتہً حکومت اپنے ہاتھ
میں لیلے ۔ لیکن اگر یہ نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا ۔ سنکلیر ( Sinclair )
نے عرصہ ہوا یہ تحریک ملک کے سامنے پیش کی تھی کہ جنسی جرائم کرنے والوں کو آختہ

کردیا جائے اور اسی اصول کو پیش نظر رکھکر رسل ( Russel )
مزاحیہ انداز میں لکھتا ہے کہ مستقبل میں حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ
والدین میں سے جسکو چاہے آختہ کردے۔
رسل کا یہ خیال ہے کہ آیندہ زمانہ میں اخلاقی معیار بالکل بدل جائیگا
اور ایک ہی شخص مختلف عورتوں سے خاندان کے خاندان بناتا چلا جائے گا۔
لیکن اسکا اختیار ہر شخص کو حاصل نہ ہوگا بلکہ خاص خاص لوگوں کو ہوگا اور
اسلئے آیندہ دنیا کی نصف آبادی کا باپ صرف وزراء اور پادریوں کو بننا ہے۔
ہالڈین ( Haldane ) مشہور ماہر علم الحیات لکھتا ہے کہ
"۱۹۵۰ء تک ایسا طریقہ دریافت ہوجائے گا کہ عورت کے رحم سے جنین
نکال کر اسکو کیمیاوی محلول میں ڈالکر نشوونما پانے کا موقعہ دیا جائے۔ اسکے
بعد وہ زمانہ آئیگا جب عورت کا رحم اسکے جسم سے علٰحدہ کرکے بیس سال
تک زندہ رکھا جاسکے گا جس سے ہر ماہ بیضۃ الجنین ( Ovum )
پیدا ہوتا رہیگا اور ۹۰ فیصدی کی نسبت سے یہ مادہ تشکیل جنین کا کام دیسکے
گا اور ۹ ماہ کے بعد اس سے صحیح وسالم بچہ پیدا ہوا کریگا۔ پھر جب اس طرح
محبت جنسی اور تولید دونوں علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہوجائیں گی تو انسانی معاشرت
ونفسیات میں تغیر عظیم واقع ہوگا اور دنیا بالکل نئے اصول پر کاربابند ہوگی۔
ممکن ہے کہ ہالڈین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں مزاح کا پہلو شامل ہو،
لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مغرب کی عورت کس حد تک
آزاد ہوچکی ہے اور دنیا کس خطرہ میں مبتلا ہے۔

This file is resized by

Some of the .pdf files we download from the Internet are not fit enough for direct upload to our servers.

We enhance the scan quality of such files, resize the pages to a standard size which is reasonably readable and then upload them.